مالک نامہ

(مالک رام کی ادبی خدمات)

مرتّبہ

کرنل بشیر حسین زیدی

جشن مالک رام کمیٹی - دلّی

مالک نامہ

(مالک رام کی ادبی خدمات)

مرتّبہ

کرنل بشیر حسین زیدی

جشنِ مالک رام کمیٹی

سنِ اشاعت : ۱۹۸۷ء

بہ اہتمام : ایم۔ حبیب خاں

طباعت: سمر آفسٹ پریس، دہلی -

قیمت : ۴۰ روپے

اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع

ملنے کے پتے

۱- انجمن ترقی اردو (ہند) اردو گھر، راوز ایونیو، نئی دہلی ۲
۲- مکتبہ جامعہ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶

فہرست

پیش لفظ

(۱)

مالک رام صاحب کے نام اور شہرت سے تو میں واقف تھا، مگر ملاقات پہلی مرتبہ اُن سے ۱۹۵۵ء میں مصر سے ہندستان واپس آنے پر ہوئی۔ اُن کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ اُن کی علمی اور ثقافتی دلچسپیوں، اخلاق، پُرخلوص طبیعت اور انکسار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میرے ایک عزیز دوست سے اُن کی قرابت بھی تھی۔ ہم جلد ہی ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ اور اکثر ملتے رہتے تھے۔ میری بیٹی شمع کو جب غالب صدی کی تجویز اور پروگرام کے متعلق ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے پروانۂ پسندیدگی مل گیا تو مالک رام صاحب سے جو چوٹی کے ماہرِ غالبیات ہیں اکثر مشورہ کا موقع ملا۔ مجھ سے کئی دوستوں نے اکثر اپنی زندگی کے حالات و واقعات قلم بند کرنے کے لیے کہا، مگر میں برابر ٹالتا رہا۔ ایک دن یہی فرمایش مالک رام صاحب نے کی تو میں نے ان سے بھی معافی مانگ لی۔ چند روز بعد وہ ایک دن صبح کو ہاتھ میں ایک کاپی لیے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ آپ خود نہیں لکھتے تو میں لکھونگا آپ بولتے جائیں۔ انھوں نے کافی تکلیف گوارا کی اور پندرہ بیس دن تک میرے یہاں آکر کُرید کُرید کر حالات معلوم کرتے رہے جس کے نتیجے میں "نذرِ زیدی" عالمِ وجود میں آئی جو دوست انھیں عزیز ہو، اس کی سوانح حیات لکھنے کا انھیں شوق ہے اس سے پہلے وہ "نذرِ عرشی" اور "نذرِ ذاکر" مرتب کر چکے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے متعلق ایک کتاب اور آخر میں "نذرِ حکیم عبدالحمید" انھیں کی تحریک اور اَن تھک کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ اس سلسلے میں ایک بات قابلِ ذکر ہے۔

ایک روز میں نے کہا کہ قدسیہ کے والد میرے خُسر شیخ عبداللہ دہلی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے۔ جب دہلی راجدھانی بن گئی تو ایک دن لارڈ ہارڈنگ مع لیڈی ہارڈنگ کے ہاتھی پر سوار ہو کر ایک جلوس کی شکل میں چاندنی چوک سے گزر رہے تھے، شیخ عبداللہ ان کے پیچھے بیٹھے تھے۔ گھنٹہ گھر سے آگے بڑھے تھے کہ کسی نے لارڈ ہارڈنگ پر بم پھینکا، وہ زخمی ہو گئے۔ شیخ صاحب نے انھیں اتارا اور موٹر

میں بٹھا کر واپس بھیج دیا۔ مالک رام صاحب نے پوچھا کہ بم گرنے کی صحیح جائے وقوع کیا تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کا علم نہیں، بولے یہ تو معلوم کرنے کی بات ہے۔ چنانچہ نیشنل آرکاوز میں جا کر اس تاریخ کا اخبار تلاش کیا، جس سے معلوم ہوا کہ بم پرانے پنجاب نیشنل بینک کی بالائی منزل سے پھینکا گیا تھا۔ اگلے دن مجھے بہت خوش ہو کر یہ بات سُنائی۔ اس سے ان کے شوقِ تحقیق کی شدّت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

انھیں ادیبوں، شاعروں اور ممتاز شخصیتوں کے متعلق تذکرے اور خاکے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ جس کی بابت لکھیں گے، خون پسینا ایک کر کے صحیح حالات جمع کریں گے۔ کسی امر کے متعلق جب تک پوری تحقیق نہ کر لیں گے، چین سے نہ بیٹھیں گے اور جو کچھ وہ لکھ دیں، اُس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

اُردو کے لیے مالک رام کی خدمات بڑی گرانقدر ہیں تصانیف کے علاوہ وہ مدّتوں رسالہ "تحریر" ذاتی نقصان اٹھا کر شائع کرتے رہے۔ انجمن ترقی اُردو کے صدر کی حیثیت سے علالت کے باوجود کام کرتے رہے ہیں۔ انیس صدی کمیٹی کے کام میں مجھے اُن سے بہت مفید اور اہم مشورے ملتے رہے ہیں۔

(۲)

مالک رام صاحب بہت روشن خیال، وسیع القلب اور ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے پاک ہیں۔ ابتدائے شباب میں جو صحبت انھیں ملی، وہ شمالی ہندستان کی مشترکہ تہذیب میں رچی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بھی ان کا مسلمانوں سے قریبی میل جول رہا۔ اس کے نتیجے میں اسلام کے متعلق ان کا رویہ ہمیشہ ہمدردانہ رہا ہے۔ پھر برسوں عرب ممالک میں کام کرنے سے انھیں عربی میں بہت اچھی مہارت ہو گئی اور انھوں نے قرآنِ پاک اور اسلامی علوم کا اچھی اور گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ "عورت اور اسلامی تعلیم" اور بعد میں "اسلامیات" اسی ہمدردانہ فکر و نظر کا نتیجہ ہے۔

جب انھوں نے اپنی لڑکی کا نام بشریٰ رکھا تو عزیزوں نے تعجب کا اظہار کیا۔ ان کا جواب تھا کہ میرے گھر والوں نے بھی تو میرا نام مالک رام رکھا تھا۔ اس کے بعد بڑے بیٹے کا نام آفتاب اور دوسرے کا نام سلمان رکھا۔

(۳)

مالک رام صاحب میں ہمدردی اور انسان دوستی کوٹ کوٹ کر بھری ہے وہ دوست نواز اور
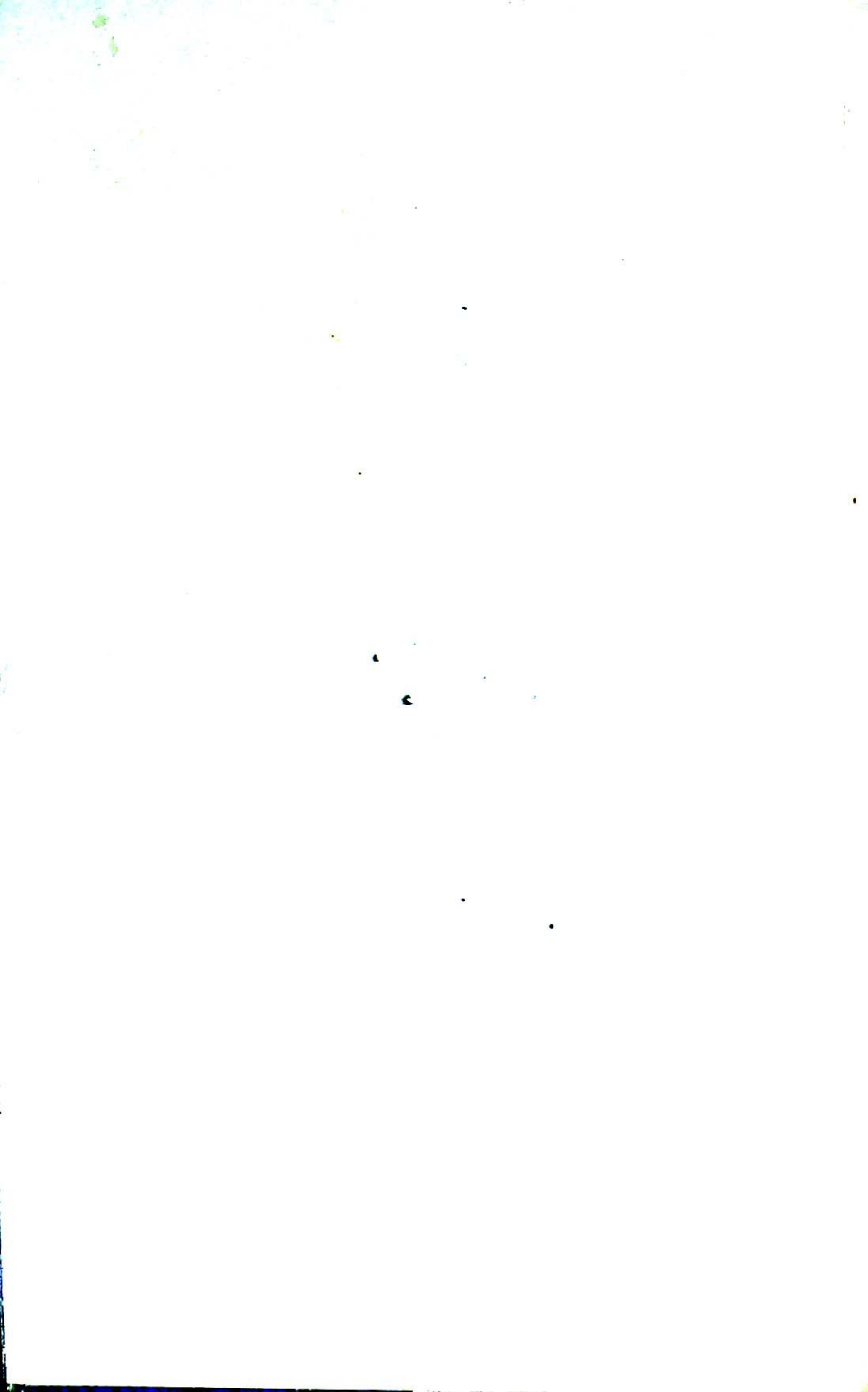
دوستوں کے غم خوار ہیں ایک دن مجھ سے ملنے آئے تو میں نے کہا کہ کل ٹہلنے نکلا تھا تو میرے بائیں بازو میں اتنا سخت درد ہوا کہ میں گھر واپس آگیا۔ اتنے پریشان ہوئے کہ فوراً ضد کر کے مجھے ولنگڈن ہاسپٹل لے گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے ای، سی، جی لے کر مجھے اسی وقت داخل کر لیا اور بر وقت علاج کی وجہ سے میں ایسا ٹھیک ہوا کہ آج تک بارہ سال بعد بفضلِ خدا مجھے دل کی تکلیف نہیں ہوئی۔ آج وہ خود اس تکلیف میں مبتلا ہیں ۔ اب طبیعت درست ہے اور ان کے سب دوست اور مدّاح اور اُردو سے محبت کرنے والے اُن کی صحت و تندرستی اور درازیٔ عمر کے لیے دست بدعا ہیں۔

بشیر حسین زیدی

سید شہاب الدین دسنوی

خدا مالک رام صاحب کو سلامت رکھے

جب مالک رام کے والدین نے ان کا نام رکھا تو وہ ساعت یقیناً نہایت مبارک اور نیک رہی ہو گی کیونکہ اس نام کے دونوں اجزا "مالک" "رام" کے امتزاج سے ان کی شخصیت کی تشکیل میں بڑی مدد ملی۔ ان کا یہی وصف ان کی زندگی میں جھلکتا رہا ہے۔ ان کے متوازن مزاج، مخلصانہ رویّہ نے مل جل کر ان کی عالمانہ شان میں کچھ ایسی جاذبیت پیدا کردی ہے جس سے وہ ہمیشہ اپنے احباب اور ہم جیسے نیازمندوں کو متاثر کرتے رہے ہیں۔

مالک رام صاحب سے میری پہلی ملاقات بمبئی میں اس زمانے میں ہوئی جب وہ وزارتِ خارجہ کے دفتر اسکندریہ سے آئے ہوئے تھے۔ پروفیسر آصف فیضی سے ان کا ذکر ہو چکا تھا۔ انھوں نے اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کے لیے مالک رام صاحب سے غالب کی کلیات فارسی مرتب کرنے کی درخواست کی تھی۔ میرا تعلق بھی اس ادارے سے تھا، اس لیے زیادہ تر باتیں اسی سلسلے کی ہوئیں لیکن جس بے تکلفی، انکساری اور محبت سے وہ ملے، اس نے میرے دل پر گہرا نقش چھوڑا۔ اس ملاقات کے بعد جب انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی تشکیل ہوئی تو اس کے جلسوں کے لیے علی گڑھ جایا کرتا تھا۔ وہاں مالک رام صاحب سے تعلقات اور بڑھے وہ انجمن کے جلسوں میں نہایت معقول اور سنجیدہ انداز میں بحث میں حصہ لیتے۔ ان کی دوراندیشی اور معاملہ فہمی کے سب قائل تھے اس لیے ان کی رائے قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی۔ جب انجمن کے دفتر کے لیے "اردو گھر" کی تجویز ہوئی تو اس کی تعمیر اور دیگر مراحل طے کرنے میں انھوں نے بڑی گہری دلچسپی لی جس کے نتیجے میں ہم آج اردو گھر کی عمارت دیکھتے ہیں۔

مالک رام صاحب مستند اسکالر ہیں اور برصغیر ہندوستان اور پاکستان میں یکساں طور پر عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں انھوں نے چوٹی کے ادیبوں اور اسکالروں سے آنکھیں ملائی ہیں۔ ان سب کی یادیں انمول خزانے کی طرح ان کے سینے میں محفوظ ہیں ــ کہ ملاقاتوں میں اکثر وہ خزانوں کا منہ کھول

دیتے ہیں اور ہم ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ روایات کے پابند، قدیم اقدار کے قدرداں، خوش طبع اور خوش گفتار انسان ہیں۔ گو متین اور سنجیدہ مزاج رکھتے ہیں جب گفتگو میں اپنی پنجابی ظرافت شامل کر دیتے ہیں تو ان کی صحبت کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

مالک رام صاحب نے زندگی بھر عالمانہ کام کیے اور اب بھی اسی انہماک کے ساتھ تصنیف و تالیف میں لگے ہوئے ہیں۔ خدا ان کو ہمارے درمیان قائم رکھے اور ہم ان کی علمی و ادبی خدمات سے ہم مستفید ہوتے رہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مالک رام

ویدبھگوان میں ایک دعائیہ منتر ہے

"اے خداوند قدیر! مجھے ایک ایسے عالم کی صحبت
عطا کر جو اپنے علم و فضل سے (صحیح راستے کی جانب)
میری رہنمائی کر سکے اور جو مجھ پر حق و صداقت کا
انکشاف کرے۔" (رگ ۶۔ ۵۴۔ ۱)

یہ دعا غالباً میرے لبوں پر تو کبھی نہیں آئی تھی لیکن دل کی گہرائیوں میں ضرور مچلتی رہی ہوگی اور شاید اسی خاموش دعا کا اثر ہوگا کہ میری خوش فہمی مجھے مالک رام صاحب کے قریب تر لے گئی اور اس طرح کہ خوردی و بزرگی کے رشتے کے باوجود ہم دونوں میں بے تکلف مراسم پیدا ہوگئے اور ان بے تکلف مراسم نے انجام کار کچھ مدّت کے لیے استادی شاگردی کے رشتے کی صورت اختیار کرلی۔

لیکن استادی شاگردی کچھ مدّت کے لیے نہیں ہوتی۔ یہ روحانی رشتہ ہے اور ایک بار شروع ہوکر ٹوٹتا نہیں ہے اس لیے مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا کہ استادی شاگردی کا رشتہ کچھ مدّت کے لیے پیدا ہوگیا۔ مجھے یہ کہنا چاہئے تھا کہ استاد شاگردی کا باضابطہ تعلق چند دن سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن اس باضابطہ تعلق سے پہلے بھی اور بعد میں بھی میں نے مالک رام صاحب کی زبان، ادب اور تحقیق میں استادانہ حیثیت کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے اور ان کی بات کو اسی

توجہ سے سنا ہے جس توجہ سے ایک شاگرد کو سننا چاہئے۔

باضابطہ درس و تدریس کی بات یہ ہے کہ غالباً ۶۴ء میں میں نے قرآن شریف پڑھنے کا عزم کیا۔ ظاہر ہے کہ مالک رام سے بہتر قرآن پڑھانے والا کہاں سے میسر آتا۔ میں نے ان سے درخواست کی، انھوں نے قبول کرلی گویا ع

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے۔

اس زمانے میں وہ مولانا آزاد کی تصانیف "ترجمان القرآن" "غبارِ خاطر" اور "تذکرہ" کی ترتیب و حواشی کے کام میں مصروف تھے اور اسی سلسلے میں باقاعدہ ساہتیہ اکیڈمی کے دفتر میں بیٹھا کرتے تھے۔ میں قریب ہی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر تھا۔ طے یہ پایا کہ میں لنچ کے اوقات میں ان کے پاس پہنچ جایا کروں۔ میں نے پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچنا شروع کیا اور کلام پاک پڑھنے کی میری دیرینہ آرزو پوری ہونے لگی۔

اس سلسلے کو چند ہی روز گزرے تھے۔ ایک دن میں آموختہ انھیں سنا رہا تھا کہ ان کی میز پر ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون میرے لیے تھا۔ بتانے والا بتا رہا تھا کہ میرے ایک عزیز کا شدید حادثہ ہوگیا ہے۔ وہ سڑک پار کر رہے تھے کہ ایک تیز رفتار بس کی جھپٹ میں آگئے، انھیں نازک حالت میں ولنگٹن ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔

یہ سنتے ہی میرے حواس گم ہوگئے سبق چھوڑ کر میں نے فوراً اسکوٹر پر پاؤں رکھا اور ہسپتال جا پہنچا۔ میرے عزیز کی حالت مخدوش تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ماہ کے علاج کے بعد وہ صحتیاب ہوگئے لیکن کلام پاک کی تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہوسکا۔

اس ضمن میں جو بات مجھے آج تک متاثر کر رہی ہے اور جس پر میں آج تک عمل پیرا ہوں یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے سورۂ فاتحہ شروع کرانے سے قبل ہی مجھے قرآن شریف کو ہاتھوں میں اٹھانے اور میز پر رکھنے کے آداب سے آشنا کیا۔ کلام پاک کا احترام تو مجھے بتدا ہی سے گھر میں سکھایا گیا تھا لیکن مالک رام صاحب نے میری تعلیم قرآن کی ابتدا اس احترام سے کی اور سورۂ فاتحہ پڑھانے سے قبل ہی مجھے روحِ مذہب سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مالک رام صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی "آج کل" کے دفتر میں، جوش صاحب کے کمرے میں۔ ایک رات قبل ایک جگہ شعرا کی دعوت تھی، دعوت رات کے بارہ ایک بجے ختم ہوئی تو میں نے جوش صاحب سے کہا کہ مجھے صبح عدالت میں ایک گواہی کے سلسلے میں پیش ہونا ہے۔ شاہراہ کے مالک یوسف جامعی اور ایڈیٹر پرکاش پنڈت پر ممتاز شیریں کی ایک کہانی کے سلسلے میں ایک صاحب نے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ مجھے یوسف جامعی اور پرکاش پنڈت کی طرف سے پیش ہونا ہے اس لیے میں کل وقت پر دفتر نہیں پہنچ سکوں گا۔ شاید ایک ڈیڑھ بجے حاضر ہو سکوں گا۔

میں جب خاصی تاخیر سے دفتر پہنچا تو سوچا پہلے جوش صاحب کے کمرے میں پہنچ کر انھیں اپنی آمد کی اطلاع دے دوں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ حسبِ دستور محفل جمی ہے۔ میں شاید دعا سلام کیے بغیر ہی جوش صاحب سے مخاطب ہوا اور بولا کہ عدالت میں بہت دیر ہو گئی۔ مقدمے کی سماعت ہی بارہ بجے شروع ہوئی۔ میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک صاحب جن سے میری کوئی شناسائی نہیں تھی اور جنھیں میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا جھٹ سے بول اٹھے یہ عدالت وغیرہ کا بہانہ آپ کیوں کرتے ہیں؟ جب رات کو بارہ بارہ ایک ایک بجے تک شراب کی محفلیں رہیں گی تو وقت پر دفتر آنا کیسے ممکن ہو سکے گا۔ میں ایک اجنبی کے منہ سے یہ تبصرہ سنتے ہی بھنا گیا۔ جلدی میں مجھ سے جواب نہ بن پایا۔ اتنے میں جوش صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے" بھئی یہ مالک رام ہیں"۔ مالک رام کا نام سنتے ہی میں اچھل پڑا اور انھوں نے اٹھ کر فوراً مجھے گلے سے لگا لیا۔

اس ملاقات میں یہ پتہ چلا کہ مالک رام صرف ایک دو دن کے لیے مصر سے آئے ہیں مجھے حیرت ہوئی کہ مصر کوئی غازی آباد یا میرٹھ تو ہے نہیں کہ آپ ایک دن کے لیے دہلی آئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی میٹنگ کے سلسلے میں آئے ہیں اور کل یا پرسوں واپس چلے جائیں گے۔ چنانچہ یہ ملاقات یہیں تک محدود رہی۔

۶۲ء میں مجھے انگلستان اور یورپ کا سفر درپیش آیا۔ مالک رام صاحب بہ سلسلہ ملازمت اس زمانے میں بلجیم کے دارالحکومت برسیلز میں تھے۔ میں نے انھیں قبل از وقت

اطلاع دی اور جب لندن میں، میں اپنے کام سے فارغ ہوگیا تو مالک رام صاحب کے ساتھ طے شدہ پروگرام کے مطابق میں نے برسیلز کا رخ کیا۔ وہاں ان کے ساتھ جو چند روز بسر ہوئے وہ یورپ کے سفر کا حاصل تھا۔

غالباً اس زمانے میں مالک رام صاحب "گلِ رعنا" کے حواشی لکھ رہے تھے۔ رات کے نو بجے، دس گیارہ بجے تک میرے ساتھ ان کی خوش گپیاں رہتی تھیں اور اس کے بعد جب میں سو جاتا تھا تو وہ اپنا علمی اور تحقیقی کام شروع کرتے تھے۔ ان کے محنت کرنے کی یہ عادت آج بھی اسی طرح جاری ہے اور انھیں مصروف کار دیکھ کر یورپین محققین اور مستشرقین کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رات کو کھانے کے بعد ہم دونوں بلجیئم کی سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ بات چیت کے دوران میں میں نے حافظ کا یہ مصرع پڑھا۔

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

مالک رام صاحب یہ مصرعہ سنتے ہی سوچ میں پڑ گئے اور قدرے توقف کے بعد بولے "غالباً" "مو بتراشد" ہے اب اس کے بعد میں بھی یقین سے کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے اتنا ہی کہا کہ میں نے شاید "سر بتراشد" ہی پڑھا ہے۔ ممکن ہے غلط پڑھا ہو۔ ویسے اقبال نے بھی اس مصرعے کو اپنایا ہے تو یوں۔

اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

بات آئی گئی، ہوگئی۔ کوئی چند ماہ کی سیاحت کے بعد میں وطن واپس آیا۔ اس دوران میں مالک رام صاحب کے ساتھ باقاعدہ قسم کی خط و کتابت شروع ہو چکی تھی۔ ان کا ایک خط مجھے یورپ سے واپسی کے قریباً ایک برس بعد ملا۔ اس میں لکھا تھا آپ کو یاد ہوگا بلجیئم میں ایک رات دورانِ گفتگو میں حافظ کے ایک مصرعے پر بات ہوئی تھی۔ آپ نے مصرع صحیح پڑھا تھا۔ اس میں "مو بتراشد" نہیں ہے" سر بتراشد" ہے۔ میری حیرت کی حد نہ رہی جس بات کو میں ایک وقتی بات سمجھ کر بھلا چکا تھا، وہ مالک رام صاحب کے لیے موضوعِ تحقیق بن گئی اور جب تک اس کے متعلق انھوں نے پوری تحقیق نہ کر لی انھیں چین نہ آیا۔

اسی دورانِ قیام میں، میں نے مالک رام صاحب کے یہاں ایک عجیب و غریب چیز دیکھی اور یہ ایک آٹوگراف چارٹ تھا۔ آٹوگراف بک تو ہم سب نے دیکھی ہوگی۔ لیکن یہ آٹوگراف چارٹ میرے لیے ایک عجیب و غریب چیز تھا۔ جیسے دنیا کا نقشہ دو ڈنڈیوں اور ایک رسی کے سہارے دیوار پر لٹکا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ آٹوگراف چارٹ اُن کے ڈرائنگ روم میں لٹکا رہتا تھا اور اس پر دنیا بھر کے ادیبوں کے دستخط موجود تھے۔ کسی کا صرف دستخط تھا۔ کسی کا شعر سمیت دستخط۔ کسی نے کوئی جملہ لکھا تھا کسی نے کوئی مقولہ غرض یہ چارٹ ایک ہی نظر میں عجب بوقلمونی کیفیت پیش کر رہا تھا۔ میری واپس انگلستان روانگی سے ایک رات قبل مالک رام صاحب نے یہ چارٹ میرے سامنے رکھا اور مجھ سے اس پر آٹوگراف دینے کو کہا۔ میں نے پنجابی کے ایک شاعر کا مندرجہ ذیل شعر لکھ کر اپنے دستخط کر دیئے۔

الف اج دی رات وصال والی بھلکے کی جانڑاں کیہڑھا رنگ ہوسی
میلے فیر محمدا قسمتاں دے کتھے شمع تے کتھے پتنگ ہوسی

دراصل اس رات مالک رام صاحب سے جدا ہوتے وقت میرے دل کی کیفیت یہی تھی اور جب مجھے ایک حسبِ حال شعر یاد آگیا تو میں نے اسے آٹوگراف چارٹ پر لکھ دینا مناسب سمجھا۔

معلوم نہیں یہ آٹوگراف چارٹ اب مالک رام صاحب کے پاس ہے یا نہیں کیونکہ اگر یہ کھو گیا ہے تو اس پر لکھے ہوئے پطرس بخاری، آرتھر آربری، سر ظفر اللہ خان، ایسا ندر بسانی، جولیس جرمینوس اور رانا میری شمل کے دستخط یا آٹوگراف بھی گم ہو چکے ہیں۔

میرے اس قیام برسیلز کی ایک اور رات بھی مجھے ہمیشہ یاد رہے گی اور یہ وہ رات تھی جب مالک رام صاحب نے اپنے گھر میں محفلِ شعر کا اہتمام کیا۔ اردو شاعری کی محفل اور برسیلز میں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہندوستان یا پاکستان کے کسی شہر میں بیٹھا ہوں۔ ہندوستانی اور پاکستانی سفارت خانے کے اکثر و بیشتر لوگ اس محفل میں موجود تھے۔ غالباً دونوں ملکوں کے سفیر کبیر بھی تھے۔ اس وقت بلجیم میں ہمارے سفیر تھے۔ کے۔ بی۔ لال۔ اور

پاکستان کے سفیر تھے جنرل محمد ایوب خاں کے بھائی۔ نام ان کا مجھے یاد نہیں رہا۔ شاعر صرف میں تھا، اس لیے میں نے جی بھر کے کلام سنایا اور سننے والوں نے بھی جی بھر کے سنا کہ ایک مدت کے بعد انھیں ایک اردو شاعر کا کلام سننے کا موقع مل رہا تھا دیارِ فرنگ میں۔ رات کے کوئی دو بجے تک یہ محفل جمی رہی۔

قیام برسیلز کے دوران ہی میں مالک رام صاحب کے مشورے کے مطابق میں نے ہالینڈ، لکسمبرگ، جرمنی اور فرانس کی ایک جھلک دیکھنے کا پروگرام بنا لیا۔ ایک دن تو ایسا ہوا کہ میں صبح برسیلز سے چلا اور رات تک ہالینڈ کی سیر کر کے واپس آیا۔ اسی طرح چند روز ان کے ساتھ گزارنے کے بعد میں پھر انگلستان واپس چلا گیا۔

آخر جب وطن واپس آنے کا پروگرام طے ہوا تو میں نے پھر برسیلز کا رستہ اختیار کیا مقصد یہ تھا کہ ایک تو مالک رام صاحب سے ملاقات ایک بار پھر ہو جائے گی دوسرا ان سے سفر ہسپانیہ کے متعلق ہدایات لے لوں گا کیونکہ میں وطن واپس لوٹنے سے قبل مسجد قرطبہ کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت مسجدِ قرطبہ کو اپنے تصوّر میں کئی بار دیکھ چکا تھا لیکن ایک بار فنِ تعمیر کے اس نمونے کو اپنی چشمِ ظاہر سے دیکھنا چاہتا تھا جس نے اردو شاعری کو سب سے بڑا شاہکار دیا تھا۔ زمان و مکان کا وہ پس منظر جس نے "بالِ جبریل" کے صفحات میں سما کر اردو شاعری کو آسمان تک پہنچا دیا تھا خود کیا شے ہو گی۔ یہ خیال مجھے کشاں کشاں لندن سے بلجیم اور بلجیم سے فرانس کے رستے اسپین لے گیا۔

دراصل فرانس کا رُخ کرنا ہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ حرم مرتبت سرزمین کے رستے میں اس صنم کدے نے میری منزل کھوٹی کر دی اور جب میں پیرس کے ریلوے اسٹیشن سے میڈرڈ کے لیے روانہ ہوا تو میرا دل اور جیب دونوں خالی ہو چکے تھے۔ "در ایامِ جوانی چنداں کہ افتد دانی" لیکن میں اس تنبیہہ سے بے خبر رہا کہ ع

حرم کو جانے والے راہ میں ثابت قدم رہنا
حرم والوں کے رستے میں صنم خانے بھی آتے ہیں

فرانس میں میرے قدم جس طرح سے لڑکھڑائے اس پر میں حیران تو نہیں ہوں لیکن

پشیمان ضرور ہوں۔ ادھر شانزے لیزے تھا تو اُدھر فالی برژے۔ ان سے منہ موڑا تو لڈو اور سیکسی راما نے راستہ روک لیا۔ جس طرف قدم اٹھاتا تھا یہی منزلیں سامنے آتی تھیں۔ اب اس کے سوا اور کیا کہوں کہ ع

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

لیکن سرتاپا اس ہوشربا ماحول میں ملوث ہونے کے باوجود مسجد قرطبہ کی زیارت کی آرزو سے دل بیگانہ نہ ہوا اور میں پیرس سے میڈرڈ اور میڈرڈ سے قرطبہ جا پہنچا۔ قرطبہ سے میں نے مالک رام کو تار دیا کہ اس وقت صورت یہ ہے کہ روٹی کے ساتھ پیاز کے سوا اور کچھ خریدنے کی سکت نہیں ہے کہ اسپین میں کھانے کی یہی جنس سب سے ارزاں ہے۔ جوں توں کر کے قرطبہ، طلیطلہ، اشبیلیہ، مدینۃ الزہرا، غرناطہ اور مرسیہ وغیرہ کا سفر تو کر لوں گا اور یہاں پر میرا کوئی مستقل پتہ بھی نہیں اور یہاں سے مارسیلز کا ٹکٹ بھی میرے پاس ہے اس لیے آپ میسجریز میری ٹائمز کے پتے پر میرے لیے کچھ روپیہ مارسیلز بھیج دیجئے۔

مارسیلز پہنچتے پہنچتے میری یہ حالت ہو گئی تھی کہ ریلوے اسٹیشن سے مسجریز میری ٹائمز کے دفتر تک جو چار پانچ میل کا فاصلہ ہو گا میرے لیے پیدل جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہاں پہنچا تو بھوک سے جان لبوں پر آرہی تھی۔ پہنچتے ہی اپنا نام پتہ بتایا۔۔ ریسپشنسٹ نے مژدۂ جانفزا دیا کہ برسیلز سے مالک رام صاحب نے آپ کے لیے منی آرڈر سے روپیہ بھیجا ہے۔ مجھے اب یاد نہیں کتنا روپیہ تھا لیکن میری ضرورت سے کہیں زیادہ تھا میں نے روپیہ لیا۔ سیدھا ایک ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ پیٹ بھر کے کھانا کھایا۔ ٹیکسی لی۔ اسٹیشن پر آیا۔ اپنا سامان اٹھایا اور ایک ہوٹل میں جاکر فروکش ہو گیا۔ دوسری صبح کو مجھے ہندوستان روانہ ہونا تھا۔ اس روز کئی دنوں کے بعد مجھے پیٹ بھر کے کھانا نصیب ہوا تھا

یہ روپیہ تو ہندوستان واپس آکر میں نے ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا دیا لیکن اس کے بعد مالک رام صاحب سے جب کبھی میں نے اس واقعے کا ذکر کیا انھوں نے سنی ان سنی کر دی کہ شاید میں اس بیانِ واقعہ کے ذریعے سے شکریہ ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ان کے قیام یورپ کا ایک اور واقعہ مجھے یاد آرہا ہے جس کا تانا بانا ہندوستان میں بنا گیا۔ مالک رام بہ سلسلہ ملازمت جب یورپ گئے تو اپنا ذاتی ذخیرۂ کتب جو ہزاروں نادر اور کمیاب کتابوں پر مشتمل تھا دوارکا داس شعلہ کی تحویل میں دے گئے ایک دن پنڈت ہری چند اختر، عرشؔ اور میرے درمیان یہ سازش ہوئی کہ اختر، عرش اور میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد مالک رام صاحب کو یورپ خط لکھیں کہ فارسی کی فلاں کتاب جس پر آپ کا نام لکھا ہے آج مجھے جامع مسجد کے ایک کباڑی کے یہاں ملی۔ معلوم نہیں وہاں کیسے پہنچ گئی۔ ہمارا خیال تھا کہ جب پانچ سات کتابوں کے بارے میں اس قسم کے دو تین خط مالک رام صاحب کو ملیں گے تو وہ پریشان ہو اٹھیں گے اور اسی عالم میں دوارکا داس شعلہ کے نام خطوط کا تانتا باندھ دیکھیں گے کہ میری کتابوں کا یہ کیا حشر ہو رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب ہم لوگوں میں یہ سازش پک رہی تھی تو رحمت قطبی بھی وہاں موجود تھے ابھی ہم تو خط لکھنے کی سوچ رہے تھے کہ رحمت قطبی نے مجوزہ مضمون کا ایک خط مالک رام کے نام داغ دیا۔ مالک رام کی ذہانت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ انھوں نے فوراً عرشؔ کو خط لکھا کہ، آپ اختر یا آزاد کی طرف سے اس قسم کا خط آئے تو اس کے کوئی معنی بھی ہیں یہ رحمت قطبی کون ہے ایسے خط لکھنے والا۔

مالک رام صاحب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے سے قبل برسیلز سے دہلی آگئے تھے۔ میرا قیام بھی اس زمانے میں دہلی میں تھا۔ ان کی ریل جب بمبئی سے دہلی پہنچی تو اسٹیشن پر اُن کے احباب کا ایک ہجوم استقبال کے لیے موجود تھا۔ دوارکا داس شعلہ، عرشؔ ملسیانی، راقم التحریر ہم سب اس ہجوم میں گم تھے۔ دوارکا داس شعلہ نے قرول باغ میں ان کے لیے پہلے ہی مکان کا انتظام کر رکھا تھا۔ مالک رام اپنے بیوی بچوں سمیت اس مکان میں فروکش ہوئے اور ان کے ساتھ میری ملاقاتوں کا از سرِ نو ایک سلسلہ شروع ہوا۔ میں اور والدِ محترم اکثر ان کے گھر جاتے تھے اور گھنٹوں وہاں بیٹھتے تھے۔ اسی طرح مالک رام بھی ہمارے یہاں آتے اور خاصی دیر تک علمی گپ چلتی۔ والدِ محترم کا موزوں کیا ہوا یہ سجع اسی زمانے کی یادگار ہے۔

کون مالک رام سا ہر دلعزیز — ہند سے تا روم و مصر و شام ہے

مذہب و ملّت کے جھگڑوں سے الگ — سچ تو یہ ہے سب کا مالک رام ہے

مالک رام کے دل میں نیکی اور شرافت کا جو جذبہ موجود ہے اس پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ وہ ہر ضرورت مند کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اپنی سرکاری حیثیت میں بھی انھوں نے اپنی اس خوبی سے کتنوں کے مسائل حل کیے اور ان کے دل مٹھی میں کر لیے۔

میں جس زمانے میں پریس انفاریشن بیورو میں انفاریشن آفیسر تھا میرے عزیز دوست صاحبزادہ محمّد مستحسن فاروقی ایڈیٹر پیام مشرق (ہفتہ وار) اور آستانہ، (ماہانہ) نے ایک دن دوران ملاقات میں مجھ سے کہا کہ اُس سال مجھے اپنے جرائد کے لیے اتنے ٹن کاغذ کی منظوری ملی ہے لیکن حقیقتاً کاغذ اس سے بہت کم ملا ہے اور میرے لیے "پیام مشرق" اور "آستانہ" کو مطلوبہ تعداد میں چھاپنا دشوار ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل میں گرفتار ہوں، کیا کیا جائے۔ میں نے کہا میرے دوست مالک رام منسٹری آف کامرس میں افسر ہیں۔ یہ تو نہیں معلوم اُن کا عہدہ کیا ہے لیکن میں ان کے نام پرچہ لکھ دیتا ہوں، اُن سے جس حد تک ہو سکے گا مدد کریں گے چنانچہ وہ میرا پرچہ لے کر مالک رام صاحب کے پاس گئے۔

مالک رام صاحب نے ان کی فائل منگوائی اور ساری فائل کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کرنے کے بعد ان سے کہا غالباً آپ کو گزشتہ برس کا کاغذ بھی پوری مقدار میں نہیں ملا۔ فاروقی صاحب صورت حال سے خاصے مایوس تھے۔ بولے ہاں یہ صحیح ہے لیکن چھوڑیئے گزشتہ برس کے کاغذ کو مجھے اس سال کا بقیہ کوٹہ مل جائے تو بڑی بات ہے۔ مالک رام صاحب نے کہا جب گزشتہ برس کے کاغذ پر آپ کا حق ہے تو آپ اسے کیوں چھوڑ رہے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو گزشتہ برس کا کاغذ بھی مل جائے چنانچہ مالک رام صاحب نے اس فائل پر جو نوٹ لکھے ان کے نتیجے کے طور پر مستحسن فاروقی کو سال رواں کے بقیہ کاغذ کے ساتھ گزشتہ برس کا بقیہ کوٹا بھی مل گیا۔ فاروقی صاحب کو جب اس بات کی منظوری کا کاغذ پہنچا اور ساتھ ہی وہ پروانہ بھی جس کی بنا پر وہ کاغذ کا پورا کوٹا حاصل کر سکتے تھے،

تو بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی کے عالم میں انھوں نے میرے دفتر کا رُخ کیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی انھوں نے بے اختیارانہ انداز میں کہا "یار جگن ناتھ! مالک رام تو تم سے بھی زیادہ اچھا آدمی ہے"۔ کمرے میں چند اور احباب بھی موجود تھے۔ اس جملے پر سب نے ایک قہقہہ لگایا اور جب میں نے اس جملے کی تشریح پوچھی تو فاروقی صاحب نے سارا واقعہ اوّل سے آخر تک کہہ سنایا کہ میرے کاغذ والے معاملے کی ڈوبی ہوئی کشتی مالک رام کی توجہ سے ابھر آئی ہے۔ ساتھ ہی فاروقی صاحب نے یہ بھی کہا کہ اس زحمت کے لیے جب میں ان کا شکریہ ادا کرنے گیا تو وہ بولے اس میں شکریے کی کیا بات ہے۔ اپنا دفتری کام تن دہی سے کرنا تو ہم لوگوں کے فرائض میں داخل ہے۔

مالک رام مزاجاً جلوت پسند بھی ہیں اور خلوت پسند بھی۔ علمی اور تحقیقی کام ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا یہ کام تنہائی اور گوشہ نشینی ہی میں سرانجام پاتا ہے اس چھوٹے سے مقالے میں اُن کی تحقیقی اور علمی کاموں کا جائزہ لینا مقصود نہیں۔ اس موضوع پر عرش ملسیانی ایک سیر حاصل مقالہ لکھ چکے ہیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھار جب آپ اس گوشہ تنہائی سے فراغت پانا چاہتے ہیں تو اپنے گھر ہی پر دوستوں کی محفل سجا لیتے ہیں۔ کبھی چائے پر کبھی کھانے پر۔ کبھی یہ محفل بزمِ مذاکرہ ہوتی ہے اور کبھی بزمِ مشاعرہ اور اس کے بعد آپ پھر علمی مراقبے میں چلے جاتے ہیں اور وقار انبالوی کے اس مصرعے کی تفسیر بن جاتے ہیں ع

رات، تنہائی، قلم، کاغذ، وقار

یہی قلم اور کاغذ ہی ان کی متاعِ گراں بہا ہے جس کی بدولت علم کے خزانوں میں انہوں نے اضافہ کیا، دور دور تک ان کا نام پہنچا اور ان کی عظمت کا ڈنکا بجا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اُن کی کتاب پر ایک بار تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ مصنف کا علمِ حدیث تبصرہ نگار سے کہیں زیادہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب اقبال عالمی کانگریس میں شرکت کے لیے میں لاہور گیا تو نہ جانے کتنے لوگوں نے مالک رام صاحب کے کانگریس میں شریک نہ ہونے کی وجہ پوچھی۔ میں نے شروع میں غلطی سے سچ کہہ دیا کہ ڈاکٹر نے آنے کی اجازت نہیں دی۔ بس پھر کیا تھا۔ پاکستان

کے ایک ایک ادیب نے میرے کمرے کا رُخ کیا اور مجھ سے ان کی خیریت پوچھی میں بتاتے بتاتے تھک گیا کہ بھئی خدا کے فضل سے بخیریت ہیں. تشویش کی کوئی بات نہیں ڈاکٹر نے صرف اس بنا پر شرکت کی اجازت نہیں دی کہ اس موقعے پر بڑی بڑی دعوتیں ہوں گی، صبح سے شام تک اجلاس جاری رہیں گے ان دعوتوں اور تھکن سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ لاہور کا رُخ ہی نہ کیا جائے۔

لیکن جب ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، جسٹس رحمٰن، ڈاکٹر جاوید اقبال، خواجہ عبدالوحید، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر معزالدین، محمد طفیل، پروفیسر محمد عثمان، ابوالخیر کشفی عبدالسلام خورشید اور ان کے علاوہ متعدد پاکستانی ادیبوں نے ان کی خیریت پوچھی تو مجھے بڑی چڑ ہوئی کہ یہ کیا معاملہ ہے. میں تو خود بزعم خویش اس کانگرس میں ہیرو بنا پھرتا ہوں، مجھ سے زیادہ مقبولیت تو پاکستان میں ان حضرت کو حاصل ہے جو کانگرس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔

لیکن مالک رام اپنی اس علمی شان و شوکت سے قطعاً بے خبر اور بے تعلق ہیں. وہ اپنے کام میں اتنے مگن ہیں کہ تعریف سے بھی بے نیاز ہیں اور مذمت سے بھی بے نیاز۔ انھوں نے جو بھی کام کیا اسے ایک معیاری درجہ حاصل رہا. آج ۱۹۷۸ء میں تو ان کی حیثیت مسلمہ طور پر ایک بین الاقوامی اہل قلم کی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب ان کے نام سے بہت کم لوگ آشنا تھے انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کے اس مقالے کا اردو میں ترجمہ کیا جو نکلسن نے "اسرار خودی" کے متعلق لکھا تھا. ترجمے کے ساتھ مالک رام نے اسے حواشی سے بھی مزیّن کیا یہ حواشی سمیت ترجمہ "نیرنگِ خیال" کے اقبال نمبر میں شائع ہوا اور جب یہ ترجمہ علامہ اقبال کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اسے اس قدر پسند کیا کہ انھوں نے مترجم کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور اقبال کی یہ خواہش مالک رام کی اقبال کے ساتھ پہلی ملاقات کا سبب بنی۔

مالک رام کا خاص موضوع غالب ہے۔ اقبال پر انھوں نے زیادہ نہیں لکھا لیکن اقبال کے متعلق جب بھی میری ان کے ساتھ گفتگو ہوئی ہے میں نے انھیں بحرِ اقبالیات

کا شناور پایا ہے۔ انھوں نے اقبالیات کے تعلق سے کئی موقعوں پر میری مشکلات کو آسان کیا۔ آج جب کہ اقبال کی از سرِ نو دریافت کے ساتھ ہندوستان میں اقبال شکنی کی مہم بھی شروع ہے، صحیح اقبال شناسی کا کام مالک رام کے قلم کا منتظر ہے۔ شاید اسی خیال کے تحت جب میں نے اپنی کتاب "اقبال اور کشمیر" کا انتساب مالک رام صاحب کے نام نامی سے کیا تو اقبال کا یہ شعر بے ساختہ میرے احساس میں چمکا اور میں نے اسے انتساب کے ساتھ ہی عنوانِ داستان بنایا۔

بیا کہ دامنِ اقبال را بدست آریم
کہ او ز خرقہ فروشانِ خانقاہے نیست

ڈاکٹر گیان چند

گفتارِ غالب

مالک رام ہمارے سب سے بزرگ محقق اور سب سے بڑے ماہر غالبیات ہیں معلوم نہیں اب تک غالب سے متعلق کتنی کتابیں اور کتنے مضامین لکھ چکے ہیں۔ "گفتار غالب" کتاب ایک اہم دیباچے اور ۱۳ مضامین پر مشتمل ہے۔ دیباچے کو انھوں نے پیش گفتار کہا ہے۔ اس پُر مغز گفتار میں انھوں نے یہ غلط فہمی دور کی ہے کہ اپنی زندگی میں غالب کی کوئی قدر نہیں ہوئی۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ غالب، شاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر اور نواب رامپور یوسف علی خاں دونوں کے استاد تھے۔ دہلی کے تمام عالموں اور ادیبوں سے ان کے مساویانہ مراسم تھے۔ ان کی تمام تصانیف ان کی زندگی میں نہ صرف شائع ہوئیں۔ بلکہ بعض کے کئی کئی ایڈیشن نکلے۔ اردو دیوان پانچ بار شائع ہوا۔ استادِ شاہ شیخ محمد ابراہیم ذوق کی زندگی میں ان کے دیوان کو ایک بار بھی طباعت کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ دیوانِ مومن محض ایک بار شائع ہوا غالب کے اردو فارسی خطوط تک کے مجموعے ان کی زندگی میں چھپ گئے یہ اعزاز اور کس کو ملا تھا؟ غالب کی دو روغنی تصویریں اور ایک فوٹو ملتے ہیں۔ ان کے ہمعصروں میں کتنوں کی معتبر تصویریں ہیں۔ مالک رام انکشاف کرتے ہیں

> "آج مختلف اساتذہ کی جو تصویریں متداول ہیں، یہ سب جعلی ہیں"۔
>
> ان میں سے بیشتر بھوپالی مصور محمد اویاما کی بنائی ہوئی ہیں۔

مالک رام صاحب کو محض محقق سمجھا جاتا ہے لیکن اس کتاب میں انھوں نے اپنی تنقیدی نظر کا وافر ثبوت دیا ہے۔ دیباچے میں کہتے ہیں کہ "اردو میں دو شاعر ایسے ہیں جن کے کلام میں اپنی مخصوص فضا ہے: میر اور غالب" ظاہر ہے کہ مالک رام[1] محض قدیم اساتذہ کی بات کر رہے تھے اقبال، جوش، یا میراجی وغیرہ کی نہیں۔ غالب کے لیے لکھتے ہیں:[2]

[1] ص ۱۶ [2] ص ۱۴-۱۵

131296

"غالب کی دنیا نشاط اور ولولے، غور و فکر، محبّت
اور جرأت کی دنیا ہے۔ اس سے آپ کو آزادیِ رائے
اور آگے بڑھنے کا سبق ملتا ہے، اس کے کلام میں حرکت
ہے نشاط ہے، ولولہ ہے ..... آپ کے دل میں طرح
طرح کے سوال پیدا ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ
جتنے سوالات خود غالب نے اپنے کلام میں خدا اور خدا
کے بندوں اور خود اپنے آپ سے پوچھے ہیں اتنے شاید
ہی کسی اور شاعر نے دریافت کیے ہوں گے۔ اس صفت
کو فکر انگیز کہہ سکتے ہیں۔ دوسری صفت اس کی ترقی پسندی
ہے۔ وہ کوئی نیا خیال یا لفظ یا ترکیب استعمال کرنے
سے نہیں جھجکتا۔"

مجموعے کے مضامین کے عنوان یہ ہیں:

(۱) میر اور غالب (۲) انسان کی خلافتِ الٰہیہ (۳) کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر (۴) ذوق اور غالب (۵) گلِ رعنا (بہرۂ اردو) (۶) گلِ رعنا (بہرۂ فارسی) (۷) دیوانِ اُردو کی کہانی (۸) چراغِ دیر (۹) غالب کی فارسی تصانیف (۱۰) دعائے صباح (۱۱) سوالاتِ عبدالکریم (۱۲) احسانِ غالب اور ذکا (۱۳) غالب اور تنافر۔

پہلے مضمون "میر اور غالب" میں یہ غلط فہمی دور کی ہے کہ غالب ابتدا میں دقیق انداز میں لکھتے تھے، بعد میں میر کے سہل انداز میں لکھنے لگے۔ فاضل مضمون نگار نے بتایا ہے کہ سہل انداز کی ۳۵ غزلیں ۱۸۲۶ء سے پہلے کی ہیں۔[۳] دوسرے مضمون "انسان کی خلافتِ الٰہیہ" میں غالب کے فارسی اور اُردو اشعار سے ثابت کیا ہے کہ غالب کی نظر میں انسان دنیا میں خلیفۂ الٰہی اور خلاصۂ کائنات ہے۔ اقبال کی مشہور فارسی نظم "خدا اور انسان" کا مکالمہ (چراغ آفریدم) سے پہلے غالب نے اعلان کیا تھا:

زما گرمست ایں ہنگامۂ بنگر شورِ ہستی را[۴] | قیامت می دمد از پردۂ خاکی کہ انساں شد[۵]

---

۳ ص ۱۳ ۴ ص ۳۳

"کلامِ غالب میں معاشرتی عناصر" ایک اچھوتا تنقیدی مضمون ہے۔ اس انداز کا تجزیہ پہلے کہیں دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ اس میں غالب کے کلام سے معاشرتی آداب، شرفا کے اصول، سامانِ خورد و نوش، میلے تیوہار، توہمات، پیشے وغیرہ سے متعلق بیانات درج کیے ہیں مثلاً اس زمانے میں جب کوئی شخص کسی سے رخصت ہوتا تھا تو اسے اپنی یاد دلانے کے لیے کوئی تحفہ دے دیتے تھے۔ ان میں سب سے مقبول شے تھی چھلا، جو اکثر نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے:

کافی ہے نشانی تری چھلّے کا نہ دینا

خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت [۵]

اسی طرح مصنف کے بقول، بازار میں علیک سلیک کے علاوہ طویل گفتگو کا بالکل رواج نہ تھا ناقدینِ حدیث نے لکھا ہے کہ کوئی شخص بازار میں کھڑا کھا رہا ہو، تو اس کی روایت کردہ حدیث پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ غالب اس شعار کا فائدہ اٹھا کر کہتے ہیں۔

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال

کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے [۶]

ظفر کے دربار کے یہ آداب تھے کہ درباری ایک دوسرے سے ملنے پر سلام کے لیے اپنے ہاتھ پیشانی کے بجائے کان تک لے جاتے تھے۔ اس کی غالب نے یہ لطیف توجیہ

کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام

اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں [۷]

"ذوق اور غالب" ایک اور تنقیدی مضمون ہے۔ مالک رام ماہرِ غالبیات ہیں، توقع تھی کہ وہ غالب کے طرفدار ہوں گے لیکن اس مضمون میں انھوں نے ذوق اور غالب کے ہم معنی اشعار کا بڑی معروضیت سے موازنہ کیا ہے اور اکثر صورتوں میں ذوق کے اشعار کو ترجیح دی ہے۔ "ارمغانِ مالک" دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ مضمون ستمبر ۱۹۲۶ء کا ہے اور اسی سے اُن کی غالب سے دلچسپی کی ابتدا ہوئی۔

کلامِ غالب کے ابتدائی انتخاب "گلِ رعنا" سے متعلق دو مضامین ہیں۔ یہ انتخاب گم ہوگیا تھا ۱۹۵۱ء میں مالک رام صاحب کو سب سے پہلے اس کا نسخہ ملا اور انھوں نے "نذرِ ذاکر" میں اس کا تعارف کرایا

---

۵ ص ۴۳ ۶ ص ۴۹ ۷ ص ۵۰

"دیوان اُردو کی کہانی" ۷۴ صفحوں کا تحقیقی مضمون ہے اور میرے نزدیک اس مجموعے کی بیت الغزل یہ اور "معاشرتی عناصر" والا مضمون اس مجموعے کے سب سے دقیق اور دلچسپ مضامین ہیں۔ تحقیق میں کس طرح افسانوی دلچسپی بتائی جاسکتی ہے، وہ "دیوانِ اردو کی کہانی" میں دیکھئے۔ اس کی ابتدا میں یہ بحث ہے کہ غالبؔ نے شعر گوئی کا آغاز کب کیا! اس کے بعد ان کے مرتبہ قلمی مجموعوں، انتخابات، دیوان کے مختلف ایڈیشنوں اور بیسویں صدی کے بعض مطبوعہ متون کی تفصیل ہے۔ ہر چیز آئینہ ہوکر سامنے آجاتی ہے، ہر موضوع کے ابعاد سے پوری واقفیت ہوجاتی ہے۔ "دیوانِ غالبؔ بخطِ غالبؔ" کی بحث خاص طور سے دلچسپ ہے۔ اس سے یہ انکشاف ہوا کہ مالک رام صاحب نے توفیق احمد کو اس نسخے کے لیے دس ہزار روپے پیش کئے تھے[8] لیکن وہ نہ مانا دوسرا اہم مفروضہ یہ ہے کہ اس دیوان سے پہلے بھی کوئی غیر معروف بیاض رہی ہوگی اور اس دیوان کی ایک اور نقل تیار کی گئی ہوگی۔[9]

موجودہ دیوان منتخب ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے لکھا ہے کہ "انتخاب کا کام مولوی فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی کوتوال نے کیا تھا"۔[10] مالک رام اس سے متفق نہیں۔ کہتے ہیں کہ فضل حق عالم تھے۔ لیکن تنقیدِ شعر میں ان کا کوئی مقام نہیں۔ مرزا خانی، قتیلؔ کے شاگرد تھے[11] غالبؔ کی قتیلؔ اور ان کے شاگردوں کے بارے میں جو رائے تھی، وہ سب کو معلوم ہے صحیح بات یہ ہے کہ انتخاب کا کام خود غالبؔ ہی نے کیا اور محض ایک بار نہیں بلکہ وہ ساری عمر حذف و اضافہ کا عمل کرتے رہے۔

"دعاے صباح"، حضرت علیؓ سے منسوب ایک عربی دعا ہے، جس کا غالبؔ نے فارسی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ قاضی عبدالودود کہا کرتے تھے کہ غالبؔ کو عربی بالکل نہیں آتی تھی۔ مالک رام بھی مانتے ہیں کہ مرزا کی عربی بہت کمزور تھی۔[12] اس لیے کسی نے عربی دعا کا فارسی نثر میں ترجمہ کیا جسے غالبؔ نے منظوم کیا۔ یہ نظم اُن کے بھانجے مرزا عباس بیگ کے ایما پر شائع ہوئی۔ مالک رام صاحب نے کئی صفحات میں اس تفصیل سے عباس بیگ کی سوانح لکھی ہے، جیسے یہ ان کی چھٹی کی کھیر کھاچکے ہوں ان سے پہلے کالی داس گپتا رضا نے اپنی کتاب "متعلقاتِ غالبؔ" میں اور زیادہ تفصیل سے لکھا ہے لک رام صاحب کے بیان سے ایک دلچسپ اقتباس سنیئے:

"سب سے پہلی حرکت انھوں نے یہ کی کہ اپنی چچی یعنی مرزا

---

[8] ص ۱۴۲ [9] ص ۱۵۲۔ ۱۵۱ [10] ص ۱۳۹ [11] ص ۲۱۵

افضل بیگ کی جوان بنگال بیوی کو گھر ڈال لیا۔ مرزا افضل
بیگ جب کلکتے سے واپس آئے ہیں، تو یہ خاتون وہاں
سے ان کے ساتھ آئی تھیں۔ خدا معلوم آپس میں باقاعدہ
شادی بھی ہوئی تھی یا نہیں۔ لیکن بہر حال عرفِ عام میں
وہ عباس بیگ کی چچی ہی تھیں۔ بظاہر افضل بیگ واپسی
کے بعد زیادہ دن زندہ نہ رہے۔ یہ عورت جوان بھی تھی
اور خوبصورت بھی۔ ادھر عباس بیگ کی بھی ابلتی جوانی
اور سُرخ و سپید رنگ۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا ہوگئے
نتیجہ وہی نکلا جس کی توقع کی جا سکتی تھی خاندان کے
دوسرے افراد نے اس شنیع پر دونوں کو، اور خاص طور
پر عباس بیگ کو بہت لعن طعن کی۔" [۱۲]

سوانح دلچسپ ہے لیکن اتنی تفصیل کی کیا ضرورت تھی؟
بہادر شاہ کے عہد میں دستور یہ تھا کہ ملازموں کو چھ ماہ میں ایک بار تنخواہ ملتی تھی۔ بادشاہ چاندنی چوک اور کٹرہ نیل کے مہاجنوں سے قرض لے کر تنخواہیں بانٹ دیتے تھے۔ غالبؔ کا چھ ماہی تنخواہ میں گزارا نہ ہوتا تھا۔ اس پر انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں ایک منظوم درخواست پیش کی کہ انھیں تنخواہ ماہ بہ ماہ ملے۔ اس کے تین اشعار یہ ہیں ؎

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک — خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات — اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار
میری تنخواہ کیجیے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار

مالک رام صاحب نے دریافت کیا ہے کہ یہ منظوم عرضی غالبؔ کی ایجاد نہیں۔ اس میں انھوں نے حافظ عبدالرحمن خاں احسان کی تقلید کی ہے [۱۳] جنھوں نے غالبؔ سے پہلے ظفر کے نام اسی زمین میں ایک قطعہ بھیجا تھا جس میں تنخواہ نہ ملنے کی دلچسپ داستان اور تنخواہ کی ادائیگی کا تقاضا تھا۔ اس میں کوئی

[۱۲] ص ۲۱۱ [۱۳] ص ۲۵۲، [۱۴] ص ۲۵۶۔

شبہ نہیں کہ غالب کے سامنے احسان کا قطعہ تھا غالب نے بھی احسان کی طرح قرآن کا ایک ٹکڑا مصرعۂ ثانی کی شکل میں ہو بہو لے لیا ہے۔ ع

وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار ط

غالب کی تقلید کی ان کے شاگرد حبیب اللہ ذکا حیدر آبادی نے۔ جب انھیں ایک مرتبہ نواب سالار جنگ کے یہاں سے تنخواہ نہ ملی، تو انھوں نے بھی اسی زمین میں ایک قطعہ لکھ کر نواب صاحب کو بھیجا۔ پہلے دو اصحاب کے برخلاف ذکا کے قطعے میں سنجیدگی ہے۔

غرض یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید دونوں اعتبار سے "گفتارِ غالب" ایک قابلِ قدر کتاب ہے، اور کیوں نہ ہوتی، اس کا مصنف مالک رام صاحب کے پائے کا غالب شناس ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

مالک رام: صفِ اوّل کے خاکہ نگار

اردو خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش فارسی اور اردو تذکروں میں ملتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کے "نکات الشعرا" سے لے کر محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" تک شاید ہی کوئی تذکرہ ایسا ہو جس میں ایسی تحریریں موجود نہ ہوں، جنھیں ہم مختصر یا مختصر ترین خاکے نہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ان تذکروں میں شاعروں کے جو خاکے پیش کیے گئے ہیں ان میں سے بعض اتنے مختصر ہیں کہ شاعر کی پوری شخصیت ہمارے سامنے نہیں آتی، لیکن مختلف تذکروں میں ایک ہی شاعر کے جو مختصر سوانحی خاکے پیش کیے گئے ہیں انہی کی بنیاد پر ہم نے ان شاعروں پر ضخیم کتابیں لکھی ہیں مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، آتشؔ، انیسؔ، دبیرؔ، مومنؔ، ذوقؔ وغیرہ پر کتابیں انہی تذکروں کی مدد سے لکھی گئی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے تذکروں میں شاعروں کی شخصیت اور سیرت کے بارے میں ایک دو فقروں ہی میں معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ انیسویں صدی میں تذکروں کی ضخامت کے ساتھ ساتھ سوانحی خاکے بھی پہلے کے مقابلے میں طویل ہونے لگے۔ خاص طور سے قدرت اللہ قاسم کے "مجموعۂ نغز"، شاہ محمد کمال کے "مجمع الانتخاب"، سعادت خاں ناصر کے "خوش معرکۂ زیبا" اور خوب چند ذکا کے "عیار الشعرا" میں سوانحی خاکے قدرے طویل ہیں۔ ان تذکروں سے بہت سے شاعروں کی شخصیت اور سیرت پر بیش بہا روشنی پڑتی ہے۔ محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" میں پہلی بار ہمیں بعض شاعروں کے مکمل خاکے نظر آتے ہیں۔ آزاد صرف، ادبی مورخ، ادیب یا نقاد ہی نہیں تھے۔ وہ تخلیق کار بھی تھے۔ اس لیے انھوں نے شاعروں کے خاکے لکھنے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے بھرپور کام لیا ہے۔ انھوں نے شاعروں کے سوانح، اُن کے لباس عادات و اطوار اور سیرت غرض ہر چیز پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو میں سوانح نگاروں کے ساتھ خاکہ نگاری کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی، اردو کا پہلا مکمل

خاکہ فرحت اللہ بیگ کا لکھا ہوا "نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی" ہے۔ اس خاکے میں نذیر احمد کے سوانح نہیں لکھے گئے بلکہ فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی شخصیت اور سیرت کے بارے میں اپنے تاثرات انتہائی فنکارانہ انداز میں پیش کیے ہیں۔ اسی ضمن میں کچھ سوانحی حالات بھی آگئے ہیں۔

فرحت اللہ بیگ کے بعد اردو میں خاکہ نگاروں کی تعداد خاصی نظر آتی ہے۔ ان میں مولوی عبدالحق پروفیسر رشید احمد صدیقی سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، مالک رام، محمد طفیل، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

تذکروں میں خاکے نامکمل صورت میں ملتے ہیں۔ اردو کا پہلا مکمل خاکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا فرحت اللہ بیگ کا "نذیر احمد کی کہانی ہے"۔ اس کے بعد خاکہ نگاری نے اردو میں باقاعدہ ایک فن کی صورت اختیار کرلی۔ مالک رام صاحب کی خاکہ نگاری کے بارے میں کچھ کہنے سے پہلے میں فنِ خاکہ نگاری کی خصوصیات کے بارے میں کچھ عرض کردوں۔

خاکہ نگاری سوانحی مضمون نہیں ہوتا بلکہ خاکہ نگاری کی توجہ اس شخص کی سیرت اور عادات و اطوار پر ہوتی ہے، جس کا وہ خاکہ لکھتا ہے۔ گویا خاکہ کردار نگاری سے قریب ہوتا ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کے ظاہر اور باطن دونوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، ان پہلوؤں پر خاص توجہ کرتا ہے جو عام انسان کی نظروں سے چھپے ہوتے ہیں۔ یہاں خاکہ نگار کے لیے ایک اچھے ماہرِ نفسیات، غیر جانب دار انسان اور اعلا درجے کا تخلیق کار ہونا ضروری ہے۔ سوانح اپنے پیش رو معاصرین اور ایسے پیش رو بزرگوں کے بھی لکھے جاتے ہیں جنھیں سوانح نگار نے کبھی نہیں دیکھا۔ سوانح نگاری میں کتابوں، مختلف لوگوں کے بیانوں اور ذاتی تجربات سے مدد لی جاتی ہے جب کہ خاکہ صرف ذاتی تجربات اور تاثرات کی بنیاد پر لکھا جاتا ہے۔ مالک رام صاحب کا لکھا ہوا ایک خاکہ اس تعریف پر پورا نہیں اترتا وہ ہے غالب کا خاکہ، جس پر تفصیل سے گفتگو بعد میں کی جائے گی ورنہ مالک رام صاحب کے تمام خاکے بقول ان کے ان لوگوں کے ہیں" جن سے لمبے عرصے تک تعلقات رہے، ان سے خط و کتابت بھی رہی.... ان بزرگوں کے بارے میں اپنے تاثرات جمع کر رہا ہوں، جن سے مجھے اپنی حیاتِ مستعار میں ملاقات اور استفادے کا موقع میسّر آیا۔ یہ سب میرے معاصر ہیں۔ معاصرت کے لیے عمر کی برابری ضروری نہیں البتہ ایک زمانے میں موجودگی لابدّ ہے۔ خوش قسمتی سے مجھے اپنی خردی اور ہیچمدانی و ہیچمرزی کے

باوجود ان بزرگوں کی خدمت میں رہنے کی سعادت اور مسرت حاصل ہوئی" (تعارف، وہ صورتیں الہٰی)

سوانح نگاری میں واقعات اوران کی ترتیب کی بہت اہمیت ہے لیکن خاکہ نگاری میں واقعات تو اپنے تاثرات کو موثر طریقے سے پیش کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں خاکہ نگار جب اپنا کام شروع کرتا ہے تو شخصیت ایک پتھر کا بڑا سا ٹکڑا ہوتی ہے اور خاکہ نگار وہ سنگ تراش ہوتا ہے جو چھینی اور ہتھوڑی کی مدد سے زائد پتھر کو چھیل کر اصل مورتی کو باہر نکال لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت مشکل کام ہے اور بہت پختہ فنی صلاحیتوں کا متقاضی اس کام کے لیے بہت ایماندار، سچا، غیر جانب دار اور ساتھ ہی مخلص اور ہمدرد ہونا ضروری ہوتا ہے۔ خاکہ نگار شخصیت کی خوبیاں بیان کرتا ہے لیکن خامیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا پھر اسے اصل شخصیت کو نمایاں کرنے کے لیے بہت توازن سے کام لینا پڑتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ خاکہ اس شخص کا لکھا جاتا ہے جس سے خاکہ نگار کو قربت کا موقع ملا ہو لیکن مالک رام صاحب نے غالب کا بھی خاکہ لکھا ہے جو اپنے انداز کا اردو میں پہلا خاکہ ہے صرف یہی نہیں کہ پہلا خاکہ ہے بلکہ کامیاب ترین خاکہ ہے خاکے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے "مرزا غالب سے ان کی زندگی میں مجھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا ہمارے خاندان کے اُن سے بہت پرانے تعلقات تھے بلکہ دور نزدیک سے کچھ عزیزداری بھی تھی میرے والد ان کے ہم عصر و ہم عمر و ہم جولی تھے۔ وہ دونوں بچپن میں شیخ معظم کے مکتب میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے لیکن میری ملاقات ان سے بہت بعد کو ہوئی"۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ غالب کی وفات کے تقریباً سو سال بعد یہ خاکہ لکھا گیا ہے اس خاکے کے بارے میں" وہ صورتیں الہٰی" کے تعارف میں لکھتے ہیں "تو اب میں آپ کو کیوں کر یقین دلاؤں کہ غالب سے اکثر میری ملاقات رہی ہے اور میں نے انھیں بھی اتنے ہی قریب سے دیکھا ہے جتنا ان دوسرے بزرگوں کو جن کے حالات آپ اس کتاب میں پائیں گے بلکہ جسارت کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ دوسروں کی موت کے بعد ان سے ملاقات واقعی منقطع ہو گئی، غالب سے تو آج تک جاری ہے حالاں کہ وہ جسدی لحاظ سے ان سب سے کہیں پہلے راہی ملکِ بقا ہوئے تھے" یہ حقیقت ہے کہ پچھلے پچاس سال سے مالک رام صاحب غالب ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ غالب کے سوانح اُن کی

شخصیت اور فن پر جتنا کام مالک رام صاحب نے کیا ہے کسی اور ماہر غالب نے نہیں کیا۔ میں ذاتی علم کی بنیاد پر پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں غالب کے بارے میں جتنی معلومات مالک رام صاحب کی ہیں اور کسی محقق کی نہیں۔ اگر آپ غالب کے بارے میں مالک رام صاحب سے کوئی سوال کریں تو بہت طویل جواب دیں گے اُن کے لب و لہجے سے غالب کے لیے جو محبت اور خلوص جھلکتا ہے وہ سو سال پہلے کے شاعر نہیں بلکہ اپنے ایک دوست کے لیے ہی ممکن ہے۔ مالک رام صاحب نے غالب کا اتنا وسیع مطالعہ کیا ہے کہ غالب کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جو ان کی نظر سے پوشیدہ ہو۔ غالب کی تمام خوبیوں اور خرابیوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ غالب کی شخصیت، عادات و اطوار روزمرّہ کا معمول، اُن کا لباس غرض ہر چیز کے بارے میں مالک رام صاحب کی حیرت انگیز معمولات ہیں اس خاکے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غالب کا روزمرّہ کا معمول بیان کیا گیا ہے غالب کے عادات واطوار اور ان کے اقتصادی اور سماجی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ شاگردوں اور دوستوں سے ان کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک بات بھی ایسی نہیں کہی گئی، جو حقیقت سے دور ہو غالب کے خطوط میں سے بہت سے فقرے نکال کر انھیں مکالموں کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ خاکے میں ۱۸۵۰ء سے غالب کی وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں خاکے میں بہت کامیاب اور دلچسپ ٹیکنک استعمال کی گئی ہے۔ خاکہ نگار پہلی بار ۱۸۵۰ء میں آگرے سے دہلی آتا ہے اور غالب کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ پھر دو، دو، تین تین سال بعد دہلی آتا ہے اور ہر بار غالب کی گرتی ہوئی صحت میں ہونے والی تبدیلی اور نئے حالات کا ذکر کرتا ہے اس طرح یہ خاکہ غالب کی وفات تک کے حالات کا احاطہ کرتا ہے۔ غالب کی شکل وصورت جسم و لباس کے بارے میں کسی ایک جگہ تفصیلات نہیں ملتیں غالب نے خطوط میں کہیں کہیں اپنے بارے میں بہت مختصر الفاظ میں کچھ لکھا ہے، کچھ ان کے معاصرین نے اشارے کیے ہیں، کچھ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کچھ تفصیلات غالب کی تصویروں سے ملتی ہیں ان تمام بکھری ہوئی معلومات کو یکجا کرکے مالک رام صاحب نے غالب کی کیسی مکمل تصویر پیش کی ہے لکھتے ہیں۔

"مرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا ہاڑ
داڑی صفاچٹ، نازک باریک مونچھیں جنھیں تاؤ دے رکھا

تھا، بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، جس
میں چمپئی دمک تھی، سر پر لمبے لمبے پٹھے، قلموں پر لٹکتے
ہوئے بال، سر پر ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدے
کا کام تھا۔ بدن پر تن زیب کا انگرکھا اور نیچے ایک برکا
سپید پاجامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان
کی سٹک تھی اور کش لگا رہے تھے۔"

خاکہ نگار کی حیثیت سے مالک رام صاحب کو جزئیات نگاری پر وہ قدرت حاصل ہے جو اعلا درجے کے تخلیق کار کو ہوتی ہے۔ وہ کسی موقع یا واقعے کی صرف وہ تفصیلات بیان کرتے ہیں جو اس شخصیت کی عادات واطوار اور کردار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں، جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہے۔ چوں کہ غالب کے سلسلے میں مالک رام صاحب معلومات کا خزانہ ہیں اس لیے جو تصویر کشی وہ کرتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ مالک رام صاحب محقق کی حیثیت سے غالب کے گھر کے لوگوں دوستوں اور رشتے داروں سے بخوبی واقف ہیں، ان معلومات کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دیکھیے غالب کے ناشتے کا حال کس طرح بیان کیا ہے۔ بالکل یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم وہاں موجود ہیں، جہاں غالب ناشتہ کر رہے ہیں بلکہ عینی شاہد کی حیثیت سے ممکن ہے کہ بعض جزئیات پر ہماری نظر نہ جائے۔ مالک رام صاحب تمام جزئیات پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں اور اس طرح ان کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں کہ ہر چیز ہماری نظر میں آجاتی ہے۔ اب ذرا غالب کے ناشتے کا منظر دیکھیے:

"تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سرپوش
ڈھکا ہوا ایک لوٹا اور دو خالی گلاس لائی اور انھیں
قالین کے پاس رکھ کر چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے
پوچھا: کیوں بھائی، حصہ کروگے۔ میں نے شکریہ ادا کیا
اور پوچھا کہ کیا ہے؟ کہنے لگے: بادام اور مصری، کوئی حرام
چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مجھے گرمی کی

شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو
پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح چھلکا اتار کر
انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر
مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ چنانچہ گرمی ہو کہ جاڑا روزانہ
صبح نہار منہ یہ ٹھنڈا پانی پیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے
کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس
کرتا ہوں۔ اس تبرید کے لیے مصری خاص طور پر بیکانیر
سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور خشک اور
مٹھاس اس میں خوب ہوتی ہے یہاں جو مصری بازار میں
ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔"

بی وفادار غالب کی ملازمہ تھیں۔ غالب نے اپنے خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے ایک اور ملازم تھے۔ نیاز علی۔ وہ غالب کو کھانے کے لیے بلاتے تھے۔ غالب خاکہ نگار کو ساتھ لے کر دسترخوان پر آتے ہیں۔ یہ پورا منظر ملاحظہ ہو۔

"باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے نیاز علی نے آکر اطلاع
دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوایا جائے۔ اس پر
دوستوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اور میں
دونوں بچوں کے ساتھ اندر گئے۔

اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے
میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بھرے کریلے تھے، بریانی پلاؤ
تھا۔ دو تین قسم کا سرکے اور تیل کا اچار تھا، لیکن ایک
بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت ترکاری سب میں چنے
کی دال پڑی ہے، دُلے میں کم اور گوشت ترکاری میں زیادہ۔
میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا دو ایک

نوالے کریلے کے ساتھ تھوڑے سے چاول بھی چکھے
البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار
میں کھایا۔"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ مالک رام صاحب صرف غالب ہی نہیں ان کے دوستوں اور رشتہ داروں سے بھی پوری طرح واقف تھے غالب اپنے دیوان خانے میں بیٹھے ہیں۔ نواب شیفتہ اور دوسرے لوگ بھی حاضر ہیں۔ مالک رام صاحب اس محفل کا منظر کس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں

"نواب شیفتہ چالیس سے اوپر تھے، ان کے چہرے
سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ بات بہت ٹھہر ٹھہر
کر کرتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خاں ان دنوں جوان تھے،
تیس کے لگ بھگ ہوں گے، بارعب کتابی چہرہ، بھری بھری
داڑھی، شربتی آنکھیں۔ حکیم احسن اللہ خاں اور مولانا
نصیر الدین دونوں بزرگ بڑی نورانی شکلوں کے مالک
تھے۔ حال آنکہ حاضرین میں سب کے سب وجیہہ اور
باوقار لوگ موجود تھے، پھر بھی اس سارے مجمع میں مرزا
صاحب کی شخصیت خاص طور پر نمایاں تھی۔ دیر تک
ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کچھ شعر و شاعری، کچھ
تصوف، کچھ قلعے کے لطیفے۔ غرض کہ دو گھڑی بڑے
لطف کی صحبت رہی اس کے بعد احباب رخصت
ہونے لگے۔"

خاکہ لکھتے ہوئے مالک رام صاحب کی نظر صرف غالب اور ان کے متعلقین ہی پر نہیں ہے بلکہ اس عہد کی دلّی کا بھی نقشہ کھینچتے چلے جاتے ہیں عہدِ غالب میں جامع مسجد اور چاندنی چوک کا حال ملاحظہ ہو۔

"مرزا صاحب نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے پالکی

واپس کردی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ تھا
کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازیگر اپنے کرتب
دکھا رہا ہے یا روگ اس کے گرد بڑا باندھے کھڑے ہیں کہیں
بھان متی کا تماشا ہو رہا ہے اور یہاں بھی ٹھٹھ لگے ہوئے
ہیں دوسری طرف خوانچے والے طرح طرح کی بولیاں بول
رہے ہیں سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں
چلتے چلتے مرزا صاحب ایک جگہ رک گئے اور کلیان سے
کہا، جاؤ کلن کی دکان سے رات کے لیے چار آنے کے
سیخ کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوا لایا۔ میں
نے راستہ میں ایک جگہ سے دو تین کتابیں خریدیں اور
مرزا صاحب نے بچوں کے لیے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔
واپسی میں چاندنی چوک کے راستے سے ٹہلتے ہوئے آئے۔
سعادت خاں کی نہر سڑک کے بیچوں بیچ تھی۔ دو رویہ
درختوں کی قطار اور دکانوں کی روشنی کا پانی میں عکس
عجیب پُرلطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت
جتنی گھبرائی ہوئی تھی اتنی ہی اس وقت شام کی سہانی
فضا میں محظوظ ہوئی۔ سینکڑوں آدمی نہر کے کنارے
بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔"

غرض یہ ہے کہ غالب پر مالک رام صاحب کا لکھا ہوا خاکہ اتنا دلچسپ اور مکمل ہے کہ اردو میں اس کی اور کوئی مثال نہیں۔

محمد حسین آزاد نے چہرے، جسم اور لباس اور عادتوں پر روشنی ڈال کر پہلی بار شاعروں کی مکمل قلمی تصویریں پیش کی تھیں، آزاد کے بعد فرحت اللہ بیگ نے "دلی کا آخری یادگار مشاعرہ" میں اس فن کو جلا دی اور پھر ڈاکٹر عبدالحق مرحوم نے اس فن کو اپنایا۔ مالک رام صاحب فنِ خاکہ نگاری میں ان

حضرات سے بھی متاثر ہیں۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کے قلمی چہرے اس طرح لکھے ہیں کہ پوری شخصیت ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے، غالب، شیفتہ اور نواب ضیاء الدین احمد خاں کے قلمی چہرے ہم پڑھ چکے ہیں مالک رام صاحب اپنے بزرگ سائل دہلوی کے پاس بیٹھے ہیں سائل صاحب کے ایک دوست خان بہادر حکیم امجد علی خاں صاحب تشریف لائے ان کا قلمی چہرہ ملاحظہ ہو۔

> "ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کر چکے تھے، کہ نیچے سڑک پر ایک گاڑی آکے رکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ ۵۵۔۶۰ برس کا سن، سانولا رنگ، لانبا قد، اکہرا جسم، کھچڑی داڑھی، تھوڑی پر زیادہ کلّوں پر کم، جسم پر بند گلے کا شیروانی نما لمبا گرم کوٹ، اور نیچے گرم پاجامہ، سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی، وہ آئے اور آداب عرض کر کے نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے، جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا: بھائی! میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ پھر میرے متعلق چند کلمے کہہ کر مجھ سے فرمایا۔ آپ خان بہادر حکیم امجد علی خاں صاحب ہیں، میرے بچپن کے لنگوٹیے بھائی نہیں، مگر بھائی سے عزیز تر۔"

مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا قلمی چہرہ دیکھیے:

> "ہم لوگ اس اتوار کے دن گئے، یہ تاجور پارٹی یعنی انجمن ارباب علم و ادب کا مشاعرہ تھا یہیں میرزا یاس یگانہ کو پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا۔ مشاعرے کی صدارت سرشیخ عبدالقادر مرحوم نے کی تھی۔ انھوں نے میرزا سے اپنا کلام سنانے کو کہا، تو وہ منبر پر تشریف لائے لگ بھگ ۴۵ برس کا سن، متوسط قد، سانولا رنگ، تیکھا ناک

نقشا، بڑی بڑی ذہین اور چمکدار سیاہ آنکھیں چشمہ
لگائے ہوئے، بڑی گھنی مونچھیں جنھیں بھرپور تاؤ
دے رکھا تھا سر پر اونچی دیوار کی سیاہ کپڑے کی ٹوپی
اور گلے میں معمولی سپید کپڑے کی شیروانی تھی جس کی
بائیں طرف کی جیب کے باہر گھڑی کی زنجیر دکھائی دے
رہی تھی، نیچے سپید لٹھے کا پاجامہ، پیروں میں سیاہ رنگ
کا پمپ شو اور ہاتھ میں ہلکی سی بید کی چھڑی۔ یہ تھے
میرزا یاس عظیم آبادی۔"

حبیب الرحمٰن خاں شروانی کا مرقع دیکھیے، معلوم ہوتا ہے کہ کیمرے سے تصویر لی گئی ہے
بعض باتیں ایسی بتائی گئی ہیں، جو تصویر میں بھی نہیں آسکتیں مرقع ملاحظہ ہو:

"خاصا لانبا قد، کوئی پونے چھ فٹ کے قریب، کسرتی جسم
سُرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی
ستواں ناک، خضاب لگی ہوئی بھرواں داڑھی خضاب
لگے کچھ دن ہو چکے تھے، کیوں کہ جڑوں سے سپیدی جھانکنے
لگی تھی چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جس سے
سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے اور ان کے پان کے
شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم
کوٹ اور نیچے غالباً اسی کپڑے کا پاجامہ تھا سر پر ٹوپی
تھی اور اس کے اوپر منڈاسے کی شکل میں سپید
شال اوڑھے تھے۔ ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی
میں نے بہت کم دیکھے ہیں۔"

مولانا سلیمان ندوی کا حلیہ ایسے موثر الفاظ میں پیش کیا ہے کہ مولانا مرحوم کی پوری تصویر
آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے ۱۹۳۶ء میں مولانا امداد صابری نے علامہ سید سلیمان ندوی کے

خلاف ایک رسالہ "علامہ سید سلیمان ندوی کی قرآنی غلطیاں" چھاپا اس میں مولانا امداد صابری نے ان غلطیوں کی طرف اشارہ کیا تھا، جو ان کے خیال سے علامہ ندوی سے "سیرۃ النبی" میں سرزد ہوئی تھیں۔ علامہ صاحب نے دسمبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس رسالے کا جائزہ لیا اور بعض ایسی باتیں لکھ دیں، جن سے وہ قانون کی زد میں آ گئے مولانا امداد صابری نے دلّی کی عدالت میں ازالۂ حیثیتِ عرفی اور ہرجانے کا دعویٰ دائر کر دیا۔ دلّی کی ایک عدالت میں پہلی پیشی میں حاضر ہونے کے لیے علامہ ندوی دلّی تشریف لائے۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مالک رام صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا امداد صابری کے درمیان جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی، وہ دور ہو گئی اور دونوں نے عدالت میں راضی نامہ داخل کر دیا۔ اسی موقع پر مالک رام صاحب کی علامہ ندوی سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے مالک رام نے علامہ کا مرقع پیش کیا ہے۔ ایسا مرقع کہ معلوم ہوتا ہے علامہ مرحوم ہمارے سامنے کھڑے ہیں مالک رام صاحب لکھتے ہیں:

"مرحوم سے میری پہلی ملاقات اسی سلسلے میں ہوئی وہ اس مقدمے میں پیشی کے لیے دلّی آئے، تو حسبِ معمول جامعہ ملّیہ اسلامیہ (قرول باغ) میں بھی تشریف لائے۔ ان دنوں میرا بھی اسی قرب و جوار میں قیام تھا۔ یہیں ایک شام میں حامد علی خاں (جنرل منیجر مکتبہ جامعہ) کے مکان پر ان سے ملا۔ نسبتاً چھوٹا قد، آفتابی چہرہ بڑی بڑی روشن آنکھیں، کشادہ اونچی پیشانی، کسی قدر لمبی ناک جو پھننگ کے قریب قدرے موٹی ہو گئی تھی قصّ الشوارب واعفاء اللحی کا مصداق چھوٹی چھوٹی لبیں اور گھنی کھچڑی ڈاڑھی، جو بہت لمبی نہیں تھی اور جس میں سپید بال زیادہ تھے اور سیاہ کم۔ صاف ستھرا کھلتا رنگ، گلے میں شیروانی نما بند گلے کا کوٹ جس کی دائیں طرف کی

جیب سے گھڑی کی زنجیر لٹک رہی تھی اور دوسری طرف
لکھنے کا قلم نظر آرہا تھا۔ نیچے سپید پاجامہ اور سر پر عمامہ
جس کا شملہ پیچھے سے اٹھا کر خاص طریقے سے اڑس
رکھا تھا۔ یہ تھا ان کا حلیہ۔ میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں
اور ان کی صورت میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔"

مالک رام صاحب اگر افسانہ نگاری پر توجہ کرتے تو وہ کامیاب افسانہ نگار ہوتے میں نے یہ بات اس لیے کہی کہ مالک رام صاحب جزئیات پر گہری نظر رکھتے ہیں پھر وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے قاری کو فراموش نہیں کرتے ان کا رویہ اس رہنما کا ہوتا ہے جو سیّاحوں کو آثارِ قدیمہ دکھاتا ہے یہ رہنما کہیں اختصار سے کام لیتا ہے اور کہیں تفصیل سے، وہ دراصل جانتا ہے کہ کن چیزوں کا علم ضروری ہے اور کونسی چیزیں ایسی ہیں جن کی عدم واقفیت سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔

مالک رام صاحب دلّی آئے ہیں یہاں اپنے ایک ہم وطن دوست جگت سنگھ کے ساتھ قیام کرتے ہیں انھوں نے نواب سراج الدین احمد خاں کا ذکر کیا اور ان سے ملاقات کی ترغیب دی اب یہ تفصیلات مالک رام صاحب کی زبانی ملاحظہ ہوں۔

اس زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن دوست
جگت سنگھ رہتے تھے، ساتھ کے کھیلے ہوئے، ساتھ کے
پڑھے ہوئے، یوں سمجھیے دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔
وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول میں مدرس تھے۔
میں انھیں کے ہاں اترا۔ دو تین دن بعد ایک صبح وہ
مجھ سے کہنے لگے: تمھیں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق
ہے، کسی دن فرصت ملے تو لال کنویں میں ایک بوڑھے
نواب صاحب رہتے ہیں سراج الدین خاں نام ہے،
ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا، کون نواب سراج
الدین احمد خاں! وہی تو نہیں، جو سائل تخلص کرتے

ہیں ؟ کہاہاں، وہی، 'دیوانہ راہوے بس است'! اگلے
دن اتوار تھا میں نے ناشتے کے بعد لال کنویں کی راہ لی

بوقت صبح چو مردم بکار و بار روند
بلا کشانِ محبت بکوے یار روند

جگت سنگھ کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک علم نہیں تھا،
وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ کہیں لال کنویں کے محلے
میں رہتے ہیں. البتہ مجھے معلوم تھا کہ ان کا لوہارو خاندان
سے تعلق ہے. اس لیے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی
معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش
نہیں آسکتی. چنانچہ میں پوچھتا پاچھتا گلی قاسم جان میں
جا پہنچا، جہاں اس خاندان کے مکانات تھے یہاں میں
نے ایک آدمی سے پوچھا کہ میں نواب میرزا سراج الدین
احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں. میں اس وقت
نواب ضمیر الدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا (خلف نواب
علاء الدین احمد خاں علائی) کے مکان کے سامنے تھا اس
شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمائیے. میں
نے مڑ کر دیکھا تو میرے سامنے ضمیر مرزا کا ملازم کھڑا تھا
میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا اس نے کہا جناب وہ
اس گلی میں نہیں رہتے' ان کا مکان لال دروازے میں
ہے. مجھے شبہہ ہوا کہ شاید اسے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی
ہے اس لیے میں نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب
سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں
جی ہاں میں سمجھ گیا، وہی نا، جو شاعر ہیں اور جن کے

گھر ہیں باہر کی بیگم ہیں وہ لال دروازے میں رہتے ہیں آیئے میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں" چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کر لال کنویں میں آ گئے۔

لال دروازہ کچھ دور تو ہے نہیں، یہی چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے وہ سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا "لیجئے حضور، یہ ہے نواب صاحب کا مکان" اس کے بعد اس نے ملازم کو آواز دی۔ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا "آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں اور مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری یقیناً ملازم کے لیے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا، جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا: مکان لاڈلی بیگم۔ اسے دیکھ کر مجھے معاً "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" والا لطیفہ یاد آ گیا۔

الٹے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا جس میں داخل ہونے کے لیے دو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں اچھا

خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے یعنی
کمرے میں دری کا فرش تھا، اس کے اوپر نصف
کمرے کے لگ بھگ سفید براق چاندنی بچھی تھی صدر
میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے
گاؤ تکیے لگے رکھے تھے نشست کے قریب چاندی کا
پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سگریٹ
کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں۔ اور جہاں
چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی
تپائی رکھی تھی"۔

یہ وہ تفصیلات ہیں، جو سائل مرحوم کے بارے میں کہیں اور نہیں مل سکیں کیسے فنکارانہ انداز میں سائل صاحب کے گھر کے باہر اور گھر کے اندر کا ماحول اور سائل صاحب کی پوری شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔

مالک رام صاحب نے ان خاکوں میں بہت سے دلچسپ ادبی واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہیں کہیں شوخی سے بھی کام لیا ہے۔ مالک رام صاحب نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے پاس بیٹھے ہیں۔ مولانا شبلی کی ادبی خدمات پر گفتگو ہو رہی ہے مالک رام صاحب کو اچانک عطیہ فیضی یاد آجاتی ہیں اب یہ واقعہ انہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

"شعر العجم اور شبلی سے مجھے شبلی اور عطیہ بیگم کا قصہ یاد
آگیا۔ اب مجھے شرارت اور تحقیق کی سوجھی جن اصحاب
نے حیات شبلی" پڑھی ہے، انھیں معلوم ہے کہ مولانا
سید سلیمان نے اس سے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا"
حالانکہ یہ ایسی بات نہیں، جسے یوں نظر انداز کیا جا
سکتا ہے۔ اگر اس میں کچھ اصلیت ہے، تو اس کا برملا
اعتراف کر لینا چاہئے تھا کیونکہ اس سے مولانا شبلی کی

عظمت اور وقار میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی! اور اگر غلط ہے تو پھر اس کی مدلّل تردید کی ضرورت تھی کیونکہ اگر آج یہ مسئلہ صاف نہ ہوا، تو پھر قیامت تک نہیں ہونے کا۔ اس وقت مولانا شبلی کے تلامذہ اور احباب اور تربیت یافتہ اصحاب ہمارے درمیان موجود ہیں، جو اس موضوع پر ذمّہ دارانہ اور واقف کارانہ انداز میں لکھ سکتے ہیں۔ بعد کے آنے والے تو بہر حال انھیں کے خوشہ چین ہوں گے۔

ان ہی رعایتوں کے خیال سے میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ نے 'حیات شبلی' میں کوئی فروگذاشت محسوس نہیں کی۔ پوچھا، کیوں آپ کا اشارہ کس طرف ہے؟ میں نے کہا یہی عطیہ بیگم والے قصے پر بھی کچھ لکھنے کی ضرورت تھی۔ ہاں' ہوں' کر کے رہ گئے، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس سے متعلق گفتگو کرنے پر تیار نہیں۔ ادھر میں محض "خطائے بزرگان گرفتن خطاست" پر عمل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ جرات رندانہ سے کام لیتے ہوئے، میں نے پھر کہا: مکاتیب شبلی میں آپ نے مولانا کے خط مہدی افادی کے نام تو ضرور پڑھے ہوں گے؟ جواب اثبات میں دیا۔ پھر، پوچھا کہ کیا آپ نے مہدی افادی کے خطوط کا مجموعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا: ہاں ایک زمانہ ہوا دیکھا تھا۔ میں نے کہا آپ نے کتاب خطوطِ شبلی ضرور دیکھی ہوگی (جس میں شبلی کے وہ خطوط ہیں، جو انھوں نے عطیہ بیگم اور ان کی بہن کے نام لکھے تھے) فرمایا۔ ہاں،

یہ بھی بہت مدّت ہوئی دیکھی تھی۔ اب میں نے اتنی تمہیدوں کے بعد سوال کیا کہ مہدی نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صاف لکھا ہے کہ مولانا شبلی کا مجھ سے پردہ نہیں تھا۔ آخر یہ کس بات کی پردہ داری تھی؟ کہنے لگے: مجھے یہ کتاب دیکھے اتنا زمانہ ہو گیا ہے کہ اب ٹھیک طور پر کچھ یاد نہیں۔ میں نے کہا، اچھا یہی سہی۔ لیکن آپ اصحاب کی یہ کامل خموشی بھی تو شک پیدا کرنے والی ہے۔ آخر آپ لوگ کھل کے کیوں کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے لگے: فائدہ؟" فائدہ یہ کہ اس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا کل کے مورخ کے لیے روشنی مہیا ہو جائے گی اور اس کے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی" انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب میں نے گستاخانہ جسارت سے کام لیتے ہوئے ایک اور حربہ استعمال کیا میں نے کہا قرآن کہتا ہے: "لاتکتموا الشھادۃ" اگر کسی سلسلے میں تمھیں کچھ بات معلوم ہو، تو اس کے اظہار سے دریغ نہ کرو اور اسے مت چھپاؤ اور آپ حضرات ہیں کہ سب کچھ جانتے ہوئے خاموش ہیں اور پوچھنے پر بھی نہیں بتاتے لیکن صاحب یہ وار بھی خالی گیا۔ وہ ہنس کے ٹال گئے، اتنے میں ہم علی گڑھ پہنچ گئے"

خاکہ نگار جب کسی شخصیت کا خاکہ لکھتا ہے تو خود خاکہ نگار کی شخصیت بھی خاکے میں جھلکنے لگتی ہے وہ شخصیت کے صرف ان پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے، جو اس کی نظر میں مستحسن ہوتے ہیں۔ مالک رام صاحب کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی دوست یا آشنا کوئی درخواست

کرے تو وہ انکار نہیں کرتے بعض اوقات اس رواداری کی قیمت انھیں اپنی صحت سے دینی پڑتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کہ کسی دوست کے کہنے پر جلسے میں چلے گئے۔ تین چار گھنٹے جلسے میں رہے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کئی دن تک صاحب فراش رہے مالک رام صاحب کے مخلص دوست اور گھر والے اُن کی اس عادت سے عاجز ہیں لیکن مالک رام صاحب اور ان کے مخلص دوست اور گھر والے سب مجبور ہیں۔ مالک رام صاحب نے جگر صاحب کی زندگی کا ایک واقعہ لکھا ہے :

"اس طرح کسی کی دل شکنی بھی اُن (جگر صاحب) سے محال تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ ایک دن خاصی رات گئے ان کی ڈاڑھ میں سخت درد ہونے لگا۔ اس وقت جو چھوٹا موٹا گھریلو علاج ممکن تھا، کیا گیا، لیکن اس سے کوئی افاقہ نہیں ہو۔ رات انھوں نے بہت بے چینی سے کاٹی اگلی صبح ان کی جو شامت آئی، مختصر سا ناشتہ کر کے اکیلے طبیہ کالج چلے گئے کہ وہاں کسی حکیم صاحب سے دکھا کے دوا لے آئیں وہاں جو پہنچے تو لڑکوں نے پہچان لیا۔ اب کیا تھا، وہ انھیں گھیر گھار کے کالج کے ہال میں لے گئے اور دو گھنٹے تک اُن سے کلام سنتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاج تو خیر کیا ہوتا جب یہ وہاں سے لوٹے ہیں تو ان کی مظلوم صورت دیکھنے کے قابل تھی۔ نہ صرف دانت کا درد بدستور موجود تھا بلکہ دردِ سر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ گئے تھے روزے بخشوانے، نماز گلے پڑی میں نے پوچھا کہ آخر آپ نے یہ کیوں کیا، انکار کر دیا ہوتا تو رونی صورت بنا کر کہنے لگے۔ بھائی! میں کیا کرتا وہ طالب علم اتنی محبت سے اصرار کر رہے تھے کہ مجھ

میں انکار کی ہمت نہ رہی ۔"

مالک رام صاحب ۲۲ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ماشاءاللہ اسّی سال کے ہو چکے ہیں لیکن ان کے علمی مشاغل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں کی بھی مدد کرتے ہیں۔ انھوں نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے علمی مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"وہ جہاں بھی رہے ان کا درِ فیض ہر ایک کے لیے کھلا رہا۔ شاگرد کلام پر اصلاح لینے کو آتے، کوئی طالب علم مقالہ یا کتاب لکھنا چاہتا تو اس کے لیے مسالہ جمع کرتے۔ کوئی مشورہ کرنے کو آجاتا۔ کسی کو روزمرّے یا محاورے میں شبہہ ہوا تو وہ اس کی تحقیق کے لیے رجوع کرتا مصنف اور شاعر حضرات اپنی تصنیفات پر مقدمے اور دیباچے لکھوا کر لے جاتے۔ غرض کہ کوئی اس دروازے سے محروم اور خالی ہاتھ نہ جاتا ۔"

اس اقتباس میں کہا گیا ہے کہ "کیفی صاحب اپنے شاگردوں کے کلام پر اصلاح کرتے تھے۔ اس بیان کو نظر انداز کر دیجئے، باقی اقتباس کے لفظ لفظ کا اطلاق خود مالک رام صاحب پر ہوتا ہے

مالک رام صاحب بنیادی طور پر محقّق ہیں اور خاکہ نگاری کا فن تخلیق سے قریب ہے انھوں نے تخلیق اور تحقیق کے امتزاج سے خاکہ نگاری میں ایک نیا رنگ پیدا کیا ہے۔ غالب کے خاکے کی بنیاد ہی تحقیق پر ہے وہ خاکہ محقق اور ماہر غالب ہی لکھ سکتا تھا۔ دیکھئے غالب کے خاکے میں دیوانِ ذوق کی ترتیب اور طباعت کے بارے میں کیسی دادِ تحقیق دی ہے۔

"جن اصحاب نے ذوق کا تذکرہ پڑھا ہے، ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویران کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویران، ذوق کے شاگرد تھے شاگرد ہی نہیں، عاشق تھے، کیا مجال جو ان کی موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے۔ زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں

پچوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصف مزاج ہے اگر کہیں ایک طرف سے کمی رہ جاتی ہے، تو اس کی کسر کہیں اور سے پورا کردیتی ہے، یہاں بھی یہی ہوا۔ ویران نابینا تھے، مگر بلا کے ذہین، اور حافظے کا کیا کہنا۔ قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوک زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انھوں نے تڑسے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔

ذوقؔ ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کرسکے تھے اُن کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہوگیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے۔ بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوقؔ کا کلام بھی ضائع ہوگیا۔ جو بچا کھچا تھا اسے مولانا آزادؔ لے کر نکل بھاگے ذوقؔ کے شاگردوں کو قدرتی طور پر فکر ہوئی کہ اگر کلام جلد شائع نہ ہوا تو کل کو کوئی بھی استاد کا نام لینے والا نہیں ملے گا۔ ظہیرؔ اور انورؔ دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویرانؔ کے پاس پہنچے کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ اُن ہی کو یاد تھا چنانچہ وہ بولتے گئے اور ظہیرؔ اور انورؔ لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۸۶۰ء میں دیوانِ ذوقؔ کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا

آزاد نے بہت کچھ کتر بیونت کر کے بلکہ اپنی طرف سے اضافے کر کے ایک اور دیوان شائع کیا، جواب متداول ہے۔“

ان خاکوں میں مالک رام صاحب کے سوانح نگاروں کے لیے بھی بہت مواد ہے مالک رام صاحب خاکساری اور انکساری سے کام لیتے ہوئے خود اپنے بارے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ اگر کچھ معلومات فراہم کرتے بھی ہیں تو بہت مختصر الفاظ میں۔ تمام خاکوں میں صرف ایک بار اپنے بارے میں تھوڑی تفصیل کے ساتھ بات کی ہے اور وہ ہے اپنی کتاب تصنیف ”عورت اور اسلامی تعلیم“ کے بارے میں۔ سید سلیمان ندوی کے خاکے میں لکھتے ہیں:

”اس کے کچھ دن بعد میں نے ”عورت اور اسلامی تعلیم“ لکھی۔ میں نے شاید کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ میری ابتدائی تعلیم سراسر اردو اور فارسی پر مشتمل تھی۔ ہائی اسکول کے بعد مجھے نگار کے مطالعے سے قرآن اور اسلام سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس پر میں نے ایک مولوی صاحب سے قرآن پڑھنا شروع کیا۔ افسوس کہ اسے میں ان کے ساتھ مکمل نہ کر سکا۔ نصف سے زیادہ پڑھ چکا تھا کہ یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن میری طبیعت نے کام ادھورا چھوڑ دینا گوارا نہ کیا۔ اس کے بعد ذاتی محنت سے میں نے اسے مکمل کر لیا۔ اب میدان وسیع ہو گیا اور عربی کی شُدبُد ہو جانے سے قرآن کی تفسیر دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر اس سے گزر کر حدیث کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا اور حتی الوسع میں نے حدیث کی بیشتر کتابیں بھی دیکھ ڈالیں۔ ان میں زیادہ توجہ ”صحاحِ ستہ“ پر رہی کہ یہی چھ مجموعے زیادہ معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔

تو خیر، میں کم و بیش روزانہ قرآن کا کچھ حصّہ ترجمے اور تفسیر کے ساتھ تلاوت کیا کرتا تھا۔ میں نے دورانِ مطالعہ میں دیکھا کہ عورتوں سے متعلق احکام منتشر حالت میں پڑے ہیں۔ خیال آیا کہ اگر انھیں یکجا کر دیا جائے، تو ان پر ایک اچھا خاصا مضمون قلمبند ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ شروع میں میرا ۲۰۔ ۲۵ صفحے سے زیادہ مضمون کا خیال نہیں تھا۔ لیکن لکھنے بیٹھا تو اتنا مواد جمع ہو گیا اور ایسے ایسے گوشے سامنے آئے کہ اسے ایک مضمون میں محدود کر لینا ممکن نہ رہا۔ اس پر میں نے پانچ ابواب میں یہ کتاب لکھ ڈالی۔

"وہ صورتیں الٰہی" میں مالک رام صاحب کے لکھے ہوئے دس خاکے شامل ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ اور خاکے بھی ہوں۔ لیکن ان خاکوں کی فنِ خاکہ نگاری میں وہ اہمیت ہے۔ جو مزاح نگاری میں پطرس کے آٹھ دس مضامین کی ہے۔ تعداد میں اتنے کم ہیں لیکن مزاح نگاری کی تاریخ لکھتے ہوئے ان مضامین کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مالک رام صاحب کے خاکے اردو خاکوں میں نہ صرف اہم ترین اضافہ ہیں بلکہ فنِ خاکہ نگاری کو ایک نئی سمت سے بھی آشنا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

مالک رام اور اسلامیات

مشہور محقق اور ماہر غالبیات، جناب مالک رام نے اسلامیات کا بھی بہت اچھا مطالعہ کیا ہے، جس کا اظہار ان کی دو کتابوں "عورت اور اسلامی تعلیم" اور "اسلامیات" میں ہوا ہے۔ اس مطالعے کا ایک جائزہ لینے کے لیے ہم سب سے پہلے دوسری کتاب پر ایک نظر ڈالیں گے، اس لیے کہ اس میں حسبِ ذیل اصولی موضوعات پر بحث کی گئی ہے:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہ

الاسلام

اسلامی خلافت

پہلا مضمون اسلام کے بنیادی کلمے کی ایک عمدہ تشریح ہے، جس میں اختصار کے ساتھ توحید و رسالت کے ارکانِ ایمان کی اہمیت واضح کی گئی ہے، گرچہ زیادہ زور توحید پر دیا گیا ہے اور رسالت کے اقرار کو بھی گویا توحید ہی کی ایک توسیع قرار دیا گیا ہے:

"جب کوئی آدمی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہ
کہتا ہے، تو وہ اس بات کا اشتہار دے رہا ہے کہ
میں آج سے خدا کے سوائے کسی اور کو معبود سمجھوں گا نہ
اس کی عبادت کروں گا، یہاں تک کہ محمدؐ کی بھی نہیں کیونکہ

وہ بھی صرف اس کے رسول ہیں، معبود نہیں۔"

(اسلامیات ص ۲۱)

یہ بیان دراصل بعض لوگوں کے اس اعتراض پر دیا گیا ہے کہ بہ ظاہر کلمۂ اسلام میں اللہ کے ساتھ محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو شامل کر کے گویا توحیدِ خالص میں ایک آمیزش کر دی گئی ہے۔ اس الزام کے جواب میں جناب مالک رام نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، مگر جس انداز سے انہوں نے اظہارِ خیال کیا ہے وہ رسالت کی پوری حقیقت واضح کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اوّل تو اس اظہارِ خیال میں ایک دفاعی اور عذر خواہانہ انداز اختیار کیا گیا ہے، جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، دوسرے اثبات کو نفی کے مفہوم میں پیش کر کے اصل نکتے کی اہمیت کم کر دی گئی ہے۔ اسلام کے کلمۂ ایمان کی متعدد عبارتیں خود شریعت کی تجویز کردہ ہیں جن سے کلمۂ طیبہ کی وضاحت بہ آسانی ہو جاتی ہے اور اس سلسلے میں کسی پر تکلف بحث کی حاجت نہیں رہ جاتی۔ مثال کے طور پر پنج وقتہ نمازوں میں ہر مسلمان تشہّد کے قعدے میں کلمۂ شہادت اس طرح ادا کرتا ہے:

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

اس اعلان میں رسالت کی شہادت اس طریقے سے دی گئی ہے کہ پہلے رسول اللہ کے بندۂ خدا ہونے کا اقرار کر کے توحید کے متعلق ہر اشتباہ کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، اس کے بعد رسالت کا اظہار کیا گیا ہے۔ لہٰذا ایک بندۂ خدا کے خدائی میں شریک ہونے کا کوئی سوال نہیں اٹھتا، صرف اس کے منصب رسالت کی عظمت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ ہے کہ بجائے خود لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰهِ کے کلمۂ توحید ہی میں جس ترتیب سے (رسالت کا اقرار کیا گیا ہے وہی یہ بتانے کے لیے بالکل کافی ہے کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم صرف اس خدا کے پیغمبر ہیں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ یہ نکتہ کلمے کے پہلے جُز کے تجزیے سے بھی عیاں ہو سکتا ہے۔ جب کہا جاتا ہے کہ "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں" تو ہر انسان یا ہر شے کے معبود ہونے کی یکسر نفی ہو گئی، اب اگر اس کے بعد کسی انسان کی رسالت کا اثبات کیا جاتا ہے تو اس سے توحید میں آمیزش کیسے ہو گئی؟ مسلمان حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری رسول سمجھتے ہیں، جب کہ ان کی بعثت سے قبل ہر ملک اور ہر دور میں بھیجے جانے

والے اللہ کے تمام رسولوں پر اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ اس طرح ختم رسالت بجائے خود وحدت انسانی کے اس تخیل کا نشان بن جاتا ہے جو اسلامی توحید میں مضمر ہے۔ لہذا رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو عبد تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کی رسالت کی جلالتِ شان کا احساس ہر مسلمان کے دل میں پیدا ہونا چاہیئے، جو محض ان کی الوہیت کی نفی سے نہیں ہوسکتا، جب تک اس کے ساتھ ہی ان کی رسالت کا مثبت اقرار بھی اس کے تمام مضمرات کے ساتھ نہ ہو۔

زیرنظر مضمون میں حسب ذیل آیت کا ترجمہ محلِّ نظر ہے :

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳ : ۱۹)

(ہم تک پہنچنے کا راستہ اسلام ہے) (ص ۱۶ اسلامیات)

اس ترجمے سے اصلی مفہوم واضح نہیں ہوتا جو یہ ہے کہ "اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے" یہ آیت کا لفظی ترجمہ بھی بالکل صحیح طور پر ہے اور اس کا حقیقی و مکمل مفہوم بھی اس ترجمے سے ادا ہوتا ہے۔ اس نکتے کا ثبوت سیاق و سباق کی ایک دوسری آیت " ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ " (۳ : ۸۵) سے بھی ملتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ " اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا" یہ بات پہلی آیت کے ہی باقی حصے سے بھی واضح ہے جو یہ ہے: "اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا" یہی وجہ ہے کہ خود جناب مالک رام نے اپنے دوسرے ہی مضمون "اسلام" میں زیرنظر کتاب کے صفحہ ۲۵ پر مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ درج کردیا ہے، جو یہ ہے: "بے شک، دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔"

اس دوسرے مضمون میں مختصر طور پر بطور ایک اصطلاح کے لفظ اسلام کی اچھی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی سوالات کے جوابات بھی خوش اسلوبی سے دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر دیگر مذاہب میں عیسائیت نے خدا کا تصور باپ کی حیثیت سے قائم کیا ہے اور ہندو دھرم میں باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا تصور بھی خدا کے متعلق پایا جاتا ہے، مگر اسلام

نے ان بشری رشتوں سے تصورِ الٰہ کی تنزیہہ کرکے خدا کے لیے ایک نہایت جامع لفظ "رب" کا استعمال کیا ہے۔ اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے جناب مالک رام یہ فکرانگیز بیان دیتے ہیں:

"اگر تدبّر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ "رب"
کے تصور میں "اَب" اور "اُم" دونوں سے کہیں زیادہ
وسعت اور گہرائی ہے۔" (ص ۲۲ اسلامیات)

اس موضوع پر "بعثت انبیاء" اور "اہل کتاب" کے اہم نکات کی تشریح کرکے جناب مالک رام نے واضح کیا ہے کہ اسلامی تصوّر توحید وحدت انسانی کا سب سے بڑا پیغام ہے، جو ایک خدا اور ایک انسان کے تخیل کے تحت پوری انسانیت کو خدا پرستی کے محاذ پر متحد کرنا چاہتا ہے، اس لیے مسلم کا مطلب صرف خدا کا فرمان بردار ہے جو ہر دور میں خدا پرستوں کا لقب رہا ہے۔ لہذا وہ "اصول اسلام" کی صراحت کرتے ہوئے عالمی سطح پر انسانی یک جہتی کے حسب ذیل مسلمات پیش کرتے ہیں:

"(۱) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کی جائے۔
(۲) کسی اور ہستی کو اللہ تعالیٰ کی ساتھ شریک قرار نہ دیا جائے۔
(۳) ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ ایسا برتاؤ
نہ کرے، گویا خدا کو چھوڑ کر وہ اسے اپنا پروردگار سمجھ
رہا ہے۔" (ص ۳۴ اسلامیات)

ان اصولوں کی بنیاد پر جناب مالک رام مضمون کے آخر میں یہ بصیرت افروز سوال اٹھاتے ہیں:

"کیا دنیا کی خدا پرست قوموں میں آج اس اصول پر
کوئی سمجھوتا نہیں ہوسکتا"؟ (ایضاً)

اگر اقوام متحدہ میں شریک ممالک قومی مفاد پرستی اور جنگ بازی کی نفرت پردازیاں چھوڑ کر اس سوال پر غور کرنے کی زحمت گوارا کریں اور سنجیدگی واخلاص کے ساتھ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں تو عام انسانی اخوت ومساوات کا وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے جو تاریخ میں پہلی بار اسلام ہی نے

دیکھا تھا اور اپنے دورِ عروج میں اس کی وہ تعبیر بھی نکالی تھی جو عصرِ حاضر کی بین الاقوامیت کی شکل میں آج ہمارے سامنے ہے۔

مذکورہ مضمون میں حسب ذیل آیت کا ترجمہ صحیح نہیں:

مِلّۃ ابیکم ابراھیم ھُوا سمّاکم المسلمین (۲۲: ۷۸)

(اور دین تمہارے باپ ابراہیم کا، انہیں نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے) (ص ۲۵ اسلامیات)

اس آیت میں "ہو" کی ضمیر خدا کی طرف راجع ہے، حضرت ابراہیم کی طرف نہیں۔ اس سلسلے میں نقلی دلیلوں کے علاوہ صریحًا عقلی استدلال یہ ہے کہ خدا پرستوں کے لیے مسلم کا نام حضرت ابراہیم سے بہت قبل، تخلیق آدم کے وقت سے ہی چلا آرہا ہے، صرف مسلمانوں کو ملتِ ابراہیمی کا رکن قرار دینے سے لفظ مسلم کی اس قدامت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضرت ابراہیم خود بھی اللہ ہی کے بنائے ہوئے مسلم تھے، جیسا سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۸ سے بھی واضح ہے، جس کا حوالہ جناب مالک رام نے دیا ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں کتاب کے صفحہ ۲۹ پر مصنف نے زیر بحث آیت کا صحیح ترجمہ درج کیا ہے، جو اس طرح ہے:

"اس (خدا) نے تمہیں پہلے بھی مسلمان کا نام دیا اور اب اس میں بھی"۔ یہاں آیت کا بقیہ حصہ بھی دے دیا گیا ہے، جو یوں ہے:

"ھو سماکم المسلمین من قبل و فی ھٰذا"

تیسرا مضمون "اسلامی خلافت" ہے۔ اس میں اسلام کے جمہوری اصول "شوریٰ" کی تشریح کر کے خلفائے راشدین کے تقرر کے مختلف طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد "خلیفہ کی صفات" بتائی گئی ہیں۔ پھر "اسلامی خلافت کے اصول" پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ اصول مصنّف کی تجویز کے مطابق تعداد میں گیارہ ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے تصور خلافت میں کچھ نکتے موجودہ جمہوریت کے قواعد و ضوابط کے مشابہ ہیں اور کچھ ان سے مختلف۔ مثال کے طور پر شورائیت کا عنصر جس کے مطابق مسلمانوں کے معاملات باہمی شورے سے طے ہوتے ہیں جمہوری ہے مگر جمہوریت

کے برخلاف، خلافت کے لیے کوئی انتخابی ادارہ مقرر نہیں کیا گیا ہے، نہ قانون سازی اور انتظامی امور میں کثرت رائے کی پابندی پر زور دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں قانون سازی کا معاملہ تو واضح ہے، اس لیے کہ اس کا اختیار عوامی نمایندوں کے بجائے خدا اور رسول کے لیے محفوظ ہے اور شریعت کا مطلب ہی قانون الٰہی ہے۔ یہ تشریع کا سوال ہے اور شارع اللہ کی وحی کے تحت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ البتہ جن مسائل کی وضاحت شریعت میں موجود نہیں ان کے متعلق کتاب و سنّت کی عام بنیادی ہدایات کی روشنی میں قیاس و اجتہاد ہو سکتا ہے اور اس پر اجماع بھی کیا جا سکتا ہے، گرچہ یہ امر بحث طلب ہے کہ اجماع انفرادی طور پر علمائے دین کے اجتہاد کے مطابق ہوگا یا علما و دیگر ماہرین قانون مل کر کسی اجتماعی ادارے مثلاً اسمبلی یا پارلیامنٹ کی نمائندگی کی شکل میں کوئی اجتہاد کر سکتے ہیں جس پر اتفاق رائے کا نام اجماع ہوگا، اگر پوری ملت اسے تسلیم کرلے۔ تشریع کی یہ تصریح جناب مالک رام نے نہیں کی ہے، لیکن انہوں نے مضمون کے آخر میں جو سوال اٹھایا ہے اس کے پیش نظر راقم السطور نے کچھ وضاحتی اشارات دے دیے ہیں۔ سوال یہ ہے:

"ان اصولوں کا موجودہ دور کی جمہوریت سے مقابلہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ کیا ان معنوں میں اسلام میں جمہوریت ہے یا نہیں!"

مصنّف کا جملہ استفہامیہ نہیں استعجابیہ نشان پر ختم ہوتا ہے، جس کا مطلب ایک قسم کا چیلنج بھی ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے جو آج اسلام میں جمہوریت کا ثبوت کسی نہ کسی طرح مہیا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جناب مالک رام کا فقرہ "موجودہ دور کی جمہوریت" اس سلسلے میں گرہ کشا ہو سکتا ہے اور صاف کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں وہ مغربی جمہوریت نہیں ہے جو موجودہ دور میں رائج ہو چکی ہے۔ اسلامی خلافت نہ تو آج کے انتخابی ہنگاموں کی روادار ہے، نہ ہر مسئلے پر اس عوامی شور و غوغا کی جس کا محرک بالعموم گروہ بندی و مفاد پر مبنی ہوتی ہے۔ اوّل تو اسلامی خلافت میں کوئی شخص اپنے انتخاب کا امیدوار اور اپنی برتری کا دعویدار نہیں ہوتا، دوسرے جو شخص اپنی صلاحیت و دیانت اور خدمت و ایثار کی بنا پر اجتماعی رضامندی سے ایک بار خلیفہ

یا امیر مقرر ہو جاتا ہے وہ حدود شریعت کے اندر پوری طرح بااختیار ہوتا ہے اور استقلال و استحکام کے ساتھ دین کے فروغ اور معاشرے کی فلاح و ترقی کے لیے کام کر سکتا ہے۔

کتاب کا آخری اور سب سے معرکتہ الآرا مضمون "عورت مذاہب عالم میں" ہے۔ یہ جناب مالک رام کی پہلی کتاب "اسلامیات" "عورت اور اسلامی تعلیم" کا نہ صرف خلاصہ بلکہ اس میں ایک اضافہ بھی ہے، اس لیے کہ عورت کے متعلق اسلامی تعلیم کا موازنہ دوسرے مذاہب، مثلاً عیسائیت یہودیت اور ہندو دھرم کی تعلیمات یا روایات سے کرکے دکھایا گیا ہے کہ بہترین نقطۂ نظر اسلام ہی کا ہے۔ اس موضوع پر بحث ہم مذکورہ کتاب کے سلسلے میں کریں گے۔ ابھی مضمون کے بعض مقامات کے اشکالات کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ حسب ذیل آیتہ کا ترجمہ محل نظر ہے:

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا (۲:۱۰۶)

(ہم کوئی شریعت یا وحی منسوخ نہیں کرتے یا لوگوں کے
دل سے اسے فراموش یا محو نہیں ہونے دیتے جب تک اس
سے بہتر یا کم از کم اس جیسی دوسری شریعت اس کی
جگہ نہیں لے آتے) (ص ۱۳۱ اسلامیات)

یہاں آیتہ کے لفظ کا ترجمہ وحی کے مترادف کے ساتھ شریعت کہا گیا ہے، حالانکہ آیتہ کا مفہوم صرف آیتہ ہوتا ہے، شریعت نہیں اور قرآن اس موقعے پر تنسیخ شریعت نہیں، صرف تبدیل آیت کی بات کر رہا ہے۔ لہٰذا جو بات جہاں پر ہے اور جس حد تک ہے اس کو وہیں اور اس حد میں رکھنا چاہیے، ورنہ کچھ بحثیں بے محل چھڑ جائیں گی فی الواقع تنسیخ شریعت کی بحث بہت نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس میں طوالت بھی ہے۔ اپنے دوسرے مضمون "اسلام" میں جناب مالک رام نے اس موضوع کی طرف کچھ اشارہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"دراصل تغیر و تبدیل اور ارتقا کا عمل شریعت اور
قانون میں ہوا ہے۔ جتنی الہامی کتابیں اس وقت
ملتی ہیں ان سب میں اعتقاد اور اخلاق کا حصّہ کم و

بیش یکساں ہے۔ صرف اجمال اور تفصیل کا تفاوت
ہے لیکن شریعت اور قانون کا حصہ خاصا مختلف ہے"
(ص ۲۷ اسلامیات)

اس بیان میں جناب مالک رام شریعت اور قانون کو ایک دوسرے کا ہم معنی سمجھتے ہیں اور انہیں اعتقادات واخلاق سے ممیز کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت اس سلسلے میں جو علمی بحثیں کی گئی ہیں وہ اخلاق وقانون یا اعتقاد وشریعت کے مقابلے پر مبنی نہیں، بلکہ دین وشریعت کے فرق پر مشتمل ہیں۔ علما کا عام طور پر خیال ہے کہ دین ہمیشہ ایک رہا ہے اور وہ قانونِ قدرت کی طرح اٹل ہے، لیکن شریعتیں وقت اور ماحول کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں، مثلاً شریعتِ موسوی اور شریعت محمدیؐ کے درمیان کچھ فرق ہے، گرچہ دونوں کا منبع ایک ہے، دین اسلام۔ لیکن اس امتیاز کا یہ مطلب نہیں کہ شریعت محمدیؐ اور شریعت موسوی میں کوئی مماثلت نہیں تورات کے احکامِ عشرہ قرآن میں بھی موجود ہیں۔ البتہ قرآن یہ وضاحت کرتا ہے کہ یہودیوں نے اپنی روایات وخرافات میں اللہ کے اس کلام کو مسخ کردیا جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوا تھا، جب کہ قرآن خدا کے خالص کلام اور پیغام کو پیش کرکے حقایق کے رُخ سے وہ پردہ اٹھا رہا ہے جو یہودی مشایخ نے اس پر ڈال رکھے تھے۔ اس لیے قرآن کا موقف یہ ہے کہ وہ پچھلے تمام پیغمبروں پر نازل ہونے والی خدا کی تمام کتابوں کی تصدیق کرنے والا اور ان کی تعلیمات پر مشتمل ہے، وہ ان کے احکام کی توضیح بھی کرتا ہے اور تکمیل بھی۔ اس طرح شریعت کی تبدیلیاں صرف بعض امور میں جزوی طور پر ہوتی ہیں۔ پوری کی پوری پچھلی شریعت نہیں، صرف اس کے کچھ حصے بدلے جاتے ہیں۔ یہی مطلب ہے زیر بحث آیتہ میں صرف کسی آیتہ یعنی اس میں مضمر کسی حکم کی تبدیلی کا۔

"یہود کا ایک رواج" کے باب میں جناب مالک رام نے حضرت مریمؑ کی پیدائش کے واقعے پر ان کی ماں سے منسوب ایک شخص "یوسف نجار" کا جو ذکر کیا ہے وہ تحقیق طلب ہے۔ قرآن اس ذکر سے خالی ہے اور اسرائیلیات بداہتہً ناقابل اعتبار ہیں۔ اسی طرح "جاہلیت میں نیوگ" کے عنوان سے ایک مختصر بیان کا یہ جملہ ناقابل فہم ہے: قرآن میں جہاں احسان کے مقابلے میں سافحت

سے منع کیا گیا ہے وہاں یہی عارضی تعلق مراد ہے۔" احسان یقیناً مسافحت سے محفوظ رہنے کا بہترین ذریعہ و طریقہ ہے، مگر یہ ہر قسم کی شہوت رانی کے مقابلے میں ازدواج کے ذریعہ تحفظِ عصمت کی ضمانت دیتا ہے، صرف کسی خاص جاہلانہ عارضی تعلق کی مخالفت تک اس کا اثر محدود نہیں ہے۔ اس تحدید میں غلطی یہ ہے کہ عوام کو تخصیص سے بدل دیا گیا ہے، جس کا کوئی قرینہ واضح نہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

" عورت اور اسلامی تعلیم" جناب مالک رام کی ایک اہم علمی تصنیف اور اپنے موضوع پر ایک گراں قدر کوشش ہے۔ اس میں ایک عمدہ ترتیب سے " بیٹی"، " بیوی"، " ماں" اور " وارِثہ " کی مختلف حیثیتوں سے عورت کے متعلق اسلامی احکام و ہدایات پیش کیے گئے اور اس سلسلے میں قرآن و حدیث سے بہ کثرت استدلال کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے وقت کے ایک نازک مسئلے پر اسلام کی تعلیمات کا وسیع و عمیق مطالعہ کیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ایک صحیح نقطۂ نظر سے مسئلے کا حل دریافت کرنے کی سعی کی ہے۔ اس معاملے میں ان کی سلیم الطبعی اور بصیرت ان ماہرانِ قانون اور صحافیوں کے لیے قابل رشک ہے جو آئے دن بے جانے بوجھے اور بے سوچے سمجھے اپنی ناقص معلومات کا مظاہرہ بڑے طمطراق سے کرتے رہتے ہیں۔ جناب مالک رام نے بہت ہی موزوں طور سے عورت کی ہستی پر غور و فکر سے مجرّد عورت تصوّر کر کے نہیں کیا ہے، جس طرح مغربی اور مغرب زدہ علما و مفکرین عام طور پر کرتے نظر آتے ہیں اور ان کی روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کا اپنا تشخص تو ختم ہو جاتا ہے، مگر آزادی و برابری اور انفرادیت و امتیاز کے نعروں کے شور میں اس کے متعلق مرد کے تصورات بہت ہی غیر فطری طریقے سے اس پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اس نامعقول روش کے برخلاف، جناب مالک رام اسلام کے حوالے سے عورت کی شخصیت کا جائزہ اس کے حقیقی رشتوں کی بنیاد پر لیتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ انسانی سماج میں عورت کا مقام اس کے ذاتی و خاندانی تعلقات سے متعین ہوتا ہے، نہ کہ سماج اور خاندان سے الگ ہو کر کسی خلا یا ذات کے نہاں خانے میں معلق ہو کر۔ اپنے قائم کیے ہوئے عنوانات پر مباحث میں مصنف نے جس باریک بینی کا ثبوت دیا ہے اس کا اندازہ مختلف ابواب کی ذیلی سرخیوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر سب سے

طویل باب "بیوی" کی چھتیس ۳۶ مستقل سرخیوں میں سے صرف چند یہ ہیں :

پہلا مقصدِ نکاح : محبت۔ دوسرا مقصدِ نکاح : بقائے نسل۔ فحش اور زنا۔ لعان۔ تیسرا مقصدِ نکاح : انسدادِ فسق۔ محرماتِ نکاح۔ تعدادِ ازواج۔ ولادت نکاح۔ عورت کے حقوق۔ اعلان نکاح۔ مہر۔ اہلی زندگی۔ نان و نفقہ۔ تربیت اولاد۔ اختلاف کا علاج۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی کی حیثیت سے عورت کی جو حقوق و فرائض مرد کے مقابلے میں اس کے لیے مخصوص ہیں ان پر مصنف نے شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور ایک ایک جز کو لے کر اس کے متعلق اسلام کی تعلیم پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک حکیمانہ، مرتب و منظم اور صریح و واضح اندازِ بحث ہے۔ دوسرا اہم باب عورت بحیثیت "ماں" ہے، جس میں ایک شادی شدہ عورت کے باقی ماندہ مسائل کا تجزیہ اور ان کے حل کی تشریح مندرجہ ذیل سرخیوں کے تحت کی گئی ہے :

طلاق۔ عدّت طلاق۔ عدّت بیوہ۔ حاملہ مطلقہ۔ موضوعہ مطلقہ۔ عدت کے فرائض۔ دو طلاق۔ طلاق کی قسمیں۔ حلالہ۔ طلاق اور مہر۔ خلع۔ خلع پر پابندیاں۔ خلع کا قانون۔

ان مباحث میں بالعموم جناب مالک رام کی طرح صحیح اسلامی تعلیمات مدلّل طریقے سے پیش کرتے ہیں اس کا ایک نمونہ حال فی الحال نفقۂ مطلّقہ پر چلنے والی بحث کے سلسلے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، حالانکہ یہ کتاب سالہا سال قبل ۱۹۵۰ء میں تحریر کی گئی تھی اور اس کی دوسری اشاعت بھی جو بر وقت میرے سامنے ہے ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ باب "ماں" میں "دو طلاق" کے عنوان سے فرماتے ہیں :

" اگر تین طلاقیں مکمل ہو جائیں تو اس کے بعد نہ عورت ہی اس خاوند کے گھر میں رہ سکتی ہے اور نہ طلاق دینے والے خاوند پر اس کا نفقہ ہی واجب ہے کیونکہ

> پہلی دو طلاقوں کی صورت میں جب خاوند کو حکم دیا تھا
> کہ "عورت کو گھر سے نہ نکالو اور اس کے نان نفقے کا انتظام
> کرو" تو اس سے مقصود یہ تھا کہ ممکن ہے۔ عدّت کے
> دوران میں، ان دونوں میں مفاہمت ہو جائے اور وہ
> رجوع کرلیں۔ لیکن چونکہ تیسری دفعہ طلاق دے دینے
> کی صورت میں وہ رجوع کر ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کوئی
> وجہ نہیں کہ اب عورت کو پہلے شوہر کے گھر میں بند رکھا
> جائے۔" (ص ۱۶۲)

اسلام میں پردے کے موضوع پر بھی جناب مالک رام نے ایسا ہی بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ باب "بیٹی" میں "بیرون خانہ زندگی اور پردہ" کے زیر عنوان وہ کہتے ہیں:

> "ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ شارع علیہ السلام
> نے منہ کا پوشیدہ کرنا پردے کے حکم میں شامل قرار دیا
> ہے۔ لیکن اس سے پہلے جو عام حکم "الاّ ما ظہر منہا"
> دیا جا چکا ہے وہ یہاں بھی نافذ ہوگا یعنی عورتیں اپنی
> آرائش کو ظاہر نہ کرتی ہوئی عام طور پر چہرہ پوشیدہ
> رکھیں گی۔ ہاں اگر اس کے باوجود ضرورت سے منہ یا ہاتھ
> وغیرہ کھولنا پڑیں، یا وہ اضطراراً ننگے ہو جائیں، تو
> اس میں مضایقہ نہیں۔" (ص ۴۲)

زیر نظر کتاب میں بعض افکار ایسے بھی ہیں جو نزاعی قسم کے ہیں اور متعدد علما کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ ان افکار میں مصنف نے زیادہ تر قیاس آرائی سے کام لیا ہے اور قرآن کی بعض آیات کے متن پر وہ کافی غور وفکر نہیں کرسکے ہیں۔ مثال کے طور پر "خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منہا زوجہا۔" (ص ۵۸) پر بحث کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ "اس آیت سے کس طرح یہ معنی نہیں نکلتے کہ حوّا، حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھیں" (ص ۵۸)۔ آیت کا لفظی

ترجمہ یہ ہے جسے خود مصنف نے اختیار کیا ہے: "تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا بھی پیدا کیا۔" سوال یہ ہے کہ یہ "ایک ہی نفس" کون ہے اور کیا "اس سے اس کا جوڑا" کی ضمیر "اس" ایک ہی نفس کی طرف راجع نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نفس آدم کے سوا کوئی اور نہیں۔ تب آدم کے نفس یعنی اس کی ذات سے ہی اس کے جوڑے یعنی حوّا کا پیدا کیا جانا واضح ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ اس کا مطلب فقط حوّا کا آدم کا ہم جنس ہونا ہے نہ کہ اس کے اندر سے پیدا ہونا، تو اس کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں مفاہیم ممکن ہیں اور کسی ایک پر اصرار صحیح نہیں۔ باب "بیوی" میں تعدّد ازواج "کی سرخی کے تحت ایک آیۃ پیش کر کے" ماطاب لکم من النسآء" کا ترجمہ" دوسری عورتوں میں سے اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ یتیم لڑکیوں کی ماؤں سے نکاح نہیں کیا جا سکتا، حالانکہ شان نزول کے اعتبار سے خاص کر انہیں کے ساتھ عقد کا مشورہ دیا گیا ہے تاکہ یتیموں کی مناسب پرورش کا انتظام ہو سکے اگرچہ حکم تمام قابلِ شادی عورتوں کے لیے عام ہے۔

اس باب میں "فحش اور زنا" کے عنوان سے دو آیتیں صفحات ۶۴، ۶۵ پر درج کرنے کے بعد "الآتی" اور "الّذان" کے اسمائے اشارہ کے حوالے سے بحث کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ پہلی صورت عورتوں کے لیے ہے اور دوسری مردوں کے لیے۔ یہ غلط ہے: "الّذی" کا اسم اشارہ قرآن میں بے شمار مواقع پر مرد و عورت دونوں کے لیے عمومی طور سے استعمال کیا گیا ہے اور جب تک کوئی واضح قرینہ آیۃ کے اندر موجود نہ ہو اس اسم اشارہ کا استعمال عام ہونا ہی ہے۔ یہاں بھی یہی بات ہے یہ تثنیہ کا صیغہ ہے اور معاملہ غلط و ناجائز جنسی تعلق کا ہے جس کی سزا بیان کی جا رہی ہے۔ یہ صریحًا زنا کا مسئلہ ہے نہ کہ لواطت کا۔ لہٰذا اس میں فریقین مرد و عورت ہوں گے، نہ کہ دو مرد، جیسا مصنف نے تحریر کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سورۂ نور کے حوالے سے زنا کی سزا پر مصنف کی ساری بحث عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ دوسری حرام کی ہوئی چیزوں، مثلاً شراب و سود، کی طرح زنا کی سزا کا حکم بھی بہ تدریج نازل ہوا۔ یہ حقیقت قرآن کے تحقیقی مطالعے سے واضح ہوتی ہے، جس میں شان نزول اور سیاق و سباق کا علم شامل ہے۔ اس کے علاوہ متعلقہ صحیح احادیث کی واقفیت بھی ضروری ہے، اس لیے کہ رسول صلے اللہ علیہ وسلم محض قاصد نہیں باضابطہ شارع تھے اور قانونِ اسلامی کے سرچشموں میں بنیادی حیثیت اللہ کی کتاب کے

ساتھ رسول اللہ کی سنّت کی بھی ہے۔ اس تناظر میں زنا کے متعلق اسلام کے تعزیری قوانین سے جو کچھ یہ تحقیق معلوم ہوتا ہے۔ وہ جناب مالک رام کے نتائج بحث سے مختلف ہے۔

بہر کیف، مجموعی و عمومی طور پر جناب مالک رام کا مطالعۂ اسلام قابلِ قدر اور بعض خامیوں کے باوجود لایقِ اعتبار ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بڑی کاوشیں کی ہیں اور خلوص وبصیرت کے ساتھ متعدد اہم مسائل وموضوعات پر اسلام کے احکام وتعلیمات واضح کیے ہیں یقیناً یہ ایک علمی کارنامہ ہے اور اس کی تحسین ضروری ہے۔ ادب کے ایک محقق ہونے کے ساتھ ساتھ جناب مالک رام نے دینیات سے جو اعتنا کیا ہے وہ ان کی دانشوری کی دلیل ہے اور اس جہت سے موصوف اُردو ادب کے معدودے چند ان دانشوروں میں ایک ہیں جو بہ یک وقت ادب اور علم دونوں کا ذوق وشعور رکھتے ہیں۔

غالبیات
میں
اوّلیاتِ مالک رام

اس وقت میرے پیشِ نظر "سبد چین" کا وہ خطی نسخہ ہے جو نواب صدر[1] یار جنگ نے اپنے کتاب خانے کے مطبوعہ[2] نسخے سے نقل کروا کر اپنے دستخط کے ساتھ جناب مالک رام کو بطور تحفہ دیا تھا۔ ایک مدت بعد یہی نسخہ جناب مالک رام نے مجھے میرے غالب کلکشن کے لیے عنایت فرمایا۔ نسخے کے سرورق پر تحریر ہے:

کتاب خانہ حبیب گنج کا تحفہ
گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

صدر یار جنگ۔ ۲۲ $\frac{10}{43}$

یہ تحفہ جناب مالک رام کو حاصل ہوا اس کی تفصیل انھیں کی زبانی ملاحظہ کیجیے[3]:

"ہوا یہ کہ ۱۹۳۷ء میں مجھے غالب کی کتاب "سبد چین"
دیکھنے کا شوق پیدا ہوا...... (یہ مجموعہ) مدت سے
نایاب ہو چکا تھا۔ غالب کی بعض اپنی تحریروں اور

۱۔ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی۔

۲۔ "سبد چین"... مصنفہ... غالب، بتاریخ سیزدہم ماہ ربیع الثانی سال یک ہزار و دو صد و ہشتاد و چہارم ہجری.... در مطبع محمدی باہتمام محمد مرزا خاں، واقع دہلی..."، طبع شد

۳۔ "وہ صورتیں الٰہی" (از مالک رام): ۷۴۔۷۵

یادگارِ غالب، میں اس کا ذکر موجود ہے' اور یہیں سے مجھے
اس کا پتا چلا تھا۔ میں نے بعض احباب کی خدمت میں لکھا
.... ہر جگہ سے یہی جواب ملا کہ نہ یہ ہمارے یہاں ہے' نہ
ہم نے اسے دیکھا ہے۔ البتہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم
نے اتنا اضافہ کیا کہ نواب صدر یار جنگ کی خدمت میں لکھ
کے پوچھو.... چنانچہ میں نے ان کی خدمت میں لکھا....
ان کا جواب یہ مژدہ لایا کہ "سبد چین" کا ایک نسخہ میرے
یہاں موجود ہے ......" میں نے ان سے درخواست
کی کہ یہ کتاب مجھے مستعار بھیج دی جائے ... اس پر انھوں
نے فرمایا .... میں یہیں سے اس کی نقل لے کر چند دن
میں بھجوا دوں گا۔ چنانچہ پندرہ بیس دن کے بعد انھوں
نے یہ نقل مجھے بھیج دی ... (لیکن) انھوں نے جو نقل
مجھے بھیجی اس میں بہت غلطیاں تھیں ..... میں نے
جب اس کا اظہار ان سے کیا تو جواب ملا کہ اگرچہ کاتب[۴]
بہت محتاط آدمی ہے لیکن ممکن ہے کہ اس سے غلطیاں
ہو گئی ہوں ...."

اس پر جناب مالک نے خود علی گڑھ جانے کا فیصلہ کیا تاکہ ان غلطیوں کو اصل نسخے کی مدد سے دور کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ علی گڑھ گئے۔ آگے ایک لمبی داستان ہے اس طرح غالب کی زندگی میں شائع شدہ "سبد چین" کے پہلے ایڈیشن (۱۸۶۷ء) کے ۷۱ سال بعد اس کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۳۸) میں شائع ہوا۔

---

[۴] خطی نسخے (نقل مطبوعہ) کے آخر میں یہ عبارت درج ہے: "کاتب الحروف محمد سعید خاں محرر کتابخانہ حبیب گنج، ضلع علی گڑھ مورخہ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۳۷ء"

" سبد چین " میں غالب کا وہ فارسی کلام تھا جو کلیات میں چھپنے سے رہ گیا تھا یا اس کے بعد تخلیق ہوا تھا ان کی وفات کے بعد کلیات کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، مگر یہ کلام ان میں شامل نہ ہوا. مالک رام صاحب نے صرف دوسرا ایڈیشن ہی نہیں چھاپا بلکہ اس میں مرزا کا بہت سا کلام، جو مختلف مقامات پر بکھرا پڑا تھا اسے بھی یکجا کر کے اس ایڈیشن میں شامل کر دیا. ساتھ ہی ترتیبِ کلام کا نقص بھی وضع کر دیا، جس کا پہلے ایڈیشن میں خیال نہیں رکھا گیا تھا۔

اگرچہ یہ کتاب غالب کی زندگی میں ایک بار شائع ہوئی تھی تاہم اب اس حد تک نایاب ہو چکی تھی کہ لوگ اس کے نام سے بھی ناآشنا تھے. اس لیے مالک رام صاحب کی یہ تالیف غالبیات میں اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔

اس وقت جناب مالک رام کی عمر صرف ۳۲ برس کی تھی اس کے بعد غالبیات سے ان کی دلچسپی بڑھی ہے اور اس کے نتیجے میں انھوں نے جو جواہر لگلے ہیں، ان کی کچھ تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے. یہاں صرف وہی باتیں گنوائی گئی ہیں، جو قطعاً ان کی دریافت ہیں۔

۲۔ بزر زد سکۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

گوری شنکر مخبر جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں، جب دلی پر دیسی سپاہ کا قبضہ تھا اور انگریزی فوج شہر سے باہر پہاڑی پر ڈیرے ڈالے پڑی تھی، انگریزوں کا جاسوس تھا اس کے پرچے میں سچی اور سُنی سُنائی ہر طرح کی خبریں ہوتی تھیں. چنانچہ اس نے ۱۹/ جولائی ۱۸۵۷ء کو انگریزی کیمپ میں پرچہ بھیجا اور کہا کہ کل (۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء) کو غالب نے مندرجہ بالا سکہ زر ایک پرچہ پر لکھا، اور حضور میں گزرانا" غالب پر سکے کے اس الزام کا وار" ایسا چلا جیسے کوئی چھرا کوئی گر آب .... بھی گئی اور وہ ریاست کا نام ونشان، خلعت و دربار بھی مٹا." اس کا افسوس اس لیے بھی زیادہ ہوا کیونکہ واقعی یہ سکہ غالب کا کہا ہوا نہیں تھا. انھوں نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے چاروں طرف خطوں کے گھوڑے

دوڑائے۔ دلّی میں بھی جہاں ممکن تھا بات کی مگر کچھ معلوم نہ ہوسکا کہ اس سکّے کا حقیقی مصنّف کون ہے۔ یہ الزام جیتے جی غالب کے دامن سے نہ دُھلنا تھا نہ دھلا حتیٰ کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

آخرکار جناب مالک رام کے ہاتھوں ایک صدی بعد غالب کو سرخروئی حاصل ہوئی۔ وہ قومی دفتر خانہ، ہند، نئی دلّی میں کام کررہے تھے کہ وہاں انھیں صادق الاخبار (دہلی) کا ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ مطابق ۶ جولائی ۱۸۵۷ء کا شمارہ دستیاب ہوگیا۔ اس کے صفحہ اوّل ہی پر یہ عبارت موجود تھی:

اقتباس سکّہؔ نو طبع زاد جناب حافظ صاحب ویران شاگرد رشید استاد ذوقؔ مرحوم

بزر زد سکّۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

ظاہر ہے، گوری شنکر کی خبر قطعاً غلط تھی سکّہ ۱۸ جولائی تو کجا" ۶ جولائی ۱۹۵۷ء سے بھی پہلے کا کہا ہوا تھا۔

سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود حافظ ویرانؔ اور مصنفِ سکّہ اور ذوقؔ کے درجنوں دوسرے شاگرد وہاں دلّی میں موجود تھے مگر کسی نے سچ بولنے کی ہمّت نہ کی۔

۳۔ غالبیات میں اضافے کا ضبط کچھ ایسی شدت اختیار کرگیا کہ بعض لوگوں نے جعل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ رسا گیاوی نے ۱۹۴۰ء میں" نادر خطوط غالب" کے نام سے ایک کتاب مرتّب کرکے شائع کی سب سے پہلے جناب مالک رام نے ثابت کیا کہ یہ خطوط جعلی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جامعہ، نئی دلّی مارچ ۱۹۴۲ء میں ایک مضمون نادر خطوطِ غالب پر ایک نظر کے عنوان سے لکھ کر اس جعل کا بھانڈا پھوڑا۔ بعد میں (جنوری ۱۹۴۳ء) قاضی عبدالودود مرحوم) نے بھی معاصر میں ایک مضمون لکھا۔

۴۔ قیام کلکتہ کے دوران میں جو علمی و ادبی معرکہ پیش آیا تھا اس کے بعد سے غالب کو قتیلؔ اور اس کی فارسی دانی سے اس قدر چڑ ہو گئی تھی کہ وہ وار کرنے کے لیے ہر موقع پر تیار رہتے تھے (حالانکہ قتیلؔ اس معرکے سے کئی برس پہلے انتقال کرچکے تھے)۔ غالبؔ عمر بھر قتیلؔ کو لالہ دیوالی سنگھ فرید آبادکا کھتری کہہ کر گالیاں دیتے رہے حتیٰ کہ قتیلؔ کے ایک صحیح اندراج کو بھی دانستہ غلط کہہ کر اسے مطعون کیا الفصاحت کے اس قول سے

اقتباس کدہ بمعنی خانہ باشد یا پنج لفظ ملحق شدہ
سوائے آں مسموع نیست: بتکدہ و غمکدہ
آتشکدہ و میکدہ و گلشن کدہ۔ ۔ ۔

کو لے کر غالب نے قتیل کو کیا کچھ نہیں کہا:

یہ شخص (قتیل) مدعی ہے کہ کدہ کا لفظ سوائے پانچ چار
اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس آرزوکدہ
اور دیوکدہ اور نشتر کدہ ۔۔۔۔ ۔۔۔ نادرست ہے ۔۔۔'
(بنام چودھری عبدالغفور مارچ ۱۸۵۹ء)

وہ قتیل کہتا ہے کہ کدہ کے ساتھ سوائے پانچ سات
لفظ کے اور لفظ کو ترکیب نہ دو" (بنام چودھری عبدالغفور
(مارچ/اپریل ۱۸۵۹ء)

یہ اُلّو کا پٹّھا قتیل عفونتکدہ و نشتر کدہ کو۔۔۔ غلط کہتا ہے"
(بنام ہرگوپال تفتہ ۲۷ اگست ۱۹۶۲ء)

غالب نے اس (کدہ) لاحقے کے بیان کو قتیل کی زبان سے نہیں سنا تھا بلکہ قتیل کی تصنیف "نہرالفصاحت" میں پڑھا تھا۔ غالب نے متن کی عبارت کو تو بار بار دہرایا ہے لیکن قتیل کے حاشیے کو دانستہ نظرانداز کر دیا ہے جو نہرالفصاحت کے اسی صفحے پر درج ہے جس پر متن درج ہے۔ قتیل نے حاشیے میں صاف لکھا ہے کہ یہ صرف اصولاً بیان کیا گیا ہے اس لیے ان پانچ اسما کے علاوہ اساتذہ کے کلام میں جہاں کہیں اس قسم کے مرکبات آئے ہیں، وہ اسی اصول کی فروع ہیں۔ حاشیہ پڑھنے کے بعد قتیل کے بیان پر حرف گیری ممکن نہیں۔

آمدم برسرِ مطلب۔ ان واقعات کی روشنی میں قتیل کا نام غالب سے کچھ ایسا جڑ گیا ہے کہ قتیل

کا حسب نسب دریافت کرنا اور اس کے بارے میں غالب کے بیانات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہوگیا۔ حیرت ہے غالب سمیت تمام تذکرہ نویسوں میں سے کسی نے قتیل کے صحیح نام و مقام کی نشاندہی ہی نہیں کی بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو مزید الجھنوں میں پھنسا دیا۔ یہ مالک رام صاحب ہی کی ہمت تھی کہ انھوں نے برسوں کی دوڑ دھوپ کے بعد قتیل کا صحیح شجرۂ نسب، نام اور جائے ولادت کا تعین کیا۔ یہ مضمون "فسانہ غالب" میں شامل ہے۔ قتیل کا پہلا نام دیوانی سنگھ تھا، ذات بھنڈاری کھتری، اصل وطن بٹالہ، ضلع گورداسپور، پنجاب۔

۵۔ جوے کے الزام میں، یہی مشہور تھا کہ، وہ صرف ایک بار پکڑے گئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ غالب دو دفعہ اس الزام میں گرفتار ہوئے۔ اس کا ذکر غالب کے اور کسی سوانح نگار نے نہیں کیا تھا۔ مالک رام صاحب نے پہلے مرزا کے ۱۸۴۱ء میں اور پھر ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو پکڑے جانے کی اطلاع بہم پہنچائی ہے۔ پہلی گرفتاری پر انھوں نے قید کی بجائے جرمانہ بھرا، دوسری گرفتاری میں قید بھی ہوئی اور جرمانہ بھی۔ مالک رام صاحب نے اس کا ذکر ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء کے دہلی اردو اخبار کی سند پر کیا ہے اس لیے مستند ہے۔

۶ مرزا یوسف برادرِ غالب کے حالات۔ جو مالک رام صاحب نے بہم پہنچائے ہیں، وہ ایک طرح سے اب تک حرفِ اوّل و آخر ہیں۔ کلیات نثرِ غالب، کارنامۂ سروری، اردوے معلیٰ، باغِ دودر، خدنگ غدر، غدر کی صبح و شام، احوالِ غالب، واقعات دارالحکومت دہلی، مکاتیب غالب، دیوانِ معروف تو وہ مآخذ ہیں جو چھپ چکے ہیں اور تھوڑی بہت کاوش سے دستیاب ہو سکتے ہیں، مگر اس قلمی کتاب (جسے میں نے "تحفۂ غالب" کا نام دیا ہے) اور قومی دفتر خانہ، ہند National Archries میں دفن شدہ مسلوں کی ورق گردانی کون کرتا۔ یہ کام جناب مالک رام نے کیا اور اب قارئین کے لیے ایسا مواد پیش کر دیا ہے جس پر اضافہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو آسانی سے ممکن بھی نہیں۔ "فسانۂ غالب" میں مرزا یوسف کے حالات پڑھیے اور زندہ برادرِ غالب سے ملاقات کیجیے۔

۷ ولیم فریزر (مقتول) اور قاتل (اگرچہ براہِ راست نہیں) نواب شمس الدین احمد خان۔ مالک رام صاحب

کا یہ مضمون (مشمولہ فسانۂ غالب) پڑھنے والے کو حیرت میں ڈالتا ہے۔ اسے ایک ہی نشست میں پڑھے بغیر چارہ نہیں۔ یہ قتل و خون اور سزا و جزا کی ایک داستان ہے جس کی تفصیلات پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ مالک رام نے دیوانِ معروف، مرقع اور اردوے معلیٰ، کلیاتِ نثر غالب، کارنامۂ سروری، واقعات دارالحکومت دہلی، کرنیل سلیمان کی مشہور انگریزی کتاب، تاریخِ صفحات اردو، مکاتیب غالب اور سخن الشعرا سے کم کم اور قومی دفتر خانہ ہند کی دفن شدہ فائلوں سے بیش از بیش مواد اکٹھا کرکے جامع اور بھرپور ۱۴ صفحات لکھے ہیں۔ شمس الدین احمد خان اور قتل فریزر پر شاید اس سے بہتر مضمون نہ لکھا جا سکے نواب شمس الدین احمد خاں داغ کے والد تھے۔ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے کچھ عرصے تک لوگوں کو یہ شبہ رہا کہ نواب کی گرفتاری میں غالب کا بھی ہاتھ ہے مگر یہ شبہ بے بنیاد تھا۔

۸۔ اپنی پنشن کے سلسلے میں غالب مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے ۲۱ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے تھے اور کوئی تیس برس کی غیر حاضری کے بعد اتوار ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ء کو دہلی واپس آئے۔ اسی دوران میں کلکتے میں انھوں نے مقدمۂ پنشن کی پہلی درخواست گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کی تھی۔

'ذکرِ غالب' کے چوتھے ایڈیشن کی ترتیب کے وقت یوں تو مالک رام صاحب کے پیشِ نظر وہ تمام مواد تھا جو غالب کے پنشن کے مقدمے سے متعلقہ دفتر خانۂ ہند نئی دہلی میں موجود ہے لیکن ان کاغذات میں انھیں یہ سب سے پہلی درخواست نہیں ملی تھی۔ بظاہر اس درخواست کے نہ ملنے سے مقدمے کی روداد بیان کرنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر مالک رام جہاں تک ممکن ہو ہر کام کو پورا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ چند برس بعد وہ لندن گئے وہاں تلاش کرنے پر انھیں انڈیا آفس لائبریری میں وہ گمشدہ درخواست بھی مل گئی۔ اصلی درخواست ظاہر ہے فارسی میں ہوگی، یہ اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے اس درخواست کی خاصی اہمیت ہے اس سے حیاتِ غالب کی کئی گمشدہ کڑیاں مل گئیں مثلاً

(۱) درخواست کی تاریخ ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء ہے گویا کلکتہ کے تقریباً سوا دو مہینے بعد غالب نے یہ درخواست پیش کی تھی۔

(۲) غالب کی دادی کا انتقال ۱۸۰۶ء اور ۲۸ اپریل ۱۸۲۸ء

کے درمیان کسی وقت ہوا۔

(۳) غالب کے کئی چھوٹے چھوٹے سفروں کا پتا چلتا ہے جو انھوں نے دلّی سے باہر کیے۔

(۴) مرزا یوسف برادر غالب ۱۸۲۵ء سے پہلے دیوانے ہو چکے تھے

(۵) غالب جب ان چھوٹے چھوٹے سفروں پر دلّی سے نکلے تو وہ پلٹ کر دلّی نہیں آئے بلکہ وہیں سے پھرتے پھراتے کلکتے کے لیے روانہ ہو گئے۔ انھیں دلّی واپس آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی کیونکہ یہاں قرضخواہ بُری طرح سے ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔

(۶) درخواست میں اپنا نام محمد اسداللہ خاں لکھا اور اپنے بھائی کا یوسف خان۔

(۷) غالب نے پہلی بار اس درخواست میں لکھا کہ ان کے دادا کا نام قوقان بیگ خان تھا۔

مندرجہ بالا کو مشتے نمونہ از خروارے کہنا چاہئے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ آج سوانحِ غالب پر کوئی کام کرنے بیٹھے تو ہمیں جو کتابیں سب سے مستند، معتبر اور اہم دکھائی دیتی ہیں وہ لے دے کر یہی ذکرِ غالب'، فسانۂ غالب' اور تلامذۂ غالب ہیں اور یہ تینوں مالک رام صاحب کی مصنفہ اور مولفہ ہیں۔

رفعت سروش

مالک رام ـــــ ایک کتاب

ڈیفنس کالونی عالیشان کوٹھیوں، آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روموں اور جگمگاتی موٹر گاڑیوں کی کالونی ہے۔ مگر اس بھول بھلیّوں کی جگہوں پر ایک مکتب ایسا بھی ہے کہ جس کے صدر دروازے پر نہ موٹر کار جھومتی ہے۔ نہ گیرج کا کوئی نشان ہے۔ نہ آپ کا استقبال دروازے پر لٹکی ہوئی کوئی ایسی تختی کرتی ہے "کتوں سے ہوشیار رہیے" آپ اطمینان سے ایک بے قفل دار Unlocked آہنی گیٹ کھول کر اس پُرسکون مکان کے احاطے میں داخل ہوجائیے۔ مہکتے ہوئے بیلے کے پھول اور گلاب آپ کے قدم چوم لیں گے اور اظہارِ مسرت کرتے نظر آئینگے اور سامنے برآمدے میں دو چار سادا کرسیاں اس انداز سے پڑی ہونگی کہ جیسے ابھی ابھی کوئی یہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔

یا عین ممکن ہے کہ جب آپ پہونچیں تو یہاں کوئی شخص بیٹھا ہوا ہی ہو مگر وہ بہت سکون سے بیٹھا ہوگا اور ممکن ہے کہ اس کی نظر آپ کی آہٹ پر ہی کتاب سے ہٹی ہو۔ اور یہ تو ممکن ہی نہیں کہ ان کرسیوں پر یا ان کرسیوں کے آس پاس کچھ کتابیں نہ ہوں۔ سلیقے سے رکھی ہوئی کتابیں نہیں ـــ بلکہ مطالعہ کے بعد اِدھر اُدھر بے ترتیبی سے رکھی ہوئی کتابیں۔ چھوٹے سے برآمدے سے ملحق ایک بڑا کمرہ آپ کی نظروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا۔ اور یقیناً آپ کی نظر ان بے شمار کتابوں کے نظاروں میں دور ہی سے کھو جائیگی جو ادھر ادھر الماریوں میں طاقوں میں، کارنس پر، میزوں پر، کرسیوں پر اور فرش پر بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی نشست گاہ کے ارد گرد رکھی ہوئی ہیں آپ شاید یہ سمجھیں کہ یہ کتابیں محض جمع کرنے کے لیے یہاں اس بے ترتیبی سے اکٹھا کی گئی ہیں ـــ نہیں جناب۔ یہ کتابیں مطالعہ کی متنوع ضرورتوں کے تحت نہایت اہتمام سے رکھی ہوئی ہیں اور انھیں برتنے والے کو ان کے وجود سے اتنا لگاؤ ہے کہ وہ آنکھ بند کرکے چشم زدن میں مطلوبہ کتاب اٹھالیتا ہے۔ ادھر ادھر کچھ نایاب تصویریں لگی ہوئی ہیں۔

اور یہیں۔ اسی کتابی فضا میں ۔ ایک کرسی پر ایک شخص کمال سکون سے اس طرح متمکن ہے جیسے وہ بھی ایک بھاری بھرکم کتاب ہے ۔ اور آپ کی آمد پر جس کے ہونٹوں پر تبسم کی ہلکی سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ محبت، شفقت اور یگانگت کا جذبہ اس کی عینک کے شیشوں سے جھانکنے لگتا ہے ۔ یہی شخص مالک رام ہے۔ آپ اس یگانۂ روزگار شخص سے مل کر اس کی سادگی، شرافت، علمی اور نرم گفتاری کے تو فوراً ہی قائل ہو جاتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد اس کی گہرافشانی گفتار آپ کو یہ احساس دلا کر چونکا دیتی ہے کہ آپ کا تجربہ اور مطالعہ بڑھ گیا ہے جیسے بہ یک وقت آپ نے کئی اہم اور نادر کتابوں کا مطالعہ کر لیا ہو اور انھیں ذہن نشین کر لیا ہو۔

مالک رام صاحب ماہر غالبیات ہیں، ماہر اسلامیات ہیں، ماہر تاریخ ہیں، بحر العلوم ہیں۔ مگر اس کا اندازہ ان کی ظاہرہ شخصیت سے نہیں ہوتا ۔ جیسے ایک بند کتاب کو دیکھ کر آپ اس کے اوراق میں پوشیدہ علمی ذخیرے کا اندازہ نہیں کر سکتے اور جس طرح اوراق کتاب نا فہم کو اپنے ذخیرے سے محروم رکھتے ہیں ۔ اسی طرح مالک رام صاحب بھی، نا جنس، پر نہیں کھلتے۔ بڑے لیے دیے سے رہتے ہیں۔
مالک رام صاحب دراصل تحقیق کے آدمی ہیں۔ اور تحقیق ایسا شعبۂ علم و فن ہے جہاں بعض اوقات ایک لفظ کی صحیح شناخت کے لیے برسوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور ستم ظریفی یہ کہ پھر بھی محقق کو اس کی عرق ریزی کی داد نہیں ملتی۔ اس لیے اس کوچے میں وہی قدم رکھتے ہیں جنہیں وقتی شہرت اور نام و نمود سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کے لیے تو تحقیق عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ تحقیق اپنے اسیر سے بے لوث ریاضت چاہتی ہے اور روحانی وابستگی ۔ محقق عوامی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتا ۔ آج کل تو تحقیق کی گرم بازاری ہے اور اقتصادی ضرورتوں کے تحت تحقیق کار، تخلیق کاروں سے زیادہ ہیں۔ تخلیق کا تو اب بھی یہی حال ہے کہ ؎

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

مگر تحقیق کاروں کے کارواں خیر سے ہندوستان کی ہر یونیورسٹی سے ہر سال منظر ادب پر طلوع ہوتے ہیں اور آج ہندوستان کے بڑے شہروں میں اوسطاً اردو کے سو سو ڈاکٹر تو ہوں گے۔

(مگر پھر بھی یہ زبان جاں بہ لب ہے)

ایک زمانہ وہ تھا کہ تخلیق کار داد و تحسین کی ہوس سے بلند ہو کر شعر کہتا تھا۔ افسانہ اور ناول لکھتا تھا اور محسوس کرتا تھا کہ زمانہ سب سے بڑا، نقاد ہے۔ مگر پھر جب معاشرے نے زمانہ ساز ادیب و شاعر پیدا کرنے شروع کئے تو یہ دیکھنے میں آیا کہ ہر شاعر اور ادیب اپنا نقاد ساتھ لایا۔ اس کی مثالیں گزشتہ تیس چالیس سال کی ادبی تاریخ سے مل جائینگی۔ یار لوگوں نے چند نظمیں یا کہانیاں لکھیں۔ اور نقاد دوستوں نے انھیں بانس پر چڑھا دیا ـــ (اب یہ اور بات ہے) اس عمل نے فن تنقید کی ایسی بے حرمتی کی کہ آج اچھے نقادوں کا بھی اعتبار باقی نہیں رہا ہے)

اور اب اگر تحقیق کی ایسی ہی گرم بازاری رہی تو کچھ عرصہ بعد ہر ادیب اپنے ساتھ تحقیق کار لیکر پیدا ہوا کریگا ـــ جہاں چند چیزیں سامنے آئیں کہ متوقع محقق نے اپنے ہم جلیس کا نام تحقیقی بتانے کے لیے رجسٹرڈ کرالیا اس ڈر سے کہ ان کا خام مال کوئی اور ہڑپ نہ کرلے۔

مگر مالک رام صاحب عشق پیشہ محقق ہیں اس صدی نے فنِ تحقیق سے عشق کرنے والے چند بزرگ ہی اردو ادب کو عطا کئے ہیں جن کے نام بلاشبہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ غلام رسول مہر قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی۔ اور مالک رام ۔ مالک رام نے لفظ کاری کی ابتدا تو صحافت سے کی وہ ادبی رسالہ نیرنگِ خیال، اور اخبار آریہ گزٹ سے بحیثیت ایڈیٹر کے متصّف رہے۔ مگر بہت جلد اس کوچے سے نکل بھاگے اور انھیں سرکار انگریزی کی ملازمت نے اپنے دائرے میں لے لیا۔ گویا انھیں اپنے حرف کو بازار میں لانے کی ضرورت نہ رہی۔ اور میرے خیال میں یہی وہ نقطہ ہے کہ جس نے مالک رام کے قلم اور ذہن کو مصلحتوں سے آزاد کر دیا اور انھوں نے ادب کے میدان میں جو کچھ کیا محض دل کے تقاضے پر، روحانی سکون کے لئے۔ قلم کی تشنگی بجھانے کے لیے ـــ اور بالواسطہ طور پر دیگر تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کے لیے۔ ان کے کام تنوع ہیں اور جب کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں وہ ماہر غالبیات بھی ہیں اور ماہر اسلامیات بھی۔ ترتیب و تدوین، ترجمہ، تذکرہ۔ سب ان کے قلم کی جولانگاہ ہیں۔ اور ہر میدان میں انھوں نے ایسے نقوش ثبت کیے ہیں جو دیر تک جگمگاتے رہیں گے۔

مالک رام صاحب دوسری جنگ شروع ہونے سے کچھ عرصے پہلے اپنی منصبی ذمہ داریوں کو پوری کرنے مصر چلے گئے تھے۔ اور جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے ایک طویل عرصے تک مشرق وسطٰی ہی میں رہے اور اس سلسلے میں انھیں یورپ کے کچھ ممالک میں بھی قیام کا موقعہ ملا۔ مگر ان کا مزاج سراسر مشرقی تھا

اور ہے۔ ان سے مل کر قطعاً اندازہ نہیں ہوتا کہ اس شخص نے تقریباً بیس سال ممالک غیر میں گزارے ہیں مالک رام صاحب وزارت خارجہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۶۵ء میں ہندوستان واپس آئے اور دہلی کو اپنا مستقر بنایا۔ میں نے مالک رام صاحب کا نام سنا تھا مگر ان سے ملنے کا اتفاق ۱۹۶۵ء میں ہی ہوا۔ وہ اردو مجلس پروگرام میں تقریر کرنے آئے۔ میں اس پروگرام کا پروڈیوسر تھا۔ ضروری گفتگو ہوئی اور بس۔ ظاہر ہے ان کی شخصیت میں کوئی بڑپن کی بُو نہ تھی۔ شیروانی، ٹوپی اور تنگ مہری کے پجامے میں ملبوس ایک عام بزرگ کی طرح تشریف لائے۔ وقت پر آئے تقریر کی ریکارڈنگ کرائی اور تشریف لے گئے۔ اب نہ مجھے وہ تقریر یاد نہ ریکارڈنگ کے وقت کا کوئی لمحہ۔ کیونکہ مالک رام صاحب نمایاں قسم کے براڈ کاسٹر نہیں ہیں۔ اور میں اچھے لب ولہجے کا عاشق ہوں۔ اس تقریر میں اس اعتبار سے میرے ذوقِ سماعت کی تسکین کا سامان نہ تھا۔

مالک رام صاحب نہایت نرم روی سے دلّی کی بزم میں آئے اور دیکھتے دیکھتے اس شہر کے ادبی اور ثقافتی منظر نامے میں ایک خوشگوار رنگ کا ایسا اضافہ ہوا کہ اہل شہر کی آنکھیں خیرہ ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی ترتیب وتدوین کے کام کا قرعۂ فال مالک رام صاحب کے نام نکلا۔ ساہتیہ اکاڈمی کے اردو سیکشن کے انچارج مالک رام صاحب بنا دیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد ہی غالب صدی کی تقریبات کی تیاریاں شروع ہوئیں تو مالک رام صاحب کی خدمات کے بغیر غالب کے اس کام کو آگے بڑھانا ممکن نہ تھا کہ وہ چند ماہرین غالبیات میں سے ایک ہیں اور دلّی شہر کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھوں نے عالم میں انتخاب اس شہر میں سکونت اختیار کرلی ہے۔

انھوں نے غالب صدی تقریبات کمیٹی کی فرمائش پر دیوانِ غالب مرتب کیا، غالب انسٹی ٹیوٹ نے چھاپا۔ غالب اکیڈمی کے قیام میں بھی وہ پیش پیش رہے اور اس ادارے کے فروغ میں ان کا نمایاں حصّہ ہے۔ پھر انڈو ایران کلچرل سوسائٹی کو اُن کی خصوصی خدمات حاصل رہیں۔ انجمن ترقی اردو ہند نے اس دُرِ بے بہا کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور اب تو خیر سے وہ اس ادارے کے صدر ہیں۔ دلّی میں اردو اکیڈمی قائم ہوئی تو اس ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ مالک رام صاحب اس کے بنیادی ممبر بن گئے قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ اس طرح کی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ان کے علمی مشاغل میں کمی نہیں آئی۔ انھوں نے 'تحریر' جیسا علمی سہ ماہی جریدہ کئی سال شائع کیا۔ اور تصانیف اور تالیفات

کا سلسلہ روز جاری وساری ہے۔ ان کی خرابیٔ صحت کے باوجود۔ اہل ادب ان کے بے لاگ اور بے باک ہونے کی قسم کھا سکتے ہیں اور خاص طور پر اس لیے کہ انھوں نے کسی حیثیت سے بھی ادب کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ اور وہ کوئی ادبی کام اقتصادی تقاضے کے تحت کرنے کے لیے مجبور نہیں ہیں۔

انھوں نے اپنی معاشی زندگی کو ادب سے قطعاً الگ کر رکھا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کی موٹر ایجنسی کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہیں انھوں نے اپنا قلم نہ کل بیچا تھا نہ آج۔ بالواسطہ طور پر بھی نہیں۔ امدادی فارغ البالی میں ان کی وسیع النظری اور قلندری کا راز ہے۔

مجھے بیس اکیس سال سے مالک رام صاحب سے نیاز حاصل ہے۔ وہ بزرگ ہیں، چھوٹوں سے محبت کرنا اور شفقت سے پیش آنا ان کی سرشت میں شامل ہے۔ مجھے بھی ان کی شفقت حاصل ہے اور بے انتہا شفقت حاصل ہے۔ اس طویل عرصے میں ان کی عظیم شخصیت کو جاننے اور سمجھنے کے بہت سے مواقع حاصل ہوئے۔ سب سے پہلا تو براڈکاسٹنگ کا ہی رشتہ ہے، بڑے ادیب اپنا بڑ پن کو طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ کبھی فرمائینگے۔ پہلے ہماری فیس بڑھائیے۔ کبھی ارشاد ہوگا۔ ریکارڈنگ کا وقت اور تاریخ تبدیل کر دیجئے وغیرہ وغیرہ مگر مالک رام صاحب نے مجھے کبھی ایسے امتحان میں نہیں ڈالا اور ہمیشہ بھرپور تعاون کیا اور اردو پروگراموں کو بہتر بنانے میں میرا ہاتھ بٹایا۔ اگر کبھی تشریف نہ لاسکے تو محض خرابیٔ صحت کی بنا پر۔ یادگارِ زمانہ۔ پروگرام کے تحت میں نے ان کا ایک انٹرویو لیا تھا۔ وہ اے آئی۔ آر آرکائوز میں محفوظ ہے اس میں انھوں نے اپنے متعلق بہت سی ایسی معلومات فراہم کی ہیں جو شاید ان کی کسی تحریر میں نہیں ہیں۔ خاص طور پر اپنی ابتدائی زندگی اور تعلیم کے بارے میں۔

اس انٹرویو سے پہلی بار مالک رام کی شخصیت کا یہ راز کھلا کہ سیکولرزم اور مذہبی رواداری ان کی سرشت میں شامل ہے۔ پیدائش ایک ہندو گھرانے میں ہوئی۔ تعلیم کی ابتدا گوردوارے میں ہوئی یہاں گورمکھی سیکھی پھر ایسے اسکول میں پہنچے جہاں اردو بہ التزام پڑھائی جاتی تھی۔ اور بہترین ہم سبق اور دوست مسلمان تھے۔ یہیں سے ان کے ذوقِ ادب اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کی بنیاد پڑی جو بعد میں ایک اعلیٰ درجے کی سیکولر شخصیت کے روپ میں جلوہ گر ہوئی۔

مالک رام صاحب اپنی رائے دینے میں لاگ لپٹ سے کام نہیں لیتے۔ لیکن ان کا طریقۂ کار نہایت

جمہوری ہے۔ اور وہ اصولی باتوں اور اختلافات کو کبھی ذاتی سطح پر نہیں لاتے اس امر کا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب دہلی کے ایک ثقافتی ادارے کی میٹنگ میں میں نے ان کی ایک تجویز کی مخالفت کی جرأت کی۔ میرے نزدیک وہ اصولی بات تھی اور بحث و مباحثہ کے بعد اتفاق سے میری ہی رائے کو مان لیا گیا۔ بعد میں کچھ لوگ میری اس جرأت پر بگڑ اُٹھے۔ مگر خود مالک رام صاحب نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا۔ بلکہ میں نے محسوس کیا کہ میری اس جرأت سے شاید وہ خوش ہوئے کیونکہ اس واقعہ کے بعد میں نے ان کے التفات میں اور گہرائی محسوس کی۔

مالک رام صاحب بلاشبہ ان بزرگ ادیبوں میں سے ہیں جو اپنے بعد آنے والوں کی ہمت افزائی کرنا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ میں بنیادی طور پر شاعر ہوں مگر کبھی کبھی منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ایک آدھ مضمون لکھ لیتا ہوں، ایسے کچھ مضامین یکجا کر کے میں نے ایک مجموعہ 'نقوش رفتہ' کے نام سے شائع کیا۔ اس کے اجرا کے موقع پر مالک رام صاحب نے میری نثر نگاری کی تعریف کی اور بعد میں ذاتی ملاقات میں بھی مشورہ دیا کہ میں اپنے ریڈیو کے زمانے کی یادداشتوں کو رقم کر دوں تاکہ بہت سے ایسے لوگوں کا تذکرہ جمع ہو جائے جو عام طور پر کچھ دن ذہنوں میں رہنے کے بعد فراموش کر دیے جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہی چیزیں تاریخ بن جاتی ہیں اور آئندہ تحقیق کرنے والوں کے لیے ایسی یادداشتیں بے حد کام آتی ہیں۔ چنانچہ ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے "بمبئی کی بزم آرائیاں" لکھنی شروع کی جو بالاقساط قومی آواز میں چھپ کر خواص و عوام کی توجہ کا مرکز بنا اور اب کتابی شکل میں شائع ہو گئی ہے۔ اور اس کا دوسرا حصہ۔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے۔ زیر تصنیف ہے اس طرح اس خود نوشت میں سیکولرزم کردار اپنی کچھ خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ دائرہ تحریر میں آجائینگے۔ کچھ بہت مشہور۔ کچھ جانے پہچانے۔ اور کچھ عام لوگوں کے لیے ناآشنا۔ مجھ سے یہ کتاب لکھانے کا سہرا مالک رام صاحب کے سر ہے۔ اور ان کی ہمت افزائی نے ہی مجھے یہ توفیق بخشی کہ نثر کے بعد ان میں قدم رکھ سکوں۔

مالک رام صاحب نہ کسی سے جھک کر ملتے ہیں، نہ کسی سے اکڑ کر۔ ان کی ایک روش ہے۔ ایک وضعداری ہے ایک رکھ رکھاؤ ہے۔ مجھے علم ہے کہ اسی دلی میں کچھ لوگوں نے ان کی مخالفت کی اور اوچھے انداز سے۔ مگر مالک رام صاحب نے ان عامیانہ باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا۔ نہ مثبت، نہ منفی۔ ایک بار

انھوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا جس سے ان کے مزاج کی اس روش پر روشنی پڑتی ہے۔ فرمایا کہ ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد کے خلاف پاکستان میں کوئی مضمون چھپا۔ مضمون گھٹیا تھا اور غلط بیانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ مضمون مالک رام صاحب نے پڑھا اور کسی موقعہ پر مولانا آزاد سے کہا کہ ایک ایسا مضمون چھپا ہے اور میں اس کا جواب لکھنا چاہتا ہوں، مولانا نے فرمایا۔ اچھا مجھے تو معلوم نہیں، چھپا ہوگا۔ تم نے کیوں پڑھا۔ اور کیا ضرورت ہے جواب لکھنے کی۔ تمہارا جوابی مضمون پڑھ کر مضمون نگار اپنی رائے نہیں بدل سکتا۔ اور جن لوگوں کو اس سے اختلاف ہوگا ان کو بھی تمہارے مضمون سے کوئی فائدہ نہ پہونچیگا۔

اس گفتگو کے بین السطور میں ہم مالک رام صاحب کی بے نیازانہ روش کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اور اس قوتِ برداشت کا بھی جو ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ مالک رام صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ اپنے مزاج سے ایک ادارہ ہیں اپنی شخصیت سے ایک مشعلِ راہ ہیں۔ وہ ذاتی مفادات سے بلند ہو کر سماجی زندگی گزارتے ہیں ایک دردمند دل رکھتے ہیں اس لیے عزیزوں اور دوستوں کے مسائل توجہ سے سنتے ہیں اور ہر ممکن حل تلاش کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کتابوں سے گھری ہوئی ہے۔ وسیع اور متنوع مطالعہ کی بدولت نہ جانے کتنی کتابوں کا جوہر ان کے سینے اور حافظے میں محفوظ ہے۔ ان کی زندگی سراسر علم ہے۔ وہ ایک زندہ کتاب ہیں اور علم کے انحطاط کے اس دور میں ان کا وجود ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ ان سے مل کر یقین ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

ایم حبیب خاں

سوانحی تحقیق اور مالک رام

مالک رام صاحب اردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات ہیں۔ انھوں نے اردو تحقیق میں مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے اور کئی اعتبار سے ان کا کام خصوصیت کا حامل ہے غالبیات پر ان کا کام اور متعدد اضافے ایسے ابھر کر ہمارے سامنے آئے ہیں جس سے اُن کی تحقیقی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے "ذوقؔ اور غالبؔ" کے عنوان سے جو مضمون لکھا وہ ۱۹۲۶ء کے "نگار" میں شائع ہوا تھا۔ یہ پہلا تحقیقی مضمون تھا جس میں انھوں نے زبان و بیان کے لحاظ سے ذوقؔ کو غالبؔ پر ترجیح دی تھی۔ آج بھی ذوقؔ کے بارے میں ان کی یہی رائے ہے لیکن اس مضمون کی اشاعت کے بعد غالبؔ سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی اور غالبؔ پر ایسی معرکے کی کتابیں لکھیں کہ غالب شناسوں نے ان کو ماہر غالبیات تسلیم کیا اس لیے غالبیات پر ان کو اوّلیت حاصل ہے۔

سوانحی تحقیق کے ذیل میں مالک رام صاحب کی دو کتابیں "ذکر غالب" اور "تلامذہ غالب" ایسی اہم اور قابل قدر ہیں جو غالبؔ کی دوسری سوانح عمریوں "یادگار غالب"، "غالب" اور "غالب نامہ" سے زیادہ معتبر ہیں۔ غالبؔ کو سب سے پہلے مولانا حالیؔ نے "یادگار غالبؔ" کے ذریعہ متعارف کرایا، یہ بات ۱۸۹۷ء کی ہے۔ حالیؔ غالبؔ کے شاگرد اور ہم عصر تھے، استاد کو شہرت ان کی زندگی میں مل گئی تھی اور حالیؔ نے غالبؔ کی سوانح عمری ان کی زندگی میں مکمل کر لی تھی مگر اس کی اشاعت غالبؔ کے مرنے کے بعد ہوئی۔ "یادگار غالبؔ" میں بہت سی تفصیلات نامکمل اور تشنہ ہیں بیشتر حالات کی تفصیل بھی نہیں ملتی۔ حالیؔ ذرا سی توجہ کرتے تو بہت سی معلومات کی تصدیق غالب سے کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی 'یادگار غالب' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"حالیؔ کی جلد بازی نے انھیں اپنے مواد کی چھان بین
میں، غالبؔ کی تحریروں کے گہرے مطالعے خاص کر

فارسی خطوط، اور احباب سے فراہمی مواد میں مزید
تگ و دو سے باز رکھا۔ وہ غالب کے خاص حلقۂ
احباب میں نہ سہی "حیاتِ سعدی" میں انھوں نے
جس محنت اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے "یادگارِ
غالب" میں اگر اس کا تھوڑا سا حصہ بھی صرف کرتے تو
ہمیں اس سے بہتر تصنیف دے سکتے تھے" [1]

یہ بات صحیح ہے کہ یادگار غالب" میں جس طرح کی محنت، تحقیق اور معلومات درکار تھی وہ اس میں نظر نہیں آتی اسی طرح حالی نے "حیاتِ جاوید" میں سرسید کے ایک مخالف مولوی علی بخش خاں شرر کا ذکر تو کئی جگہ کیا ہے مگر ان کے متعلق تفصیل سے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ "حیاتِ سعدی" میں انھوں نے جس محنت اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے "یادگارِ غالب" میں مولوی مدن والی بات پیدا نہ ہو سکی اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں مولانا غلام رسول مہر نے "غالب" لکھی اور کچھ دن بعد ۱۹۳۶ء میں شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" غالب پرستوں کے سامنے پیش کیا۔ ان تینوں حضرات کا کام اپنی اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ لیکن نوعیت کے اعتبار سے ان کا کام محدود ہے مالک رام صاحب چوتھے غالب شناس ہیں جنھوں نے نہایت مدلل، ٹھوس اور شگفتہ زبان میں غالب کے حالاتِ زندگی تحقیق و تلاش کے بعد "ذکر غالب" کے نام سے ہمارے سامنے پیش کئے۔ "ذکر غالب" کے وجود میں آنے کا واقعہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کلیاتِ نظم فارسی کی اشاعت کے بعد غالب نے جو کچھ کلام فارسی میں کہا تھا اسے غالب نے "سبد چین" کے نام سے ۱۸۶۷ء میں شائع کر دیا تھا۔ مالک رام صاحب کو "سبد چین" کی تلاش ۱۹۳۶ء کے شروع میں پیدا ہو گئی تھی اور انھوں نے اپنی عادت کے مطابق اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو اس نسخے کی تلاش میں خطوط لکھے مگر پوری کوشش کے باوجود کہیں سے یہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ بالآخر نواب صدر یار جنگ کے کتب خانے واقع حبیب گنج میں اس کا سراغ ملا۔ مالک رام صاحب نے اس نادر نسخے کی نقل حاصل کر کے اس کو مرتب کر ڈالا۔ اور اس پر مبسوط دیباچہ حامد علی خاں مرحوم

---

[1] "کلاسیکی ادب کا تنقیدی مطالعہ" ڈاکٹر وحید قریشی ص۔ ۲۵

سابق جنرل منیجر مکتبہ جامعہ کے اصرار پر لکھا۔ لیکن بعد میں ان دونوں میں یہ طے ہوا کہ "سبد چین" اور اس کے دیباچے کو کتابی صورت میں علیحدہ علیحدہ چھاپا جائے۔ مالک رام صاحب کے سامنے میری "ذکر میر" موجود تھی اس لیے دیباچہ "سبد چین" کو "ذکر غالب" کے نام سے پیش کیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں "ذکر غالب" مکتبہ جامعہ سے پہلی بار شائع ہوئی کتاب کے بارے میں مالک رام صاحب کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "میں نے یہ مضمون "سبد چین" کے دیباچے کے طور پر لکھا تھا اسی لیے اس میں میرزا کی زندگی اور تصنیفات کے بیان پر اکتفا کی اور کلام پر نقد و تبصرہ سے اجتناب کیا ایک تو اس لیے کہ حالی سے لے کر ہمارے زمانے تک کے متعدد شارحین اور ناقدین میرزا کے کلام کا جائزہ لے چکے تھے دوسرے اس مضمون کو دیباچے کے حدود سے تجاوز کر کے کسی بحث مباحثے یا مناقشے کا میدان نہیں بنایا جا سکتا تھا یہی اصول بعد کے ایڈیشنوں میں بھی میرے سامنے رہا ہے۔" [1]

"ذکر غالب" کے بعد غالب پر تحقیقی کام کی رفتار کسی قدر تیز ہوگئی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غالب کی زندگی کے بہت سے ایسے واقعات جو "یادگار غالب" میں الجھے ہوئے اور غیر معتبر تھے ان کو سلجھایا اور معتبر واقعات کو دلائل کے ساتھ پیش کیا۔ مثلاً غالب کی زندگی کا اہم واقعہ پنشن کے مقدمے کا ہے۔ یہ مقدمہ اس قدر پیچیدہ تھا کہ بغیر سرکاری کاغذات کے مطالعے کے سلجھ نہیں سکتا تھا۔ مالک رام صاحب نے ہندوستان اور برٹش لائبریری کے سرکاری ریکارڈ کو کھنگالا اور اس کا غائر مطالعہ کر کے "ذکر غالب" میں اس کی تفصیلات پیش کیں۔ غالب کے مقدمے کی اتنی تفصیل کسی اور جگہ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ انھوں نے تحقیق کی طرف اس وقت توجہ کی جب کسی سرکاری دستاویز کو دیکھنے کی اجازت تک نہ تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کسی کو مآخذ کے استعمال کا خیال تک نہ آیا تھا۔ اسی طرح غالب

---

[1] ذکر غالب پانچواں ایڈیشن ص۔ ۹

کے استاد نظیر اکبر آبادی کا مسئلہ بھی الجھا ہوا تھا۔ مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" میں وہ تمام شبہات دور کرنے کی کوشش کی ہے جو قطب الدین باطن کے تذکرہ "گلستان بے خزاں" حالی کی یادگار غالب، شیخ محمد اکرام کا "غالب نامہ" اور حسرت موہانی کے یہاں ملتے ہیں۔ ذکر غالب" میں یہ بات ثابت کی ہے کہ غالب نظیر اکبر آبادی کے شاگرد نہیں تھے۔ غرض اس طرح کی بہت سی غلط فہمیوں کو "ذکر غالب" میں دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ مالک رام صاحب کی" ذکر غالب" دوسری سوانح عمریوں کے مقابلے میں اہم درجہ رکھتی ہے۔ اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام صاحب کی اردو خدمات کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

> " اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں، تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی ہے۔ غالب پر انھوں نے جو تحقیق کی ہے اس کی وجہ سے غالبیات میں ان کا بلند مقام ہے "ذکر غالب" اور تلامذہ غالب کے علاوہ دیوان غالب کا وہ ایڈیشن جو آزاد کتاب گھر سے شائع ہوا ہے، یہ سب ان کی نظر کی گہرائی اور ذوق سلیم دونوں کا غیر فانی نقش ہیں اس کے علاوہ وہ اپنے ہم عصروں کے کام کا مناسب اعتراف کرتے ہیں۔ ان کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔"

تحقیق اور تنقید دونوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ دونوں اعتراض کے بغیر آگے نہیں بڑھتے لیکن یہ اعتراضات علمی حد تک ہوں اور اس میں انصاف کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ ورنہ مضمون کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ اردو میں دو ہستیاں ایسی گزری ہیں، جنھوں نے تحقیق اور تنقید دونوں

ہیں لکھنے والوں کی تحریروں پر اعتراضات کیے ہیں تحقیق میں قاضی عبدالودود اور تنقید میں پروفیسر کلیم الدین احمد کے نام قابل ذکر ہیں دونوں اردو ادب کی مشہور ہستیاں تھیں اور دونوں مرتے دم تک ادیبوں کے خلاف جنگ کرتے رہے قاضی عبدالودود مرحوم نے مالک رام صاحب کی "ذکر غالب" پر کافی اعتراضات کیے ہیں ان میں بعض اعتراضات تو سخت گیری کی مثال ہیں۔ حالانکہ خود قاضی صاحب سے اپنے تحقیقی مضامین میں بہت سی جگہیں غلطیاں ہوئی ہیں۔ محقق اور نقاد کے لیے یہ غیر ممکن ہے کہ غلطیاں نہ ہوں جیسا کہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے ایک جگہ لکھا ہے:

"غلطی تحقیق و جستجو کی گھات میں لگی رہتی ہے۔ بڑے بڑے نقاد اور مبصر فاش غلطیاں کر جاتے ہیں لیکن اس سے ان کے کام پر حرف نہیں آتا" [1]

قاضی صاحب نے مالک رام صاحب کی ۱۷ فروگزاشتیں گنوائی ہیں ان میں زیادہ تر ایسی ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہے تاہم مالک رام صاحب ان کی تحقیقات کے ہمیشہ معترف رہے اور آج بھی ہیں۔ قاضی عبدالودود مرحوم اردو کے محقق اعظم تھے انھوں نے اردو تحقیق میں جو کارنامے انجام دیے وہ کسی طرح بھلائے نہیں جا سکتے۔ وہ ملا عبدالصمد کو غالب کا فرضی استاد سمجھتے تھے۔ مولانا عرشی مرحوم بھی ملا عبدالصمد کو استاد نہیں مانتے لیکن مالک رام صاحب نے "ذکر غالب" میں شواہد کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملا عبدالصمد غالب کے استاد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ فروگزاشتیں اتنی اہم نہیں جتنے مالک رام صاحب کے متعدد اضافے ہیں اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ "ذکر غالب" پر جتنا اعتبار کیا جا سکتا ہے اتنا غالب کی دوسری "سوانح عمری" پر نہیں۔ غالب نے اپنے خطوط اور دیگر تحریروں میں بھی ملا عبدالصمد نو مسلم کو اپنا استاد بتایا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور بھی ملا عبدالصمد کو غالب کا استاد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"شاعری کا ذوق رسمی نہ تھا، فطری تھا، ورنہ غالب غالب نہ ہوتے۔ ملا عبدالصمد سے انھوں نے فارسی پڑھی

---

[1] غالب نامہ آور ص ۲۷ مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی

اور اس میں انھوں نے وہ ملکہ پیدا کر لیا کہ زبان والوں
کی ہمسری کرنے لگے۔"

"ذکرِ غالب" کی اشاعت (۱۹۳۸ء) کے بعد مالک رام صاحب لاہور چلے گئے۔ اب تحقیق کی طرف ان کا رجحان برابر بڑھتا گیا۔ تحقیق اور تلاش دونوں میں بڑی برکت ہے۔ لاہور میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی توجہ غالبیات کی طرف مائل کر دی مالک رام صاحب "تلامذہ غالب" کے دیباچہ طبع دوم کے آغاز میں ایک واقعے کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ایک دن کمرے پر بیٹھا تھا کہ ایک صاحب دو قلمی کتابیں لے کر آئے، کہنے لگے۔ انھیں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں ایک قتیل کا فارسی دیوان تھا دوسرا واقف بٹالوی کا۔ بادامی رنگ کے مضبوط سیالکوٹی کاغذ پر پختہ نستعلیق خط میں لکھے ہوئے یہ دونوں نسخے بہت اچھی حالت میں تھے۔ بدقسمتی سے انھوں نے جو قیمت طلب کی وہ میری مقدرت سے زیادہ تھی۔ اس لیے معاملہ نہ ہو سکا لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ قتیل کا کچھ کھوج نکالنا چاہیے۔ غالب نے اسے بار بار فرید آبادی لکھا ہے اور دوسرے تذکرہ نگاروں نے بعض اور شہروں کے نام لیے ہیں بہرحال چند ماہ کی تگ و دو کے بعد میں نے معلوم کر لیا کہ قتیل کا خاندان دراصل بٹالہ کا رہنے والا تھا اور اسی اثنا میں ان کا شجرۂ نسب بھی مل گیا۔

لیکن اب مجھے ایک اور خیال آیا کہ کیوں نہ غالب کے شاگردوں کے حالات جمع کیے جائیں۔ چند ایک کے سوا دوسروں کے نام تک معلوم نہیں تھے۔ اور جن کے معلوم تھے ان کے بھی حالات پردۂ خفا میں تھے میں نے تذکرے

جمع کرنے شروع کیے اور کوئی سال بھر میں ان کا اچھا خاصا
ذخیرہ یک جا کر لیا کچھ اور متعلقہ کتابیں بھی دستیاب ہو گئیں۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد وہ غالب کے شاگردوں کی کھوج میں لگ گئے، اور ان کی طبیعت غالب کے شاگردوں کے حالات کی جویا ہوئی اب انھوں نے تذکرے جمع کرنے شروع کر دیے سیکڑوں صفحات کی اوراق گردانی کے بعد مشکل سے حالات مل پاتے دوسرا ہوتا تو ہار کر بیٹھ رہتا مگر وہ ناساعد حالات میں بھی جمے رہے۔ اسی دوران یعنی ۱۹۳۹ء کے وسط میں وہ ملازمت کے سلسلے میں تین سال کے لیے ہندوستان سے باہر چلے گئے۔ دوسری جنگِ عظیم چھڑ جانے کی وجہ سے انھیں سکندریہ (مصر) میں پندرہ سال ٹھہرنا پڑا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر اتنے شاگردوں کے نام اور ان کے حالات ملے کہ خود ان کے خیال میں بھی نہ تھا جنون کے اس انداز کو خود ان سے سنئے:

"سچ یہ ہے کہ یہ بھی جنون کا ایک انداز تھا۔ نہ تمام ضروری
کتابیں مہیا تھیں نہ کوئی ایسا شخص قریب جس سے
مشورہ یا تبادلۂ خیالات کیا جا سکتا۔ بہر حال میں ہمت
نہیں ہارا۔ جب کبھی فرائض منصبی سے فرصت ملتی میں
موضوع کے لیے مواد جمع کرتا رہا۔" [1]

۱۹۳۹ء سے ۱۹۵۵ء تک ان سولہ سالوں میں اردو دنیا سے بے تعلق رہے لیکن غالب کے شاگردوں پر ان کا کام جنون کی حد تک جاری رہا۔ تجارت جیسے ادب کش محکمے میں ملازم رہ کر انھوں نے اپنی تحقیقی سرگرمیاں جاری رکھیں یہ بہت بڑی بات ہے دوسرا ہوتا تو کبھی کا تھک کر بیٹھ جاتا ہندوستان کی بیرونی تجارت کو فروغ دینے کے سلسلے میں جاپان، اٹلی، کناڈا، مصر، اور آسٹریلیا وغیرہ میں ان کا قیام رہا جہاں اردو کا نام لینے والا دور دور تک نظر نہیں آتا تھا یہاں رہ کر انھوں نے ادب کی خدمت کی اور اپنے کام کی تکمیل کے لیے دوستوں اور ملنے والوں کو خطوط لکھے اور متعلقہ موضوع پر کتابیں اور تذکرے منگوائے۔ اس طرح کتابوں کے پہنچنے میں خاصا وقت لگ جاتا مگر بے دلی اور ہمت شکنی کا اظہار تک نہ کرتے۔ پہلی بار ۱۹۵۵ء میں ہندوستان لوٹے تو انھوں نے اپنی تمام منتشر یادداشتوں کو عرش ملسیانی مرحوم کے اصرار پر جمع کیا اور ان اوراق کو ترتیب دے کر کاتب کے سپرد کیا۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں دوبارہ باہر

[1] تلامذہ غالب دیباچہ حصہ دوم ص ۶

جانے کے احکام جاری ہو گئے کاتب نے اس کی کتابت میں خاصی تاخیر کردی بہرحال عین روانگی کے دن تلامذۂ غالب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد مالک رام صاحب ۱۹۶۴ء میں ہندوستان واپس لوٹے اس طرح وہ ۲۵ سال تک باہر رہے مختصر یہ کہ وہ غالب کے شاگردوں کی چھان بین کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ غالب کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ صاحب طرز شاعر غالب کے شاگرد ملتے ہیں ان میں تفتہ۔ انور۔ حالی، شاقب، رشکی۔ زکی، سالک۔ سخن۔ شاداں، شیفتہ، عارف، عرشی۔ مجروح اور ناظم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا اپنا الگ الگ رنگ تھا اور صاحب فن استاد تھے۔

مالک رام صاحب "تلامذۂ غالب" کے دوسرے ایڈیشن کے دیباچہ طبع اول میں غالب کے ان چار شاگردوں کی تحقیق کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ غالب کے شاگرد نہیں تھے۔

> "بعض تذکرہ نویسوں نے غالب کے شاگردوں میں کچھ ایسے اصحاب کا ذکر کیا ہے جو میرے نزدیک درست نہیں اس لیے میں نے انھیں اس تذکرے میں شامل نہیں کیا مثلاً نساخ نے میرزا باقر علی خاں کامل کو غالب کا شاگرد لکھا ہے حالانکہ وہ قربان علی خاں سالک کے شاگرد تھے خواجہ عبدالروف عشرت نے نظام رام پوری کو غالب کا شاگرد بیان کیا ہے وہ شیخ علی بخش بیمار کے تلامذہ میں سے تھے صیغم حیدر آبادی اور حسرت موہانی نے منشی بنواری لال شعلہ کو تلامذہ غالب میں شامل کرلیا ہے۔ وہ تفتہ اور بے صبر کے شاگرد تھے۔ ایک جدید تذکرہ (مشرقی بنگال میں اردو) کے مصنف نے سید محمود آزاد (سید محمد ازاد نوابی دربار والے کے بڑے بھائی) کو غالب کا شاگرد لکھا ہے (ص ۲۷-۷۳) یہ بھی ٹھیک نہیں۔" [1]

---

[1] تلامذہ غالب دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۵

بعض تذکرہ نویسوں نے غلطی سے جن شعرا کو غالب کا شاگرد لکھا تھا مالک رام صاحب نے اس کی چھان بین کر کے ان کی صحت کی جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ "تلامذۂ غالب" کے مندرجات سے ذہن میں یہ احساس بھی ابھرتا ہے کہ غالب کی شاعری اور ان کی مجموعی شخصیت ان کے شاگردوں اور دوسرے شعرا کے مقابلے میں کس قدر وسیع اور رنگا رنگ نظر آتی ہے۔ ان ہی عوامل نے غالب کو منفرد شاعر بنا یا۔

"تلامذۂ غالب" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا اس میں ۴۲ تصویریں اور ۱۴۶ شاگردوں کے حالات اور ان کے نمونۂ کلام درج تھے، یہ ایڈیشن ۱۳۱۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ دوسرا ایڈیشن آفسیٹ سے ۱۹۸۴ء میں مکتبہ جامعہ نئی دلی سے شائع ہوا اس میں پہلے ایڈیشن کے مقابلے میں تصویریں زیادہ ہیں اس طرح اس ایڈیشن میں ۴۳ تصویریں شامل ہیں اور شاگردوں کی تعداد بھی ۱۴۶ سے بڑھ کر ۱۸۲ تک پہنچ گئی۔ حالانکہ اس ایڈیشن میں ان دو تین شاگردوں کو مالک رام صاحب نے شامل نہیں کیا جو پہلے ایڈیشن میں تھے یعنی تحقیق کے بعد انھوں نے دوسرے ایڈیشن میں ان کو اس لیے نکال دیا کہ وہ غالب کے شاگرد نہیں تھے۔ اس طرح مالک رام صاحب نے اپنی جانب سے کافی تحقیق اور شواہد کے بعد غالب کے شاگردوں کے حالات یکجا کئے ہیں پھر بھی ہو سکتا ہے آگے چل کر اکا دکا شاعر ایسا نکل آئے جو غالب کا شاگرد نہ ہو۔ غالب کے شاگردوں میں ہر قوم اور مذہب کے لوگ شامل تھے۔ ان کے نزدیک قومیت کا کوئی بھید بھاؤ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہندو شاگردوں کی تعداد خاصی طویل ہے تلامذہ غالب کا پہلا ایڈیشن ایک طرح سے گاؤں تھا جس میں بسنے والے بستی کے ۱۴۶ افراد تھے یہی گاؤں آباد ہوتے ہوتے قصبہ بن گیا اور اب اس میں ۱۸۲ غالب کے شاگرد آباد ہو گئے۔ قصبے کے ان بسنے والوں میں ہر طبقے کے لوگ شامل تھے اس میں غریب، تاجر اور متوسط درجے کے لوگ بھی غالب کے شاگرد تھے مالک رام صاحب نے ان سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے غالبیات میں اہم اضافہ کیا ہے۔ شاگردوں کا جہاں جہاں کلام مل سکا اس میں انھوں نے شامل کر دیا ہے۔ اردو کے تذکروں کے علاوہ گلدستوں میں شاگردوں کے کلام کو تحقیق کر کے نکالا، غالب کے شاگردوں اور ان کے اعزا سے ملنے والوں کی برس ہا برس ٹوہ میں لگے رہے جیسے ہی سراغ ملتا مالک رام صاحب ان سے خط و کتابت کرتے ان سے حالات منگواتے اور کبھی

کبھار ضرورت پڑتی تو خود بھی معلومات فراہم کرنے وہاں پہنچ جاتے۔ پاکستان میں مشفق خواجہ صاحب عبدالسلام خورشید صاحب ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی ڈاکٹر جلیل قدوائی ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم، محمد طفیل مرحوم، ڈاکٹر جمیل جالبی ڈاکٹر فرمان فتحپوری وغیرہ کو خطوط لکھ کر معلومات فراہم کرتے رہے۔ جس طرح "زندگانی بے نظیر" میں عبدالغفور شہباز نے ایک ایک واقعہ کو تلاش اور تحقیق کے بعد درج کیا اور زیادہ تر نظیر کی نواسی ولائتی بیگم عرف بیگم جان سے معلومات فراہم کرکے ان کے نانا جان کو زندہ جاوید کر دیا، اسی طرح مالک رام صاحب نے "ذکر غالب اور تلامذہ غالب" میں غالب اور ان کے شاگردوں کے حالات چھان پھٹکنے کے بعد لکھے اور ان کو ہر طرح سے نتیجہ خیز بنایا۔ مالک رام صاحب کو جب بھی غالب کے کسی شاگرد کے خاندان کا علم ہو جاتا یا کسی قریبی رشتے دار کی اطلاع مل جاتی تو وہ پہلے ان سے رابطہ قائم کرکے انھیں خطوط لکھتے ہیں۔ ان کی اس طرح کی کھوج اور ٹوہ میں لگے رہنے سے ان کو بہت سی ٹھوس معلومات فراہم ہوئیں اور ان کی اس محنت اور توجہ نے کتاب کو وقیع بنایا۔ تحقیق کا یہ رجحان ہمیں دوسروں کے یہاں مشکل سے ملتا ہے۔ مثال کے طور پر کرار نوری صاحب کا ایک واقعہ میرے ساتھ پیش آیا۔ مالک رام صاحب کو کہیں سے یہ سراغ ملا کہ کرار نوری صاحب آگاہ کے پرپوتے ہیں تو انھوں نے مہینوں تک ان سے خط وکتابت کا سلسلہ قائم رکھا۔ اور جب میں ۲۴/دسمبر ۱۹۸۲ء کو اپنے ایک عزیز کی شادی میں کراچی گیا تو جہاں مجھے انھوں نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کو خطوط دیئے ان ہی میں ایک خط نوری صاحب کے نام بھی تھا۔ جو کراچی میں، میں نے انھیں پہنچایا۔ نوری صاحب کراچی میں رہتے ہیں یہ غالب کے شاگرد رشید محمد رضا دہلوی آگاہ کے پرپوتے ہیں۔ آگاہ صاحب دیوان تھے۔ ان کے دو دیوان تھے۔ ایک نعتیہ کلام کا اور دوسرا غزلیات کا، اول الذکر دیوان ایک صاحب ان سے لے کر امریکہ چلے گئے۔ دوسرا غزلیات کا ان کے پاس ہے۔ غزلیات کا یہ دیوان ۸۵ صفحات (فل اسکیپ سائز) کو محیط ہے۔ ہر صفحے میں ۱۹، ۲۰ شعر ہیں۔

انھوں نے آگاہ کے دیوان کا عکس مجھے دینے کا وعدہ کیا وہ میرے ہندوستان روانہ ہونے سے پہلے ایک دن میری قیام گاہ پر آگاہ کے دیوان کا عکس دے گئے، اور میں نے واپس آکر مالک رام صاحب کے سپرد کیا۔ مالک رام صاحب کو نئے مواد کی تلاش میں جب کامیابی ہو جاتی ہے، تو وہ بے حد خوش ہوتے ہیں یہی ان کا سب سے بڑا انعام ہے غرض اس طرح سے مالک رام صاحب کی جدوجہد نے "ذکر غالب" اور

"تلامذۂ غالب" کو معرکہ خیز بنایا۔

سوانحی تحقیق کے ذیل میں، میں نے اوپر "ذکر غالب" اور "تلامذہ غالب" کا جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ دونوں غالبیات کے سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ان کے علاوہ سوانحی تحقیق کے تحت "تذکرۂ معاصرین" کی چاروں جلدوں کو بھی شمار کر سکتے ہیں۔ "تذکرہ معاصرین" ایک طرح سے مرنے والوں کا تذکرہ ہے۔ یہ چاروں جلدیں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۷ء تک وفات پانے والے ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، تنقید نگاروں، ڈراما نگاروں اور ناول و افسانہ نگاروں سے متعلق ہیں جن میں ان کے حالات نہایت دلچسپ اور شگفتہ انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان تذکروں میں انھوں نے ادیب یا شاعر کے خاندانی حالات کی تفتیش جس گہرائی کے ساتھ کی ہے وہ استناد کا درجہ رکھتی ہے وہ جس واقع کو بیان کرتے ہیں اس کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور کوئی بات تشنہ نہیں چھوڑتے قدیم تذکروں کی تعداد خاصی طویل ہے جن میں شاعروں کے حالات نہایت مختصر اور تشنہ ملتے ہیں لیکن نثر نگاروں کے تذکروں کی تعداد بہت کم ہے، خاص کر "تذکرہ معاصرین" جیسے انداز پر جس میں معاصرین کے خاندان کے حالات کا پورا شجرہ تحقیق کی روشنی میں بیان کیا گیا ہو، واحد تذکرہ ہے جو بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ معاصرین پر لکھنا آسان نہیں اور یہ اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب وہ زندہ نہیں ہوتے۔ وفیات کے ایسے تذکرے کی مثال جن میں خاکہ نگاری کی دلچسپیاں بھی شامل ہوں ہمیں دوسری جگہ نہیں ملتی۔ اس کے ذریعہ بہت سے ایسے اہل قلم کے حالات اور کلام کے انتخاب ان جلدوں میں محفوظ ہو گئے جنھوں نے مختلف اصناف پر کام کیا تھا۔ مولوی عبدالحق اور رشید احمد صدیقی نے "چند ہم عصر" اور "ہم نفسان رفتہ" میں جو خاکے لکھے ہیں اس میں کندن اور نورخاں کے سنہ پیدائش اور سنہ وفات سے قاری کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن مالک رام صاحب نے ان دونوں کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور ادیبوں اور شاعروں وغیرہ پر جو خاکے لکھے ہیں ان میں دلکشی کے وہ تمام پہلو نمایاں نظر آتے ہیں جن سے وہ عبارت ہیں۔

اچھی سوانح عمری کی خوبی یہ ہے کہ جس طرح کے سوانح بیان کیے جائیں اس کی تمام خوبیاں ہمارے سامنے اس طرح آجائیں جیسے وہ شخص ہمارے درمیان موجود ہے۔ مالک رام صاحب کی "ذکر غالب" اور "تلامذہ غالب" اس پر پوری اترتی ہے۔

بحیثیت محقق اور ماہر غالبیات مالک رام صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ "ذکر غالب" اور "تلامذہ غالب" ان کی علمی اور تحقیقی کتابیں ہیں ریٹائر ہونے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جیسے علم شناس نے ان کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کی از سرِ نو ترتیب کے لیے ساہتیہ اکاڈمی میں بلالیا یہاں رہ کر مولانا آزاد کی کئی تصانیف کی ترتیب و تدوین کی جن میں "غبارِ خاطر" "تذکرہ خطبات آزاد" اور "ترجمان القرآن" کی آخری دو جلدیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں یہاں سے از خود علیحدگی اختیار کرکے ایک تجارتی ادارے کے مینجنگ ڈائرکٹر ہوگئے اور ابھی تک اس ادارے سے وابستہ ہیں۔ آج کل مرکزی دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی کے صدر ہیں۔ غرض یہ کہ مالک رام صاحب ہمارے بزرگ ترین محقق ہیں اور خدا کے فضل سے وہ اب ۸۰ سال پورے کر چکے ہیں۔ یہ اسّی سالہ زندگی انھوں نے جس فعال انداز سے گزاری ہے اس کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔

ڈاکٹر محمد ایوب تاباں

مالک رام کی اردو خدمات

حضرت سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری جو متحدہ پنجاب میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہوئے ہیں، پاکستانی پنجاب کے ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ حضرت نوشہ صاحبِ دل اور صاحبِ علم بزرگ تھے۔ شاعری ان کے لیے نہ تو عزت کا سبب تھی اور نہ حصول معاش کا ذریعہ ۔ معاشرے کے مختلف مسائل اور ان کے حل کے سلسلے میں جو خیالات ذہن میں آتے تھے اُن کو وہ شعر کا جامہ اس طرح پہناتے تھے کہ اس میں استدلال کا رنگ نمایاں رہتا ۔ حضرت نوشہ کے فیض سے اس علاقے کے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں اصلاحی خیالات کو رواج ہوا اور ان کا اثر دیرپا ثابت ہوا۔

پاکستانی پنجاب کے ضلع گجرات کا امتیاز یہ ہے کہ متحدہ پنجاب کا اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر یہیں پیدا ہوا تھا۔ اسی ضلع گجرات کے ایک کھتری گھرانے میں وہ ہونہار بچہ پیدا ہوا، جس نے حقیقت کی تلاش اور جستجو کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لیا اور دنیائے ادب اردو میں مالک رام کے نام سے معروف ہوا۔ آج مالک رام دنیائے ادب کی سب سے بزرگ شخصیت کا نام ہے۔ مالک رام صاحب ادیب، خاکہ نگار، نقاد، محقق ماہرِ غالبیات اور ماہرِ اسلامیات ہیں۔

انیسویں صدی کے رُبع اول میں شہر گجرات میں ایک بزمِ ادب قائم تھی، جس میں ہر ہفتہ طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ مالک رام نے بھی ان مشاعروں کے لیے چند غزلیں لکھیں ــــ یہ مالک رام کی ابتدائی کوشش تھی۔ جلد ہی اُن کا رجحان نثر نگاری کی طرف منتقل ہوگیا اور انھوں نے انتہائی دل جمعی کے ساتھ نثر لکھنا شروع کر دی۔

مالک رام کی ابتدائی تعلیم ضلع گجرات کے موضع پھالیہ اور بعد میں لاہور میں ہوئی

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد پہلے بسلسلۂ ملازمت دہلی میں منتقل ہوئے اور آج دہلی وطن ثانی کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ لیکن ملازمت کے سلسلے میں، مالک رام مصر عراق، ترکی، بیلجیم وغیرہ مختلف ممالک میں رہے اور سرکاری طور پر انھیں فلسطین، سوڈان لبنان، افغانستان، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، انگلینڈ اور سوئزرلینڈ وغیرہ کی سیاحت کے مواقع بھی ملے۔ مالک رام نے دنیا کی کئی بڑی زبانوں سے واقفیت حاصل کر لی اور ان کے تجربوں اور مشاہدوں میں بھی غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی۔

مالک رام مزاجاً علم دوست شخصیت ہیں۔ اسکول اور کالج میں اگرچہ مختلف قسم کے ہندوستانی، انگریزی کھیلوں سے بھی دلچسپی لیتے رہے ہیں، لیکن بچپن سے ہی کتابوں سے انھیں غیر معمولی رغبت اور دلچسپی رہی ہے اور علم وادب کا شوق ان کی زندگی میں ہر شوق پر غالب رہا ہے۔ مغربی ممالک میں قیام کے باوجود، وہ منشیات کی طرف مائل نہ ہو سکے۔ شراب تو کیا وہ سگریٹ بھی نہیں پیتے۔ اس پاک صاف زندگی ہی کا یہ فائدہ ہے کہ ان کا جسم اس پیرانہ سالی کے باوجود صحت مند اور توانا ہے اور ان کی فکر بھی واضح اور صالح ہے۔

مالک رام نے نثر نویسی کی ابتدا ایک ترجمے سے کی تھی۔ ترجمے سے ان کا مقصود بعض عمدہ خیالات کو اپنے ہم وطنوں میں عام کرنا تھا پھر اسی جذبے نے انھیں خوب سے خوب ترکی جستجو کی راہ دکھائی۔ اپنے ابتدائی زمانے میں انھیں جن اہلِ علم سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا ان میں غلام رسول مہرؔ، عبدالمجید سالکؔ، یاسؔ یگانہ چنگیزی اور مولوی مہیش پرشاد خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب ہی وہ لوگ تھے جن کو شاید غالب کے طرفدار کہنا غلط نہ سمجھا جائے چنانچہ مالک رام بھی اردو کے اس عظیم شاعر سے دلچسپی لینے لگے۔

مالک رام نے سب سے پہلے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے کلام کے ایک مختصر مجموعہ "سبد چین" کو سب سے پہلے مرتب کیا تھا اس مجموعے کی اشاعت مکتبہ جامعہ دلّی کی طرف سے ۱۹۳۸ء میں عمل میں آئی تھی۔

کلامِ غالبؔ کے اسی مجموعے کے لیے مقدمہ کے طور پر انھوں نے غالبؔ کا تعارف لکھا۔

اس کی ضخامت خاصی زیادہ ہو گئی تھی اس لیے مالک رام نے اسے 'ذکرِ غالب' کے نام سے ایک الگ کتاب کی حیثیت سے مرتب کر دیا۔ ذکرِ غالب' کو بھی مکتبہ جامعہ دلی نے اسی سال یعنی ۱۹۳۸ء میں چھپوا کر شائع کر دیا۔ ذکرِ غالب' کی اشاعت نے مالک رام کو بہت شہرت عطا کی۔ اب مالک رام کے حوصلے اور بھی زیادہ ہوئے اور انھوں نے محنت و مطالعہ سے غالبیات کو اپنے لیے مختص کر لیا۔

مولوی مہیش پرشاد نے بڑی محنت اور تلاش سے غالب کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد وہ ان حضرات کے حالات زندگی کی فراہمی میں مصروف تھے جو غالب کے مکتوب الیہ تھے۔ مولوی مہیش پرشاد کے انتقال کے بعد جناب مالک رام نے ان کے کام کو آگے بڑھایا اور غالب کے شاگردوں کے حالات لکھ کر سہ ماہی' اردو ادب" علی گڑھ میں بالاقساط شائع کرائے۔ افادیت کے پیش نظر اس تذکرے کو ۱۹۵۸ء میں 'تلامذۂ غالب' کے نام سے ادارۂ تصنیف و تالیف نکودر نے کتابی صورت میں چھپوا دیا۔ "تلامذۂ غالب" کی اشاعت کے بعد عام طور سے مالک رام کو ماہرِ غالبیات تسلیم کر لیا گیا۔

انجمن ترقی اردو ہند کی درخواست پر انھوں نے مولوی مہیش پرشاد کے 'خطوط غالب' کو اضافے اور تصحیح کے ساتھ نئے سرے سے مرتب کیا۔ اب یہ مجموعہ خاصا ضخیم ہو گیا تھا۔ غالباً یہی سبب ہوا کہ انجمن کے کار پردازوں نے اس میں ان مقدمات کو شریک نہیں کیا جو پہلی اشاعت میں شامل تھے۔ جس کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلط فہمی کا شکار ہو گئے۔

خطوطِ غالب کی اشاعت کے بعد مالک رام نے دیوان غالب اور گلِ رعنا کو بھی مرتب کر کے شائع کیا۔ غالب کے حالات اور کلام پر مشتمل ایک کتاب مرزا غالب کے نام سے بھی چھپوائی۔ اپنے سہ ماہی رسالہ 'تحریر' کے غالب نمبر کو بھی انھوں نے "عیار غالب" کے نام سے کتابی صورت دی۔

ان مختلف اور متعدد کتابوں کو جو غیر معمولی شہرت ملی ہے اس نے اکثر لوگوں کو اس

غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ مالک رام نے جو کچھ لکھا ہے وہ غالب ہی سے متعلق ہے لیکن یہ بات، بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ علم کے اس دیوانے اور وسیع المطالعہ شخص نے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جن پر بعض مخصوص لوگوں کا اجارہ خیال کیا جاتا ہے اس سلسلے میں ان کی دو کتابیں "عورت اور اسلام" اور "ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال" خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

غالبیات کے علاوہ تذکروں سے بھی مالک رام کی دلچسپی غیر معمولی رہی ہے انھوں نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ فارسی اور اردو کے قدیم تذکروں کا بخوبی مطالعہ کیا ہے اور دوسروں کو تذکروں کے مطالعہ ترتیب اور اشاعت کی ترغیب دی ہے بلکہ خود بھی چند تذکرے مرتب کر کے شائع کئے ہیں وہ "تذکرہ معاصرین" کے نام سے وفات پانے والے شاعروں اور ادیبوں کا تذکرہ لکھ دیے۔ اس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

عام طور سے محققین کو گورکن کہا جاتا ہے اس کی وجہ ہے کہ ان حضرات کو صرف متقدمین اور مرحومین سے دلچسپی ہوتی ہے اور جدید یا ہمعصر ادب اور اس کے تقاضوں سے یہ لوگ عموماً غافل ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مالک رام کی شخصیت غالباً مستثنیٰ ہے انھوں نے اپنے ہم عصروں کے علمی کارناموں سے بھی دلچسپی لی ہے۔ مثال کے طور پر سہ ماہی تحریر کا شمارہ نمبر ۲۹ (جولائی، ستمبر ۱۹۷۴ء) ل احمد اکبرآبادی نمبر علمی مجلس دلی کے تعاون اور مالک رام کے اشتراک سے بڑی آب و تاب کے ساتھ ل احمد اکبرآبادی کی حیات میں ہی شائع ہوا تھا جس میں خود ل احمد اکبرآبادی کی خود نوشت سوانح حیات "میری سرگزشت" شائع ہوئی تھی اس کے علاوہ ملک کے بیشتر سرکردہ ادیب حضرات کے مضامین بھی شائع ہوئے تھے۔ ایک ہمعصر ادیب سے متعلق اتنا کامیاب نمبر شائع کرنے اور مناسب ترین ترتیب دینے کا سہرا مالک رام کے سر ہے اور "روایت سے بغاوت" کی ایک عمدہ مثال ہے۔

مثال کے طور پر انھوں نے پروفیسر مختار الدین آرزو کے تعاون سے اردو کے صف اول کے محقق مولانا امتیاز علی عرشی کی خدمت میں پیش کئے جانے کے لیے ایک ضخیم کتاب

نذرِ عرشی" کے نام سے مرتب کی اور اسی سال یعنی ۱۹۶۵ء میں فضل علی خاں فضلی کی ایک نادر تصنیف "کربل کتھا" کو بھی اس کے متن کی تصحیح کرکے چھپوادیا۔ اس سلسلے کی ان کی ایک اور کتاب "جگر بریلوی، شخصیت اور فن" بھی ہے جسے انھوں نے ڈاکٹر سیفی پریمی کی مدد سے مرتب کیا ہے۔

اوپر ہم نے ان کی صرف کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے جملہ علمی اور تحقیقی مقالات کی کہ جو ملک کے اندر اور ملک کے باہر مختلف معیاری جریدوں میں اشاعت پذیر ہوئے ہیں صرف اگر فہرست تیار کی جائے تو ایک کتابچہ تیار ہوجائے گا۔ اتنی کثیر تعداد میں جناب مالک رام کی تصانیف اُردو اس اعتبار سے بھی حیرت انگیز ہے کہ وہ اپنی زندگی کے بیشتر حصے میں حصول معاش کے لیے مختلف ملازمتوں اور ایسے کاموں میں مصروف رہے ہیں جن کا علم و دانش اور تصنیف و تالیف سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے مثال کے طور پر گزشتہ برسوں میں، سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ایک لمبے عرصے سے وہ جالندھر موٹر ایجنسی لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر رہے ہیں اور ساتھ ہی زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

یہ تو سچ ہے کہ اردو دنیا نے اپنے اکثر محسنوں کی قدر بعد از مرگ ہی کی ہے لیکن مالک رام ان خوش بختوں میں سے ہیں جن کے علمی کارناموں کا اعتراف مختلف انداز سے ہی کیا جاتا رہا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ مختلف علمی و ادبی اداروں نے وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں مختلف انعامات پیش کرکے اپنی علم دوستی کا ثبوت پیش کیا ہے ۱۹۷۱ میں مجلس ارمغان مالک، نئی دہلی کی طرف سے ارمغانِ مالک، نامی نہایت شاندار اور ضخیم جلدیں ان کی نذر کی گئی تھیں۔

زمانہ طالب علمی سے آج تک جو مختلف انعامات اور اعزازات جناب مالک رام کی خدمت میں پیش کیے جا چکے ہیں ان کی مختصر روداد حسب ذیل ہے۔

کلائی گھڑی (رسٹ واچ) ایف۔ اے کی طالب علمی کے زمانے میں کالج فنکشن میں ملی۔

گل رعنا پر حکومت یو پی سے ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۱ء

تذکرۂ معاصرین اوّل پر یو پی سے ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۳ء

وہ صورتیں الٰہی پر یو پی اردو اکیڈمی ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۴ء

تذکرۂ معاصرین جلد دوم پر بہار اردو اکاڈمی پٹنہ ایوارڈ ملا۔ ۱۹۷۵ء

ساہتیہ کلا پریشد دلّی نے اردو ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۵ء

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلّی نے مودی غالب ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۶ء

میرا کاڈمی، لکھنؤ نے امتیاز میر ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۷۷ء

میرا کاڈمی لکھنؤ نے افتخار میر ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۸۱ء

تذکرہ معاصرین جلد سوم پر اردو اکاڈمی لکھنؤ نے ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۲ء

تذکرہ معاصرین جلد چہارم پر ساہتیہ اکاڈمی نے ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۳ء

تلامذہ غالب پر اردو اکاڈمی دلّی نے ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۴ء

بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ نے اردو خدمات کے لیے ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۵ء

اب جب کہ جناب مالک رام نے اپنی عمر عزیز کے اسّی برس پورے کر لیے ہیں اور وہ اس وقت اردو ادب کے نہایت اہم اور غالباً سب سے بزرگ ادیب ہیں یہ جشن مالک رام کی مجلس ایک بار پھر ان کی علمی و ادبی فتوحات کا اعتراف کرنے کے لیے وجود میں آئی ہے، ہمیں اس بات کا یقین محکم ہے کہ یہ اعتراف جناب مالک رام کے شایان شان ہوگا۔

شیخ سلیم احمد

غالب شناس مالک رام

ذکرِ غالب' مالک رام کی غالب شناسی کی شہرت کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں چھپی تھی میں نے اسے زمانہ طالب علمی میں پڑھا تھا اور اس وقت یہ تاثر قائم ہوا تھا کہ ہرگوپال تفتہ' خوب چند ذکا یا میر مہدی مجروح کی طرح مالک رام بھی مرزا غالب کے ہم عصر ہیں' انھوں نے غالب کی زندگی کے چشم دید حالات لکھے ہیں جنھیں پڑھکر غالب کی زندگی اور ان کے عہد کی چلتی پھرتی تصویر نگاہوں کے سامنے گھوم جاتی ہے۔ ایک عرصہ کے بعد دلّی آیا مالک رام کو کسی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا تو حیرانی ہوئی اور خوشی بھی کہ غالب کے ہم عصر سے میری بھی ملاقات ہو گئی۔ اس وقت سوچا تھا کہ محقق ہیں مشاہیر کی پیدائش و عمر کا حساب کتاب درست کرتے ہیں۔ اپنی عمر کے اعداد و شمار میں بھی دو چار دہے کا اضافہ کرلیا ہوگا۔ یہ دہے آج تک ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ حقیقت بھی بعد میں آشکارا ہوئی کہ پہلی بار جب ان کو صدارت کا فریضہ انجام دیتے دیکھا تھا تو وہ محض کوئی اتفاقی امر نہیں تھا بلکہ صدارت ان کے فرائض منصبی میں سے ہے۔

غالب کی طرح مالک رام اپنی زندگی ہی میں لیجنڈ بن گئے ہیں۔ وہ مشہور عالم' مفکر' دانشور اور محقق ہیں۔ علم کی چاروں کھونٹ گھوم آئے ہیں۔ ان کھونٹوں کی بھی سیر کر آئے ہیں جو ممنوعہ ہیں وہ غالبیات سے لیکر اسلام میں عورت شناسی تک کی آزمائش سے گزرے ہیں لیکن ان کی شہرت و مقبولیت غالب شناسی کی مرہون منت ہے۔ ابتدائے جوانی میں ہی انھوں نے غالب کا دامن تھاما تھا اور آج تک اسی سے لپٹے ہوئے ہیں۔ دونوں میں ایسی گہری دوستی قائم ہوئی ہے کہ باہم اس طرح شیر و شکر بن گئے کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ مرزا غالب' مرزا رام اور مالک رام' غالب رام نظر آتے ہیں۔

رشتہ درگردنم افگندہ دوست　　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

غالب نے اپنے سفر کلکتہ کے دوران قتیل کا نام سنکر ناک بھوں چڑھائی تھی اور کہا تھا کہ قتیل کون ؟ وہی فرید آباد کا کھتری بچہ" ایں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔ مرزا غالب کو کیا معلوم تھا کہ (اگر معلوم ہوتا تو ناک بھوں نہ چڑھاتے) ایک دن اسی قتیل کی برادری سے تعلق رکھنے والا اور پنجاب کا باشندہ کھتری بچہ" مالک رام۔ یہ بچہ اُن کے نام کو چار چاند لگائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ غالب کا سہارا لے کر اس کھتری بچہ" نے اپنے نام میں کہیں زیادہ چاند ستارے ٹانک لیے ہیں۔

دراصل فن تحقیق کے ماہرین کے لیے کچھ معاملات تحقیق طلب ہیں۔ مثلاً یہ کہ مالک رام نے اپنی تحقیق کے لیے غالبیات ہی کو کیوں چنا ؟ اس کے پیچھے کوئی سوچی سمجھی سازش معلوم ہوتی ہے۔ انسان کو اپنی پیدائش پر اختیار نہیں لیکن مالک رام کو اپنی پیدائش پر بھی اختیار تھا تبھی تو وہ سمجھ کر دسمبر میں پیدا ہوئے چونکہ مرزا غالب بھی دسمبر میں پیدا ہوئے تھے (عالم ارواح میں غالب کے ساتھ معاہدہ کیا ہو گا) اس سازش میں مالک رام کے ساتھ شاید قدرت بھی شریک نظر آتی ہے۔ غالب کے آبا و اجداد کا پیشہ سو پشتوں سے سپہ گری رہا۔ ان کے خاندان میں علمی و ادبی روایت نہیں ملتی۔ مرزا غالب نے قلم سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اسی طرح مالک رام کے اجداد بھی صدیوں سے کھیتی باڑی سے اپنی روزی روٹی پیدا کرتے رہے ان کے خاندان میں بھی خود مالک رام سے علمی روایت کا آغاز ہوتا ہے۔

دونوں کے مذہبی عقائد مشتبہ لیکن دونوں مذہب انسانیت کے کٹر پیروکار۔ مالک رام اپنی وضع قطع اور رہن سہن میں متقی و پرہیز گار مسلمان نظر آتے ہیں۔ اسلام کی تلاش میں اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا اسلام پر مضامین لکھے۔ مرزا غالب جب انگریز افسر کے سامنے پیش ہوئے تو کہا کہ آدھا مسلمان ہوں چونکہ شراب پیتا ہوں سور نہیں کھاتا۔ مرنے کے بعد اہل تشیع مرزا کی تجہیز و تکفین شیعہ طریقے پر کرنا چاہتے تھے۔ ایک سرپھرے نے تو ان کو فری میسن تک کہہ دیا تھا مالک رام کا معاملہ بھی اپنے مخدوم سے کچھ مختلف نہیں موت برحق ہے۔ مالک رام کے لیے ہماری زبان سے یہی کلمۂ دعائیہ نکلتا ہے کہ

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

لیکن ہم میں سے کتنوں کی خواہش ہوگی کہ ان کے انتقال کے بعد انہیں مرزا غالب کے برابر ہی دو گز زمین دیدی جائے۔ ان کے بعد پہلے محققین کا ایک کمیشن یہ طے کرنے کے لیے بیٹھایا جائے گا کہ

مالک رام مسلمان تھے کہ ہندو۔

دونوں خوش نصیب تھے کہ ان کی زندگی میں انھیں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ دیوانِ غالبؔ کے پانچ اڈیشن غالبؔ کی زندگی میں چھپ گئے تھے۔ مالک رام کی کتاب 'ذکرِ غالب'، جو ان کی شہرت کا باعث بنی پانچ بار چھپ چکی ہے۔ دونوں ہم عصروں کی دشنام طرازیوں اور مخالفتوں کو بھی جھیلتے رہے۔ اگرچہ مرزا غالب یہ شکوہ کرتے رہے کہ "میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں"۔

وہ زندگی بھر خالی مشکلات سے بھی لڑتے رہے۔ مادّی آسائش انھیں کم ہی نصیب ہوئی۔ لیکن مالک رام کو زمانہ سے ناقدری کا بھی گلہ نہیں اور نہ ہی انھیں غالبؔ کی طرح عسرت و تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا مرزا غالب کے زمانہ میں شیرس Shares خریدنے و بیچنے کا کاروبار شروع نہیں ہوا تھا ورنہ تو وہ شیرس میں پیسہ لگا دیتے یا کسی موٹر کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر بن جاتے تو ان کی زندگی بھی مالک رام صاحب کی طرح آرام سے گزر جاتی۔

مالک رام نے تقریباً نصف صدی غالبؔ کی صحبت میں گزار دی۔ وہ یہ طے کرتے رہے کہ غالبؔ کی تاریخ پیدائش کیا تھی، کب انتقال ہوا تھا، انھوں نے سکّہ لکھا تھا کہ نہیں، انہیں پنشن کتنی ملی غالبؔ کی کونسی مہر گول تھی، کونسی چوکور، غالبؔ کی غیر مطبوعہ تحریریں کہاں کہاں ہیں؟ کونسے خطوط جعلی ہیں وغیرہ۔ وہ یہ سب لکھ کر غالبیات کے ماہر کہلائے۔ غالبؔ شناس مشہور ہوئے۔ لیکن انھوں نے غالبؔ کی دوستی کا صحیح معنوں میں حق ادا نہیں کیا۔ انھوں نے دوست کا ساتھ نہیں دیا ثقہ و پاک باز ہی بنے رہے۔ اپنا دامن تر نہیں ہونے دیا ہم تو تب جانتے کہ وہ غالب کی آواز میں آواز ملا کر کہتے ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست اور دوستی کا حق ادا کرنے کے لیے غالبؔ کی طرح جام پر جام الٹھاتے۔ خوباں سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔ گھر پر جوئے کی محفلیں سجاتے۔ کسی خوبصورت بیوہ کو بھگا لے جاتے ایک آدھ بار (علامت کے طور پر ہی سہی) جیل بھی ہو آتے۔ یہاں ان کی غالب دوستی اور غالب شناسی پر حرف آتا ہے۔ ہم تو تب جانتے کہ ایک دن اخباروں میں خبر چھپتی کہ مشہور غالب شناس مالک رام شراب خانہ سے جھومتے ہوئے نکلے اور کسی سراپا ناز کے ساتھ پیش دستی کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ کیا مزا آتا کس طرح لوگ چہ مہ گوئیاں کرتے مہینوں چٹخارے لے لیکر اس کا ذکر کرتے۔ کہتے ہیں تخم تاثیر صحبت کا اثر۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ مالک رام ان اثرات سے محفوظ رہے ہوں انہوں نے کچھ نہ کچھ حرکتیں ضرور کی ہوں گی لیکن

شاید چپکے چپکے۔ فن تحقیق کے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو مالک رام کی زندگی کے ان گوشوں سے پردہ اٹھائے جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ انھوں نے شراب پی ہے اور عشق بھی کیا ہے۔ تب تک ان کی غالب شناسی غیر معتبر سمجھی جائے اور ان کی تمام تصانیف بحق سرکار ضبط کر لی جائیں۔

مرزا غالب جب تک زندہ رہے اپنے وجود کا احساس دلاتے رہے۔ جہاں بھی رہے اور جہاں بھی گئے رونق محفل بنے رہے۔ ان کے اپنے عہد میں کوئی بھی شخص ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنے عہد پر چھائے رہے۔ ان کی زندگی خود اپنے عہد کا ایک آئینہ ہے اور جس کے اوراق پر اس دور کی کہانی لکھی ہوئی ہے۔ مالک رام بھی اپنے ممدوح کی طرح اپنے زمانہ کی دھڑکنوں میں بسے ہوئے ہیں۔ آج کے اردو منظر نامہ کا کوئی بھی بیان مالک رام کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔ اپنے دور پر ان کی گہری چھاپ ہے۔ اپنے ممدوح مرزا غالب کے مقابلہ میں بس ایک آنچ کی کمی رہ گئی کہ انہوں نے شراب نہیں پی جوا نہیں کھیلا۔ اور غالباً کسی نازنین سے عشق بھی نہیں لڑایا۔ واللہ عالم بالصواب۔

مالک رام جب خدا کے حضور جائیں گے تو ان کا اعمال نامہ ایک کورا کاغذ ہوگا۔ مرزا غالب کی طرح وہ یہ کہنے کا حوصلہ نہ)

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

مالک رام

معاصرین

کی

نظر میں

ڈاکٹر سید عابد حسین
پروفیسر آل احمد سرور
سید صباح الدین عبدالرحمٰن
پروفیسر جگن ناتھ آزاد
پروفیسر مختار الدین احمد
جسٹس ہدایت اللہ
پروفیسر گیان چند
علی جواد زیدی
پروفیسر نثار احمد فاروقی
پروفیسر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر خلیق انجم
پروفیسر اسلوب احمد انصاری
دوارکا داس شعلہ
ایم۔ حبیب خاں

مرتّبہ

شاہد علی خاں

ڈاکٹر سیّد عابد حسین

ارباب نظر کے ایک چھوٹے سے حلقے میں تو غالب اپنی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے لیکن جسے قبولِ عام کہتے ہیں وہ ان کو ایک مدّت تک حاصل نہیں ہوا ان کے کلام کی صحیح قدر لوگوں کو اس وقت معلوم ہوئی جب مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر اپنے ہم عصروں کے مذاقِ شعر کو نتھارا اور "یادگارِ غالب" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اس نتھرے ہوئے مذاق کی تسکین غالب کے کلام سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ انگریزی دانوں میں غالب کا چرچا زیادہ تر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے اور دیوانِ غالب کے برلن ایڈیشن اور چغتائی ایڈیشن کی بدولت ہوا۔ پچھلی چوتھائی صدی میں اقبال کی شہرت اور مقبولیت نے پچھلے شاعروں کے نقش کو اگر مٹایا نہیں تو مدھم ضرور کر دیا لیکن غالب کا نقش اتنا گہرا اور روشن تھا کہ اس کی آب و تاب میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

غالب کی عظمت کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے، کہ جتنی اچھی اور اونچے درجے کی کتابیں ان کی زندگی اور شاعری پر لکھی گئیں، اتنی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئیں۔ حالی کی "یادگارِ غالب" سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ برابر جاری رہا۔ اس کی وہ کڑیاں جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں غلام رسول مہر صاحب کی "غالب" محمد اکرام صاحب کی معرکے کی تصنیف "غالب نامہ" اور مالک رام کی "ذکرِ غالب" ہے۔ جس کا نیا ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے یہ اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام صاحب نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہے جو کہیں اور نہیں ملتیں پہلا ایڈیشن بھی اس لحاظ سے کچھ کم امتیاز نہیں رکھتا تھا اور موجودہ ایڈیشن میں تو ایسے مفید اضافے ہوئے ہیں کہ اہلِ ذوق کی نظر میں کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس پُر آشوب زمانے میں بھی جو علم و ادب کی کساد بازاری کا دور ہے "ذکرِ غالب" ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

پروفیسر آل احمد سرور

اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کر دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔ دوسرے انہوں نے غالب پر جو تحقیق کی ہے اس کی وجہ سے غالبیات میں

ان کا نہایت بلند مقام ہے۔ ذکرِ غالب اور تلامذۂ غالب کے علاوہ دیوانِ غالب کا وہ ایڈیشن
جو آزاد کتاب گھر سے شائع ہوا اُن کی نظر کی گہرائی اور ذوقِ سلیم دونوں کا غیر فانی نقش ہیں۔ ان
کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ہمعصروں کے کام کا مناسب اعتراف کرتے ہیں اور ان کی مدد
کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ خطوطِ غالب کے نئے ایڈیشن کی تیاری آسان نہ تھی۔ غلام رسول
مہر نے اس عرصے میں ان خطوط سے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے دو جلدوں میں غالب کے خطوط یکجا
کردئے تھے۔ پھر کچھ نیا مواد بھی سامنے آیا تھا۔ مگر مالک رام صاحب نے نہایت جانفشانی سے سارے
کام کا جائزہ لیا جہاں جہاں ضروری سمجھا اہم واقعات کی صحت کی۔ جہاں اضافہ مناسب معلوم ہوا اضافہ
کیا اور اس طرح ایک ایسا ایڈیشن تیار کردیا جسے فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح نہ صرف
غالب کے ان خطوط کا ایک صحیح ایڈیشن تیار ہوگیا بلکہ مولوی مہیش پرشاد مرحوم کے کام کا بھی مناسب
اعتراف ہوگیا اور اس طرح چراغ سے چراغ جلنے کی روایت بھی تازہ ہوگئی۔

غالب کی تحریروں کا ایک ایک لفظ اہلِ نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے ان خطوط کا مطالعہ تو ان کی
شخصیت مزاج کردار حالات اور ادبی ذوق کو سمجھنے کے لئے ناگزیر ہے۔ غالب کی شاعری میں عظمت
ہے۔ ان خطوں میں وہ بے تکلفی اور سنگت ہے جس کی وجہ سے غالب آج اردو دنیا میں سب سے
زیادہ محبوب ہیں

صباح الدین عبدالرحمٰن

۱۹۵۸ء میں مالک رام صاحب نے دیوان غالب اُردو کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا غالباً اسی سال انہیں نظر
ثانی کرنی پڑی۔ اس کے شروع میں ایک بسیط مقدمہ ہے جو محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ
یہ ہے۔

غالباً دس گیارہ برس کی عمر میں اچھے خاصے شعر کہنے لگے تھے۔ انہوں نے اپنا منتخب کلام ۱۸۳۳ء
سے پہلے مرتب کرلیا تھا لیکن چھپنے کی نوبت ۱۸۴۱ء میں آئی۔ دیوان کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں سرسید
احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان بہادر کے قائم کردہ مطبع سید الاخبار میں چھپا اس میں ۱۰۸
صفحے تھے۔ اس میں نواب ضیاء الدین احمد خان کی تقریظ بھی تھی۔ اس میں (۱۰۹۵) اشعار تھے۔ دیوان کا
دوسرا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں دہلی کے مطبع دار السلام میں چھپا۔ اس سے پہلے اسی سے ۱۸۴۵ء میں مرزا

کے دیوان فارسی کا پہلا ایڈیشن چھپ کر شائع ہوچکا تھا۔ اردو دیوان کے دوسرے ایڈیشن میں (۱۱۱۱) اشعار تھے۔ تیسرا ایڈیشن مطبع احمدی، دہلی میں ۱۸۶۱ء میں چھپا، اس میں (۱۷۹۶) اشعار تھے یہ نسخہ بہت غلط چھپا تھا۔ اس لیے اسی کا تصحیح شدہ ایڈیشن جون ۱۸۶۲ء میں مطبع نظامی کانپور میں شائع ہوا۔ اس ایڈیشن میں نیر درخشاں کی تقریظ بھی شامل ہے۔ اس کی کتابت بہت خوش خط اور ترتیب اور تقسیم دیدہ زیب تھی اس میں (۱۸۰۲) اشعار تھے۔ ۱۸۶۳ء میں ذوق، غالب اور مومن کے کلام کا انتخاب ایک ساتھ شائع ہوا۔ درمیان میں غالب کا اور دائیں بائیں ذوق اور مومن کا کلام درج کیا گیا تھا۔ اس میں غالب کا سارا کلام مطبع احمدی کے ۱۸۶۱ء والے نسخے سے نقل ہوا ہے۔ اس مجموعے کا نام "نگارستان سخن" ہے اس میں پہلی مرتبہ غالب کا سہرا شائع ہوا غالب کے کلام کا ایک اور ایڈیشن آگرہ میں منشی شیو نرائن کے مطبع مفید خلائق میں ۱۸۶۳ء میں چھپا اس میں (۱۷۹۵) اشعار تھے یعنی مطبع احمدی کے نسخے سے ایک کم۔ غالب کی زندگی میں ان کے کلام کے صرف یہی ایڈیشن شائع ہوئے۔

مولانا عرشی کا یہ خیال ہے کہ میرزا کے اردو کلام کو بہ ترتیب ردیف جمع کرنے کا کام ۴ ارجب ۱۲۳۱ھ (۱۱ جون ۱۸۱۶ء) کو سرانجام ہوچکا تھا۔ آئندہ انہوں نے اپنے کلام میں کمی بیشی کا سلسلہ جاری رکھا، تا آن کہ متداول دیوان وجود میں آیا۔ فارسی نظم کا کچھ حصہ "گلِ رعنا" کی شکل میں کلکتے کے سفر میں مرتب ہوچکا تھا۔ مگر کلامِ فارسی، اس دیباچۂ دیوان اردو کے مطابق اس سفر تک بہت مختصر اور وہ بھی غیر مرتب مسودے کی شکل میں تھا (صفحہ ۱۸) قیام کلکتہ کے دوران میں مولوی سراج الدین احمد کی میرزا سے دوستی ہوگئی۔ انہوں نے فرمائش کر کے میرزا سے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب مرتب کرایا، جو "گلِ رعنا" کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کے حصۂ فارسی میں ایک قصیدہ، دو قطعے، ایک مثنوی اور ۲۷ منتخب غزلیں درج کی ہیں۔ لیکن اُردو میں صرف غزلوں کا انتخاب ہے اس میں صرف دو چار مکمل غزلیں ہیں، باقی اچھے اچھے شعر چنے گئے ہیں۔ اس کا ایک ناقص نسخہ مولانا حسرت موہانی مرحوم کو ملا تھا، جس میں سے کچھ غیر معروف شعر انہوں نے اپنی شرح دیوان اُردو کے آخر میں شامل کر لئے تھے سوء اتفاق سے یہ ناقص نسخہ بھی اہل ذوق کی دسترس سے باہر ہوگیا خوش قسمتی کہ ۱۹۵۷ء میں مالک رام صاحب کو جناب سید نقی بلگرامی (دہلی) نے اس کا ایک مکمل نسخہ تحفے میں دیا جس سے معلوم ہوا کہ اُردو کے منتخب اشعار کی

تعداد ۵۵۴ ہے۔ دوران میں نسخۂ شیرانی کی اکثر بیشتر غزلوں کا ایک شعر بھی موجود نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ مسرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۶۹ء میں "گل رعنا" کا وہ مخطوطہ بھی دریافت ہو گیا جو مرزا صاحب نے اپنے قلم سے تمام و کمال نقل کر کے نیا رکیا تھا اس نسخے سے جو جناب خواجہ محمد حسن (لاہور) کی ملکیت ہے۔ پہلی مرتبہ تاریخ انتخاب غرہ ربیع الاول ۱۲۴۴ھ (۱۲ دسمبر ۱۸۲۸ء) معلوم ہوئی۔

۱۹۷۰ء میں مالک رام صاحب نے "گل رعنا" مرتب کی۔ شروع میں ایک پُر مغز دیباچہ لکھا کتاب کی ترتیب و تحشیہ میں غالب کے دیوان کے مختلف نسخوں سے مدد لی۔ اس میں لائق مرتب نے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ ابتدا میں وہ بیدل کی تقلید کرتے رہے۔ کیونکہ وہ آسان زبان لکھنے پر قادر نہیں تھے، اور رفتہ رفتہ آخری دور میں انہوں نے میر کے زیر اثر آسان گوئی اختیار کی۔ اس کی تردید کرتے ہوئے فاضل مرتب لکھتے ہیں کہ غالب کے کلام کے چار مجموعے ۱۹۲۸ء تک مرتب ہو چکے تھے، ان چاروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی وہ سب آسان غزلیں جن کی بنا پر انہیں میر کے زیرِ اثر کہا جاتا ہے، ان میں موجود ہیں جب ان کی عمر بمشکل ۳۰ برس کی تھی تو ایسی آسان غزلیں وہ شروع سے برابر کہتے رہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

مالک رام کی نثر عالمانہ، متین اور سنجیدہ نثر ہے اس میں ہمیں محمد حسین آزاد اور صلاح الدین احمد کی نثر کا انداز زیر و بم تلاش نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی نثر میں سمندر کا سکون اور گہرائی ہے، سمندر کے مدّ و جزر کی کیفیت نہیں ہے۔ اور یہ اس لئے نہیں ہے کہ اتار چڑھاؤ رکھنے والی نثر علمی مباحث کے لئے نہ صرف ناموزوں ہے، بلکہ ایسی نثر سے اکثر و بیشتر علمی مقصد فوت ہو جاتا ہے لیکن ان کی نثر طنز و مزاح کے عنصر سے یکسر خالی بھی نہیں ہے۔ اس میں ہمیں چٹکلے تو نہیں ملتے لیکن لطافت کا دامن اس نثر کے ہاتھ سے کبھی چھوٹنے نہیں پاتا۔ مالک رام اپنی نثر کو لطیفوں سے سجانے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن جب کبھی کسی کی داستانِ حیات بیان کرتے ہوتے اس کی زندگی کا کوئی لطیفہ سامنے آجاتا ہے تو اسے ضرور زیبِ داستان بنا لیتے ہیں۔ مزاح کی ایک لطیف کیفیت خود ان کی اپنی طبیعت میں بھی موجود ہے۔ اور جب کبھی یہ کیفیت ان کی نثر میں نمودار ہوتی ہے تو نثر موجِ لطافت بن جاتی ہے اس موجِ لطافت کی ایک جھلک ان سطور میں دیکھئے۔

ہمارے ایک دوست تھے حمید عرفانی۔ انہیں بھی
تصویر کشی سے بہت دلچسپی تھی۔ انہوں نے اویاما کی اس
تصویر کی نقل تیار کی اور ایسی عمدہ کہ باید و شاید۔ اس
پر انہوں نے خود جگر سے ان کا ایک فارسی شعر لکھوایا اور
دستخط لئے۔ جب میں نے یہ تصویر اُن کے وہاں دیکھی تو میری
نیت خراب ہو گئی اب مجھے ٹھیک سا یاد نہیں کہ انہوں
نے میرا شوق دیکھ کے خود ہی اسے میرے حوالے کر دیا، یا
میں نے ہی کچھ حیلہ بہانہ کر کے یہ اُن سے ہتھیالی۔ بہرحال
تصویر میرے قبضے میں آ گئی ۱۹۳۹ء میں اپنے کتاب
خانے کے ساتھ میں اسے اپنے عزیز دوست ملک احمد
حسن مرحوم (ایڈیٹر دورِ جدید) کے پاس چھوڑ آیا۔
لطیفہ یہ ہوا کہ جب احمد حسن نے اسے دیکھا تو پوچھا۔
"کیوں بھائی، واقعی یہ جگر صاحب کی ٹھیک شبیہ ہے؟"
میں نے کہا "واہ صاحب! یہ آپ نے کیا کہا۔ اصل تو
یہ تصویر ہے، جگر صاحب تو اسے دیکھ کر بنائے گئے ہیں"۔

مالک رام اپنی نثر نگاری میں ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد، کے قائل ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تنقید آدابِ تنقید کی حدود کے اندر رہتی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کی تنقید کی طرح اُن کی تنقید شاعرانہ اندازِ بیان کی نذر نہیں ہو جاتی اور نہ ہی ظ۔ انصاری کی مانند وہ تنقید کی زبان کو ہنسی مذاق اور طعن و تشنیع کے نشتر سے مجروح کرتے چلے جاتے ہیں بلکہ ہر موقع پر تنقید کے لئے تنقید کی زبان کا استعمال ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ مالک رام اس رمز سے آشنا ہیں کہ تنقید کا کام فیصلہ دینا نہیں ہے، جائزہ لینا ہے۔ یہ کوئی دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے دکھانے کا کیمیاوی عمل نہیں ہے۔ بلکہ تنقید کا کام تخلیقی عمل کو آگے بڑھانا ہے۔ اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے، تو مالک رام کی تنقیدی عبارت خود ایک تخلیقی عمل کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے مثلاً

ایک جگہ غالب کے قصیدوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"اُن کے قصیدوں کی تشبیب یا تمہید بہت شاندار ہوتی ہے، اور اس میں وہ اپنا پورا زورِ کلام صرف کر دیتے ہیں۔ گریز عموماً بہت پر لطف اور برجستہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مدح بہت کم اور مختصر اور اخیر میں دو ایک شعر میں دعا پر وہ قصیدہ ختم کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ شاعر ہیں اور مدح بھی کرتے ہیں لیکن ایک آدھ جگہ کو چھوڑ کر اُن کی مدح میں بیجا غلو اور اغراق کہیں نہیں ملتا۔"

اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ مالک رام نے غالب کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمیشہ توصیفی بات ہی کہی ہے۔ ایسا نہیں ہے" برہانِ قاطع" کے قضیے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

پھر اس کے بعد جس طرح شرم وحیا اور تہذیب وشرافت کی مٹی پلید ہوئی، وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت ہی افسوس ناک باب ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر" البادیٔ اظلم" کے اصول سے دیکھا جائے، تو اس کے لئے بہت حد تک میرزا خود ذمہ دار تھے۔ انہوں نے اپنی درشت گفتاری کی جو توجیہ کی ہے وہ بہت بودی ہے۔ کوئی لاکھ "سپاہی زادہ" ہوا کرے اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کا مذاق یا تمسخر اڑائے یا اسے سخت سست کہے خاص کر جب بحث کا موضوع بھی علمی اور تحقیقی ہو۔ بیشک میرزا نے اپنی تحریر میں شوخیِ طبع اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن علمی مسئلوں کی تحقیق میں شوخی اور

ظرافت نہیں، متانت اور سنجیدگی درکار ہے۔

مالک رام کی تنقید نگاری کے سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ مالک رام نے تنقید کو اُس طرح اپنا موضوعِ خاص نہیں بنایا، جس طرح تحقیق کو۔ لیکن چونکہ تحقیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے تنقیدی اشارے مالک رام کی تحقیق میں بھی جا بجا نظر آتے ہیں، جن سے صرف ان کی تنقیدی بصیرت ہی کا پتا نہیں چلتا بلکہ یہ تنقیدی بصیرت قاری کے دل پر اپنا مستقل نقش بٹھاتی چلی جاتی ہے۔

پروفیسر مختار الدین احمد

اردو ادب میں تنقید و تحقیق کی روایت زیادہ قدیم نہیں۔ تنقید کی صورت حال زیادہ افسوسناک ہے۔ ہماری تنقید "اقلیدس کا خیالی نقطہ" اور "معشوق کی موہوم کمر" نہ سہی، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حالی کے بعد اُردو تنقید کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی، اور ابھی تک اسے گروہ بندی، جانبداری اور علاقائی عصبیت سے نجات نہیں مل سکی۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ جس ادب میں تنقید کی روایت کمزور ہوگی وہاں تحقیق کی نشوونما پر بھی بُرا اثر پڑیگا۔ کیونکہ تحقیق اور تنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے، دونوں ایک دوسرے کی معاون ہیں، اور دونوں قدم سے قدم ملا کر ہی آگے بڑھ سکتی ہیں۔ لیکن مقامِ شکر ہے کہ اردو میں تحقیق کم عمر ہونے کے باوجود بہت جاندار ہے، اور ہمارا تحقیقی سرمایہ مختصر ہونے کے باوجود وقیع ہے۔

جن بزرگوں اور دوستوں نے تحقیق کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں جناب مالک رام خاصی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں تحقیق کی اہمیت کو واضح کرنے اور نوجوانوں میں ذوقِ تحقیق کو عام کرنے میں مالک رام صاحب کی خدمات فراموش نہیں کی جا سکتیں۔

مالک رام صاحب کی تصنیف "ذکرِ غالب" کئی حیثیتوں سے بڑی اہم ہے۔ اس نے غالب کی زندگی کے مخفی گوشوں کو روشن کیا۔ اُردو میں تحقیق کی روایت کو مستحکم کیا اور خود مالک رام صاحب کو تحقیق اور تصنیف کی طرف مائل کیا۔

حالی نے اپنے دیوان کا مقدمہ لکھا تھا، مگر اس کی حیثیت بالآخر ایک مستقل کتاب کی ہوگئی

یہی حال مالک رام صاحب کی "ذکر غالب" کا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ کتاب لکھی گئی تھی۔ دیباچہ سبد چین کے طور پر اور شائع ہوئی ایک مستقل کتاب کی حیثیت سے۔ اس کی روداد خود مالک رام صاحب نے تحریر کر دی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تصنیف کے میدان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی ان میں تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا مادہ موجود تھا۔

ایک بار انہیں ایک کتاب کے دیکھنے کی شدید خواہش ہوئی، اور کتاب بھی ایسی جس کا مطبوعہ نسخہ مخطوطے سے بھی زیادہ نادر تھا۔ یعنی "سبد چین"۔ جو بمشکل دستیاب ہوتی تھی انہوں نے مہینوں اپنے علم دوست احباب سے خط کتابت کی اور آخر کار نواب صدر یار جنگ نے اپنے نایاب ذخیرے سے اس کی نقل انہیں فراہم کر دی۔ تحقیق و تدوین سے مالک رام صاحب کو طبعی مناسبت تھی ہی۔ انہوں نے اسے اشاعت کے لئے مرتب کر دیا۔ مینجر مکتبہ جامعہ کی فرمائش پر اس کا مقدمہ لکھنا شروع کیا، تو وہ خاصا طویل ہو گیا۔ اس لئے اسے "ذکر غالب" کے نام سے علیٰحدہ ایک مختصر سی کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا، یہ بات ۱۹۳۷ء کی ہے

"ذکر غالب" کا پہلا اڈیشن بہت مختصر تھا۔ تحقیق کے میدان میں یہ مالک رام صاحب کا پہلا قدم تھا تاہم اس کے مطالعے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ مصنف کو تلاش و تحقیق کے صبر آزما کام سے اس لئے مناسبت ہے کہ محقق ان گنت کتابوں کے مخطوطوں اور تحریروں کو کھنگالتا ہے کہیں سے کوئی مطلب کی بات ہاتھ آ گئی کہیں مطلب کا کچھ بھی نہ ملا اور محنت اکارت گئی۔

غالب کے بارے میں جو معلومات دستیاب تھیں بھی تو وہ ان کے مکتوبات، شعراء کے تذکروں اور دوسری تحریروں میں اِدھر اُدھر منتشر تھیں۔ مالک رام صاحب نے بڑی محنت سے انہیں جمع کیا اور پھر بڑے سلیقے سے انہیں ترتیب دے کر ایک جامع کتاب کی شکل میں پیش کر دیا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ انہوں نے اپنی لگن سے اس کام کو جاری رکھا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اب تک اس کے پانچ اڈیشن نکل چکے ہیں۔ اگر ان پانچوں اڈیشنوں کو پیشِ نظر رکھ کر تقابلی مطالعہ کیا جائے، تو اندازہ ہو گا کہ ہر اگلی اشاعت پچھلی اشاعت سے زیادہ مبسوط اور جامع ہے مالک رام صاحب نے صرف یہی نہیں کہ مواد جمع کر کے اسے سلیقے سے

مرتب کر دیا، بلکہ انہوں نے اس سے نتائج کا استنباط بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں ایسی مثالیں شاذ ہی ملیں گی، جہاں ان کے مستنبط نتائج سے اختلاف کیا جا سکے، اس لئے کہ انہوں نے اپنی رائیں ٹھوس بنیادوں پر قائم کی ہیں وہ نہ غالب کے پرستار ہیں، نہ عیب جُو، وہ سچے اور کھرے محقق ہیں۔ محقق وہاں پہنچتا ہے، جہاں شہادتیں اسے لے جائیں۔ مالک رام صاحب کا یہی منصب ہے۔

مرزا غالب کی زندگی اور سوانح حیات پر جو قابلِ ذکر کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے یہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔

سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں خواجہ الطاف حسین حالی (ف: یکم جنوری ۱۹۱۵ء) نے یادگارِ غالب لکھی۔ تقریباً چالیس سال کے بعد ۱۹۳۶ء میں شیخ محمد اکرام (ف: ۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء) نے غالب نامہ شائع کیا۔ اس کے تھوڑے دن بعد غلام رسول مہر (ف: ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء) کی کتاب غالب شائع ہوئی، دو سال بعد ۱۹۳۸ء میں مالک رام صاحب کی کتاب "ذکرِ غالب" شائع ہوئی۔ اور اس کے ایک سال بعد حیدر آباد سے سیّد محی الدین قادری زور (ف ۱۹۶۲ء) نے سرگزشتِ غالب شائع کی۔ لیکن یہ مختصر سی کتاب کچھ زیادہ مشہور نہ ہو سکی اور یوں بھی اسے بنظرِ غائر دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ یہ "ذکرِ غالب" طبع اوّل کا چربہ ہے۔

جسٹس ہدایت اللہ

مالک رام صاحب تاریخ اور تحقیق میں خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے ادیبوں میں وہ ممتاز ہیں۔ ان کی تصنیفات دو درجن سے زیادہ ہیں۔ غالب پر انہوں نے اتنا لکھا ہے کہ انہیں ماہرِ غالبیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی کتابوں میں ذکرِ غالب اور فسانۂ غالب مستند کتابیں مانی جاتی ہیں۔ جتنی واقفیت مجھے غالب کے بارے میں ہوئی، اس کا بیشتر حصہ مجھے ان دو کتابوں سے ملا۔ میں ہمیشہ یہ کتابیں فرصت میں پڑھتا ہوں اور غالب کے قصوں سے دل بہلاتا ہوں۔

مالک رام صاحب کی کتاب "عورت اور اسلامی تعلیم" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ پہلے قسط وار ماہنامہ "نگار" لکھنؤ میں شائع ہوتے رہے۔ کتاب کی صورت میں باقاعدہ یہ ۱۹۵۱ء

میں شائع ہوئے۔ (اس سے قبل یہ مضامین کی شکل میں شائع ہوئے تھے) ۱۹۷۷ء میں نظرِثانی
کے بعد یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی۔ ع

یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دوچار برس کی بات نہیں

روایت اور تحقیق کے درمیان جو فرق ہے، مالک رام صاحب اس سے بخوبی واقف ہیں۔
یہی سبب ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا ہے، وہ کافی چھان بین کے بعد لکھا ہے۔

آپ نے "عورت کا صحیح مقام اسلام میں کیا ہے" بتایا ہے آج تک کسی نے اس مسئلے کو
اتنی وضاحت اور خوبی سے بیان نہیں کیا تھا۔ ہر ایک موضوع پر آیاتِ قرآنی اور احادیث کا
حوالہ دیا ہے تاکہ صحیح چیز سامنے آسکے۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہوا ہے۔ مگر دوسری انگریزی
کتابوں میں ان آیات اور احادیث کا نچوڑ ہوتا ہے، اور انگریزی میں بنیادی احکامات نہیں ملتے
مالک رام صاحب نے صرف روایات اور احادیث عربی میں شامل نہیں کی ہیں، بلکہ ان کا ترجمہ بھی
شامل کیا ہے، کہ اگر کوئی عربی نہ سمجھے تو اردو پڑھ کر سمجھ سکے۔ مولانا نیاز فتحپوری مرحوم نے اپنے پیش
لفظ میں لکھا ہے کہ فاضل مصنف نے آیاتِ قرآنی سے جو کچھ استنباط اور استنتاج کیا ہے ممکن
ہے کہ اس کے متعلق بعض کو کچھ اختلاف ہو، مگر انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جو کچھ مالک رام صاحب
نے لکھا ہے وہ اپنے ضمیر یا وجدان کی روشنی میں لکھا ہے۔ مجھے مولانا کی رائے سے اتفاق ہے۔
جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، اختلافی امکان کے باوجود یہ عورت اور اسلامی تعلیمات کے
بارے میں ایک نہایت قابلِ قدر اور معلوماتی کتاب ہے۔

آج کے دور میں جب کہ خواتین سماج میں بلند سے بلند مقامات حاصل کر رہی ہیں پُرانے
دور کا تصوّر بڑا عجیب سا لگتا ہے، جب جاہلیت میں ڈوبے ہوئے لوگ نومولود لڑکی کو باعثِ
ننگ سمجھ کر مار ڈالتے تھے، تو ظاہر ہے کہ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک وہ کیسے کرتے! مالک رام
صاحب نے دختر کشی کے متعلق قرآنی آیات پیش کی ہیں۔ جیسا کہ مولانا حالی نے بھی مسدسِ حالی
میں کہا ہے

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر ۔۔۔ تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی تھی جو شوہر کے تیور ۔۔۔ کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر

وہ گو دا ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی　　جنے سانپ جیسے کوئی جلنے والی

یہ تو صرف ایک مثال کے طور پر میں نے لکھا ہے۔ مالک رام صاحب نے بہت وضاحت سے عورت کے حقوق اور حدود بیان کئے ہیں۔ اس کتاب سے شریعت اور فقہ دونوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں نہ دلیل ہے، نہ حجت، جیسی آیات کلام پاک اور مقدس احادیث ہیں ان کو ویسا ہی پیش کر دیا ہے۔ آیات مقدسہ اور احادیث پاک کی عظمت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے اور ان کے صحیح طور پر معانی بھی بیان کئے ہیں۔

اردو میں یہ اتنی اہم اور جامع کتاب ہے جس میں بیٹی، ماں، اور بیوہ عورت کے حقوق یکجا ملتے ہیں

پروفیسر گیان چند

مالک رام صاحب نے غالبؔ سے متعلق پچاس سے بھی زیادہ مضمون لکھے ہیں ان میں سے ۱۵ مضامین کا مجموعہ انہوں نے "فسانۂ غالب" کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع کر دیا ہے۔ یہ سب غالبؔ کی سوانح سے متعلق ہیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ماہر غالبیات کے کیا معنی ہیں۔ کتاب کا پہلا مضمون ہے "توقیتِ غالب" اس میں غالبؔ کی زندگی کے واقعات اور تصانیف کی اہم اور مستند تاریخیں ہیں، جن میں غالبؔ کے اقارب اور بعض اہم معاصرین کی تواریخ بھی آگئی ہیں۔

دوسرا مضمون غالبؔ کی تاریخ ولادت سے متعلق ہے۔ اس میں مالک رام صاحب نے مولانا عرشی، غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام کی دی ہوئی تاریخِ ولادت کی تصحیح کر کے غالبؔ کی تاریخِ ولادت ہجری اور عیسوی سنین میں دی ہے۔ جسے اُردو دنیا نے قبول کیا ہے

تیسرا مضمون ایک خط کی تاریخ کتابت، خط پر تاریخ ۱۸۰۴ء دی ہے۔ انہوں نے اسے ۱۸۴۸ء ثابت کیا ہے۔ یہ نتیجہ ایک قیاس ہے۔ جو کتنا بھی مضبوط کیوں نہ ہو قطعی اور شافی نہیں۔ اسے ممکنہ زمرے میں رکھا جائے۔

مجموعے کے تین مضامین ایسی شخصیتوں سے متعلق ہیں کہ وہ غالبؔ کی زندگی کا حصّہ بن چکے ہیں۔ ان میں پہلا مضمون ان کے بھائی میرزا یوسف کے بارے میں ہے۔ انہوں نے قومی آرکائوز میں دو مسلیں تلاش کر کے میرزا یوسف کی بیوہ کا نام، اُن کی درخواست وظیفہ اور ان پر مختلف

عہدہ داروں کی کارگزاری کی تفصیلات معلوم کی ہیں۔ دوسرے مضمون "نواب شمس الدین احمد خان" کے سلسلہ میں مرقع الور اور کارنامہ سروری جیسی غیر معروف کتابوں کے علاوہ قومی آرکائوز کے متعدد مراسلات شامل ہیں۔ اس مضمون میں فریزر کے قتل سے متعلق مستند اور مفصل معلومات جمع کر دی گئی ہے۔ تیسرا مضمون قتیل سے متعلق ہے۔ اس سے اب قطعی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ وہ بٹالے کا رہنے والا تھا اور اس کا نام دیوانی سنگھ تھا۔

اس مجموعے کا سب سے اہم مضمون ملّا عبد الصمد سے متعلق ہے۔ قاضی عبد الودود، عبد الصمد کے وجودِ خارجی سے منکر ہیں۔ اس کے برعکس مالک رام اس کی ہستی کے قائل۔ دو عظما کی بحث میں عام قاری فیصلہ نہیں کر سکتا۔ قاضی صاحب کا مضمون پڑھ کر ملا کے وجود کی نفی میں جو یقین ہوتا ہے، وہ مالک رام صاحب کا مضمون پڑھ کر شک میں بدل جاتا ہے۔

چھٹا مضمون، غالب کی مہریں ہے۔ اس میں غالب کی چھ مہروں کی تفصیل اور عکس دیا ہے۔ یہ مہروں کا نفسیاتی مطالعہ ہے۔ مقدمۂ پنشن کا عرضی دعوی، میں انڈیا آفس کے کاغذات سے حاصل شدہ اطلاعات پر لکھا گیا قابلِ اعتنا مضمون ہے۔ دو مضمون سکے کے الزام سے متعلق ہیں۔ ان میں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ڈاکٹر خلیق انجم کے نتائج اور قیاسات کی تردید کی گئی ہے

ان مضامین میں "ذکرِ غالب" میں اختصار سے دئے ہوئے موضوعات کی تفصیل ہے

تلامذہ غالب کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ مئی ۱۹۸۴ء میں ۱۸۱ شاگردوں کے حالات اور نمونۂ کلام مختلف قلمی اور مطبوعہ کتابوں اور رسالوں سے لے کر ترتیب دئے گئے ہیں ضمیمے میں حکیم غلام مولیٰ عرف مولا بخش قلق میرٹھی کے حالات ہیں۔ جنہوں نے غالب کی کبھی شاگردی اختیار نہیں کی۔ لیکن اس کے باوجود غالبًا قلق سے استصواب کئے بغیر غالب نے اُن کے کلام پر اصلاح دی تھی۔ اس بار ۳۴ شاعروں کی تصویریں شامل کتاب ہیں گویا کہ سات تصویروں کا پہلے ایڈیشن پر اضافہ ہے۔ مالک رام صاحب نے دوسرے ایڈیشن میں ان اغلاط کی تصحیح کر دی ہے جو پہلے ایڈیشن میں در آئی تھیں۔ ہر جگہ حوالے بھی دے دئے ہیں۔

علی جواد زیدی

مالک رام کو اسلامیات سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ اس کے سوتے اس دور سے پھوٹتے ہیں جب وہ آریہ سماج کے ہفتہ وار ترجمان (آریہ گزٹ) کی ادارت سے وابستہ تھے۔ یہ دور ہندستان میں علی العلوم اور پنجاب میں علی الخصوص مناظروں کی مقبولیت کا دور تھا۔ آریہ گزٹ ان مذہبی مناظروں کا ایک رکن تھا اس ماحول میں مالک رام نے مذاہبِ ہند بالخصوص اسلام کا اور ہندو مت اور عیسائیت کا تقابلی مطالعہ شروع کیا۔ وقتی اور صحافتی ضرورت تو سطحی مطالعے سے بھی پوری ہو جاتی ہے لیکن مالک رام نے ذرا غور اور توجہ سے اسلامیات کا مطالعہ کیا انہیں جس چیز نے زیادہ متاثر کیا وہ اسلام میں عورت کا درجہ ہے "عورت اور اسلامی تعلیم" ان کے اسی غائر مطالعے کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اسی کتاب میں اس موضوع پر مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم اور مولوی ضیاء الدین اصلاحی کے مفصّل تبصرے موجود ہیں اس لئے میں خود اس پر کچھ اور کہنا نہیں چاہتا۔ لیکن اسلام اور عورت ہو۔ یا اسلام اور غلامی، مالک رام کا مطالعہ ہمدردانہ اور محققانہ ہے۔ انھوں نے ان امور کو اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان مسائل کو ایک انصاف پسند شخص کی نگاہ سے دیکھا ہے اب اسی موضوع پر ان کی دوسری کتاب "اسلامیات" بھی آگئی ہے۔ یہ بعض دوسرے مسائل کا بھی احاطہ کرتی ہے اور جاذب توجہ ہے۔ اگر مسلمات سے کہیں جزوی انحراف بھی ہے تو یہ اُن کے ذاتی نقطۂ نگاہ کا ترجمان ہے، اور وہ بھی غیر ہمدردانہ نہیں ہے اس پہلو پر اس مجموعے میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد عبدالسلام خان، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور اختر الواسع کے تبصرے اور افکار موجود ہیں، بلکہ سپریم کورٹ کے سابق چیف جج اور سابق نائب صدر ہند جسٹس ہدایت اللہ نے بھی اپنے خیالات پیش کئے ہیں اور اسی سے ظاہر ہے کہ ان کے مضامین اور کتابوں نے کتنے وسیع اور متنوع حلقے کو متاثر کیا ہے۔ یہاں ضمناً ایک بات کا ذکر بے محل نہیں سمجھا جائے گا۔ مولوی ضیا الدین اصلاحی دار المصنفین، اعظم گڑھ نے "عورت اور اسلامی تعلیم" پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض قدیم شارحین اور مفسّرین کے اقوال نقل کئے ہیں جو مالک رام کے اخذ کردہ نتائج سے مختلف ہیں۔ اس سے یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ مالک رام سے ان مقامات پر غلطی ہو گئی ہے۔ بلکہ یہ نقطۂ نظر اور تشریح کا فرق ہے۔ مالک رام نے خود اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا

ہے کہ بعض مسائل میں مجھے دوسرے علمار سے اختلاف ہے یہی بات انہوں نے اپنی تازہ کتاب "اسلامیات" میں بھی دوہرائی ہے۔ یقیناً پہلے مصنفین کی یہ تحریریں ان کے بھی علم میں رہی ہونگی لیکن اس کے باوجود انہوں نے وہ استنباط کیا، جو انہوں نے اپنی تصنیف میں پیش کیا ہے، یہ زبان کے مقرّرہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر صاحبِ نظر وفکر مصنّف کا حق ہے۔

خاکہ نگاری اور تذکرہ نگاری پر بھی ان کی توجہ مرکوز رہی ہے۔ مالک رام دراصل تاریخ کے اچھے طالب علم ہیں اور ان کی یہ دلچسپی ان خاکوں اور تذکروں میں بھی نمایاں ہے۔ معاصرین پر کچھ لکھنا آسان نہیں ہوتا۔ جب وہ ہمارے درمیان نہیں رہتے، تو یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اب ایسے اخلاف بھی کم ہوتے جا رہے ہیں جو اسلاف کے کارناموں سے کما حقہ واقف ہوں بعض اوقات وہ اپنی ناواقفیت چھپانے کے لئے غلط اطلاعات فراہم کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے کبھی کبھی حافظ بھی ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ دوستانہ روایات بھی سو فیصد قابلِ اعتبار نہیں ہوتیں۔ اسی طرح کے خام مواد پر انہیں "تذکرۂ معاصرین" کی متعدد جلدوں کی عمارت تیار کرنا پڑی ہے۔ ممکن ہے کہیں غلطی رہ گئی ہو لیکن اس میں مؤلف کا قصور کم ہے، اور اطلاعات فراہم کرنے والوں کا زیادہ۔ کام کی بات یہ ہے کہ ان تمام تذکروں اور خاکوں کا جمع ہو جانا بھی معمولی بات نہیں ہے۔ اس جانسوز کام کے لئے مالک رام لائقِ ستائش ہیں۔

مالک رام نے انگریزی میں بھی غالب اور حالی پر کتابچے لکھے ہیں جو بہت مقبول ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ بیسیوں تراجم اور مختلف مضامین ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

تحقیقی اعتبار سے غالبیات کے سلسلے کا ایک وقیع نام ہے مالک رام کا پچھلی نصف صدی

سے جن کا ایک ایک لمحہ غالب کے لئے وقف رہا ہے اور جن کے لئے غالب اور اُردو ایک ہی حقیقت کے دو رخ بن گئے ہیں۔ مالک رام تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف و مؤلف، و مرتب ہیں۔ ان کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے ان کی خدمات کا اعتراف صرف یہ کہہ دینے سے نہیں ہو جاتا کہ انھوں نے "ذکر غالب" یا "تلامذہ غالب" یا "فسانۂ غالب" ہیں، یا غالب کی بعض تصانیف کو مرتب کیا یا غالب کے معاصرین، ممدوحین و رفقاء پر مضامین قلمبند کئے، بلکہ یہ کہ غالبیات کی موجودہ مہتم بالشان روایت میں ان کا کام اس بنیادی نوعیت کا ہے کہ اگر اسے الگ کر دیا جائے، تو ہمیں اس میں بہت کمی محسوس ہوگی۔ مالک رام کا کام اس پائے کا ہے کہ اسے زندگی بھر کی لگن اور انہماک کی مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس بات کی پوری معنویت غالبیات کی اعلاء علمی روایت کو نظر میں رکھے بغیر واضح نہیں ہو سکتی ایک صدی کے اس علمی سرمائے کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے دور کے کام کا تعلق پچھلی صدی سے ہے، دوسرے کا بیسویں صدی کے وسطی حصے سے، اور تیسرے کا تعلق آزادی کے بعد نمایاں ہونے والے محققین کی علمی کاوشوں سے ہے۔ غالب شناسی کے ضمن میں پہلا اہم قدم حالی نے اٹھایا، "یادگارِ غالب" ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ بجنوری کی "محاسنِ کلام غالب" اگرچہ بیسویں صدی کے شروع میں منظر عام پر آئی، لیکن مزاج، عقیدتمندی اور جذباتی وابستگی کی بنا پر بجنوری بھی غالبیات کے اوّلین بنیاد گذاروں میں حالی کے ساتھ جگہ پائیں گے۔ مولوی عبدالحق، وحیدالدین سلیم اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اُردو میں علمی مزاج کی تشکیل اور تحقیقی معروضیت کے شعور کو عام کرنے میں اہم خدمت انجام دی لیکن بنیادی کارنامہ بیسویں صدی کے ربع دوم میں ابھرنے والے پانچ حضرات نے سرانجام دیا جنھیں سلسلۂ غالبیات کی مرکزی شخصیات کہنا چاہیئے۔ یعنی غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، اور مالک رام۔ مولوی مہیش پرشاد نے اپنے لئے خطوط غالب کا گوشہ منتخب کیا اور ساری زندگی اس میں کھپا دی۔ ان کا کام اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن نوعیت کے اعتبار سے محدود ہے) غالبیات کو اعلا علمی درجہ انہیں پانچ حضرات نے بخشا۔ کوئی چاہے تو انہیں غالبیات کے عناصر خمسہ بھی کہہ سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غالبیات

کا ایوانِ علمی انہیں حضرات کی جگر کاویوں سے وجود پذیر ہوا۔ آزادی کے بعد غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تحقیق میں بھی اور تنقید میں بھی، اور اس ضمن میں بیسیوں نام لئے جا سکتے ہیں، لیکن جتنا بھی کام ہوا ہے، وہ انہیں بنیادوں پر ہے جو غالبیات کے ان "پنج تن" نے اپنی تحقیقات سے فراہم کردی تھیں۔ ان کے کام کی حیثیت مرکزی گنبد کی ہے بعد میں آنے والوں نے مینارے، کنگورے اور فصیلیں تعمیر کی ہیں۔

غالب کی شخصیت ایک لحاظ سے نظام شمسی کی طرح ہے۔ یعنی اگر انہیں آفتاب عالم تاب تصور کیا جائے تو ان کے چاروں طرف سیکڑوں چاند اور سیارے گردش میں ہیں۔ مالک رام کے کام کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ انہوں نے اس پورے نظام کو نظر میں رکھا ہے۔ چنانچہ غالب کی مرکزی شخصیت کے علاوہ ان کے تلامذہ، ممدوحین، معاصرین عقیدت مندوں، دوستوں، دشمنوں، مدّاحوں، مخالفوں میں سے بلا مبالغہ سیکڑوں پر مالک رام نے قلم اٹھایا ہے اور بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔

جناب مالک رام جو نصف صدی سے اُردو ادب

پروفیسر نثار احمد فاروقی

کی خدمت کررہے ہیں، ممتاز ماہر غالبیات ہیں اگر انہوں نے اور کچھ نہ کیا ہوتا، اور صرف "ذکرِ غالب" ان کے پاس ہوتی، تب بھی وہ ہماری ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جاتے، اس لیے کہ "ذکرِ غالب سے" زیادہ جامع، محیط اور مستند سوانحعمری دوسری نہیں لکھی گئی، حال آنکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حالی کی "یادگارِ غالب" پر کوئی کیا اضافہ کرسکے گا! وہ غالب کے شاگرد اور ہمعصر تھے۔ اور نثر میں بھی ایک سادہ علمی اسلوب کے بانی تھے گویا غالب کے لفظوں میں

ذکر اس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا

والا معاملہ تھا۔ مگر مالک رام نے "ذکرِ غالب" ایسی لکھی، جو سوانح نگاری کے جدید ترین عالمی معیاروں پر بھی پوری اترتی ہے، اور اس طرح کی دوسری تصانیف کے لئے بھی نمونہ بن سکتی ہے۔ "ذکر غالب" کے ساتھ ہی انہوں نے "سبد چین" کو ترتیب دے کر پہلی بار شائع کیا۔ غالب کا خود کردہ انتخاب "گلِ رعنا" چھاپا، "دستنبو" اور دیوان

غالب" کے متون چھاپے۔"کلیاتِ فارسی غالب" کو ترتیب دیا (یہ ابھی شائع نہیں ہو سکی ہے)"تلامذۂ غالب" کا مفصل تذکرہ لکھا اور" ممدوحین غالب" کا تذکرہ ترتیب دیا (یہ بھی چھپنا باقی ہے) ان کے علاوہ بھی غالبیات سے متعلق بہت سے ضمنی موضوعات پر انھوں نے تحقیقی مضامین لکھے۔ اُردو میں صحیفہ ہائے سپاس"نذرِ عرشی" "نذرِ ذاکر" "نذرِ عابد"، "نذرِ زیدی"، "نذرِ حمید" حسن و زیبائش کے ساتھ چھاپ کر انہوں نے اردو میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اردو کا ایک معیاری تحقیقی مجلہ"تحریر" ۱۲ سال تک شائع کرتے رہے اور اس کے صفحات میں ایسا کار آمد مواد جمع کر دیا، جو آئندہ بھی ریسرچ کرنے والوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ اس رسالے کے غالب نمبر، جگر بریلوی نمبر سیّدین نمبر اور رشید احمد صدیقی نمبر بھی خاصے کی چیز ہیں۔ جو ہر زمانے میں قدردانی کے ہاتھوں سے لئے جائیں گے۔

انہوں نے اسلامیات سے بھی گہری دلچسپی کا ثبوت دیا۔ مولانا آزاد کی بعض تصانیف کے متون کو صحت کے ساتھ شائع کرا دیا۔"عورت اور اسلامی تعلیم" کے موضوع پر ایک اعلیٰ درجے کی پُراز معلومات کتاب لکھی۔ یہ اُن کے سب علمی کاموں کا آدھا ادھورا جائزہ ہے۔ انہوں نے جس محنت، محبت اور لگن کے ساتھ اُردو زبان و ادب کی عموماً اور غالبیات کی خصوصاً خدمت کی ہے، وہ نہ معمولی درجے کی چیز ہے، نہ آسانی سے بھلائی جا سکتی ہے لیکن ان کی سب علمی خدمتوں کو ذہن میں رکھ کر جب میں غور کرتا ہوں، تو مجھے وہ بنیادی طور پر ایک "تذکرہ نگار" ہی نظر آتے ہیں۔ انہیں تاریخ و سوانح سے خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ ایک زمانے میں ان کا ارادہ تھا کہ سرکاری ملازمت کی کھکھیڑ سے سبکدوش ہو کر وہ لالہ سری رام کے "خمخانہ جاوید" کی تکمیل کریں گے جس کی صرف چار جلدیں لالہ جی نے چھاپی تھیں اور پانچویں جلد پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی کوشش سے شائع ہوئی تھی۔ بقیہ جلدوں کا مواد ضائع ہو گیا ہوگا۔ لیکن مالک رام اپنے طور پر باقی جلدوں کا مسالا فراہم کر رہے تھے اور کچھ جمع بھی کر لیا تھا شاید اب خمخانہ کی تکمیل کا انہوں نے اپنی صحت کے پیش نظر ارادہ ترک کر دیا ہو۔ مالک رام کی تذکرہ نگاری کا پہلا مظاہرہ"تلامذۂ غالب" کی صورت میں ہوا۔ یہ مرزا غالب کے

شاگردوں کا بہت اچھا تذکرہ ہے جس میں سوانحی تفصیلات کے ساتھ ان شعراء کا انتخاب کلام بھی دیا ہے۔ حتی الامکان سنین کا اہتمام بھی ہے۔ تمام ضروری معلومات کا استقصا کیا گیا ہے اور آخر میں مصادر کی فہرست بھی درج کردی ہے۔ میں نے اس تذکرے پر اسی زمانے میں ایک تبصرہ بھی کیا تھا اور اس میں جو فروگذاشتیں نظر آئی تھیں ان کی نشاندہی کردی تھی کچھ تلامذہ کے حالات اضافے کے لئے بعد کو دستیاب ہوئے بعض کے تراجم میں خاصہ اضافہ بھی ہوا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن منظرِ عام پر آئے گا۔ تو وہ یقیناً نقشِ اول سے بدرجہا بہتر ہوگا۔

"تلامذۂ غالب" میں جو حالات جمع ہو گئے ہیں، ان سے صرف یہی مقصود نہیں ہے کہ اگر مرزا غالب نے کسی کے ایک آدھ مصرع میں رد و بدل کر دیا تھا، تو وہ صف تلامذہ میں شامل ہوگیا اور اسے تذکرے میں شامل کرنے کا جواز مل گیا۔ اگر غالب کے ایک شاگرد کا حال لکھا جائے تو اس سے خود غالب کی شاعری یا شخصیت پر کوئی منفی اثر پڑنے والا نہیں ہے۔ اصل افادیت یہ ہے کہ "تلامذۂ غالب کے پردے پر غالب کا پورا سماجی ماحول اور گرد وپیش ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اگر غالب کو اس کے سماجی پس منظر میں پڑھنا چاہیں تو اس کے لئے ہمیں "تلامذۂ غالب سے" بہت مدد ملے گی۔ ان کے سوانحی حالات میں کتنے ہی ایسے اشارے اور حوالے مل جاتے ہیں، یا خود خطوط غالب میں ایسے فقرے ہیں جن کی وضاحت اس وقت تک نہیں ہوسکتی، جب تک ہم ان اصحاب کے احوال و کوائف سے واقف نہ ہوں۔ اب تو "بزمِ غالب" جیسی ایک دو کتابیں اور بھی آگئی ہیں لیکن مالک رام نے آج سے ۳۰ سال پہلے "تلامذۂ غالب" تالیف کر کے اس سمت میں پہلا قدم اٹھایا تھا۔

تذکرہ نگاری کی حیثیت سے مالک رام کا سب سے پہلا اہم کارنامہ "تذکرۂ معاصرین" ہے اس کی اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ میرے سامنے اس وقت یہ چاروں جلدیں ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) جلد اول :- ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے درمیان وفات پانے والے ادیبوں کے حالات (پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۷۲ء۔ صفحات ۴۴۴) تعداد تراجم ۴۷۔

(۲) جلد دوم ۱۹۷۲ء - ۱۹۷۳ء میں وفات پانے والے اہلِ علم وادب کے حالات (پہلا ایڈیشن ۱۹۷۶ء - صفحات ۲۴۸) تعدادِ تراجم ۳۷

(۳) جلد سوم ۱۹۷۴ء - ۱۹۷۵ء میں وفات پانے والے ادیبوں کے حالات (پہلی اشاعت جون ۱۹۷۸ء - صفحات ۳۸۴) تعداد تراجم ۵۶

(۴) جلد چہارم ۱۹۷۶ء - ۱۹۷۷ء میں وفات پانے والے ادبا کے حالات (پہلی اشاعت ۱۹۸۲ء صفحات ۳۵۲) تعدادِ تراجم ۵۲

اس طرح تذکرۂ معاصرین کی چار جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۱۴۲۸ ہوتی ہے اور جن ادیبوں کے حالات اس تذکرے میں آگئے ہیں ان کی تعداد ۲۱۹ ہے ان میں ۳۰ ہندو، عیسائی اور باقی بظاہر مسلمان ادیب اور اہل قلم ہیں،

قدما کے تذکروں کے مقابلے میں "تذکرۂ معاصرین" کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف شعرا ہی کے تراجم نہیں، بلکہ تمام اصناف ادب اور علوم مشرقیہ کے شعبوں سے علاقہ رکھنے والے ان اہلِ قلم کو اس محفل میں شریک کیا گیا ہے، جو اس مدّت میں وفات پا گئے تھے۔ چنانچہ "تذکرۂ معاصرین" میں اسلامیات کے اسکالرز بھی ہیں (جیسے آرتھر جان آربری اور ڈاکٹر سید عبداللطیف) ڈرامانگار بھی ہیں (جیسے حکیم احمد شجاع اور امتیاز علی تاج) صحافی بھی ہیں (جیسے اسرار احمد آزاد اور عبدالباقی) مورّخ اور تذکرہ نگار بھی ہیں (جیسے انتظام اللہ شہابی اور محمود احمد عباسی) افسانہ نگار بھی (جیسے سدرشن اور علی عباس حسینی)

اس تذکرے میں قدیم طرز سخن کے اساتذہ کے علاوہ، جدید رنگ کے غیر روایتی ادیبوں اور شاعروں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے (جیسے مخدوم، جامی اور اریب) ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بعض نسبتاً غیر معروف شاعروں اور علاقائی شہرت کے ادیبوں کے حالات بھی آگئے ہیں۔ "تذکرہ معاصرین" میں اگر ان کا ذکر نہ ہوتا، تو ان کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنا آج بھی خاصا دشوار تھا سو دو سو برس کے بعد تو یہ ناممکن کی حد تک دشوار ہو جاتا۔ ان میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی شامل ہیں، جیسے دیا بریلوی مہادیو

ڈاکٹر خلیق انجم

جن ممتی نقادوں نے غالبؔ کے خطوط اور دیوان ترتیب دیئے، ان میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور جن حضرات نے غالبؔ، ان کے شاگردوں، دوستوں اور عزیزوں کے سوانح پر سب سے زیادہ کام کیا اور غالبؔ کی مختلف تحریریں مرتب کرکے شائع کیں ان میں مالک رام کا نام سرفہرست ہے۔ غالبیات کے سلسلے میں قاضی عبدالودود کا نام بھی بہت اہم ہے۔ مرحوم نے غالبؔ کے سوانح اور تخلیقات کے بارے میں بیش بہا معلومات فراہم کیں لیکن غالب کے فن یا شخصیت پر وہ کوئی مستقل کتاب نہیں لکھ سکے۔ مالک رام صاحب کی "ذکر غالب" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب تک اس کے پانچ یا چھ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ چونکہ ہر ایڈیشن میں مالک رام صاحب ترمیم اور اضافے کرتے ہیں۔ اس لئے وہ پچھلے اڈیشنوں سے بہتر ہوتا ہے۔ مالک رام صاحب غالبؔ کی "دستنبو"، گل رعنا، دیوان غالبؔ اور اُن کے متعلقین کے بارے میں مختلف رسالوں میں مالک رام صاحب کے متعدد مضامین کا انتخاب 'فسانہ غالب' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

مالک رام صاحب کو "تلامذۂ غالب" لکھنے کا خیال اس وقت آیا جب وہ بسلسلۂ ملازمت ہندستان سے باہر تھے۔ اور ان کا قیام مصر، عراق اور ترکی میں تھا۔ ان ممالک میں ایسی کسی لائبریری کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ جہاں سے اس موضوع سے متعلق اردو یا فارسی میں کتابیں حاصل کی جاسکیں۔ خود مالک رام صاحب اپنے ساتھ جو کتابیں لے گئے تھے ان ہی پر اکتفا کرنا پڑا ان ممالک میں رہ کر ایسی تحقیقی کتاب لکھنا معجزہ ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں مرکز تصنیف و تالیف، نکودر سے شائع ہوا۔ اردو میں "تلامذۂ غالب" کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ اسے غالبیات میں اہم اضافہ سمجھا گیا بہت بڑی تعداد میں تبصرے شائع ہوئے۔ جن میں اس تحقیقی کام کو بہت سراہا گیا۔ "تلامذۂ غالب" کا دوسرا ایڈیشن آفسیٹ سے چھپا اور یہ ۵۷۶ صفحوں پر مشتمل ہے گویا یہ ضخامت تقریباً دگنی

ہے۔ پہلے ایڈیشن میں غالب کے ۱۴۶ اور موجودہ ایڈیشن میں ۱۸۲ شاگرد شامل ہیں۔ دوسرے ایڈیشن میں ایسے دو تین شاعروں کو شامل نہیں کیا گیا۔ جو پہلے ایڈیشن میں تھے لیکن بعد کی مالک رام صاحب کی تحقیق نے ثابت کیا کہ وہ غالب کے شاگرد نہیں ہیں۔ دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مالک رام صاحب نے جو دیدہ ریزی کی ہے، اس کا مجھے ذاتی طور پر علم ہے اور اس کتاب پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے مصنف کی محنت اور دقتِ نظر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب کے شاگردوں کے بارے میں ہر ممکن ماخذ کی تلاش کر کے ان کے حالات بیان کئے گئے ہیں اور ان کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب بھی دیا ہے۔ اس موضوع پر اردو میں یہ واحد کتاب ہے ممکن ہے اس کتاب میں مالک رام صاحب سے کچھ سہو ہوئے ہوں یا کچھ تحقیقی غلطیاں ہوئی ہوں پھر بھی پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اردو کی تحقیقی کتابوں کی کتنی ہی مختصر فہرست بنائیے، یہ کتاب اس فہرست میں ضرور شامل ہوگی۔ جب تک کہ اردو میں غالب کا نام زندہ رہے گا "فسانۂ غالب" اور "تلامذۂ غالب" کے حوالے سے مالک رام صاحب کا نام بھی ادب و احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ ایک محقق اور مصنف کی زندگی بھر کی کمائی بس یہی تو ہوتی ہے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری

اُردو ادب میں مرقع نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ اس کے اوّلین نقوش ہمیں "آبِ حیات" میں ملتے ہیں، جو کئی اعتبار سے ایک بنیادی اور منفرد کارنامہ ہے۔ محمد حسین آزاد نے جس مخصوص صنفِ ادب اور طرزِ نگارش کی طرح ڈالی تھی، اُسے ان کے بعد کے آنے والوں نے پروان چڑھایا۔ اور فروغ بخشا، اور اس میں خاطر خواہ اضافے کئے۔ مرقع نگاری کا فن سوانح نگاری کے فن سے اسی طرح مختلف ہے، جیسے افسانہ نگاری باقاعدہ ناول نگاری سے۔ باقاعدہ مفصل اور مبسوط سوانحِ حیات اور بھرپور ناول کے مقابلے میں مرقع اور افسانے کا رقبہ محدود اور متعین ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کی صرف ایک قاش پر روشنی ڈالی جاتی ہے، لیکن اس انداز سے کہ اس پر پوری زندگی اور اس کی توانائیوں اور تنوعات کا قیاس کیا جا سکے۔ حافظے کے خزانوں کو کھنگالنا اور ان میں سے ایسے عناصر کو منتخب

کرنا، جو معنی خیز ہوں اور ممدوح کی شخصیت کی بازآفرینی میں بھی ممد ہوں، اس کے لئے ایک طرح کی معروضیت بھی درکار ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک طرح کی ذہنی اور جذباتی وابستگی اور ہمدردی بھی۔ معروضیت اس لئے کہ تصویر کے پیش کرنے میں اس کے نقوش متناسب رہیں اور وابستگی اور ہمدردی اس لئے کہ اس کے بغیر شخصیت کی گرہیں کھولنے کے کام میں کامیابی مشتبہ ہے۔

آزادی کے بعد جن لوگوں نے اس صنف ادب میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اور اس کے لازوال نمونے پیش کئے، ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈپٹی نذیر احمد اور وحید الدین سلیم کے مرقعے معرکتہ الآرا کہے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالحق کا مجموعہ "چند ہمعصر" رشید احمد صدیقی کے "گنجہائے گرانمایہ" اور "ہمنفسانِ رفتہ" میں شامل مرقعے، شاہد دہلوی کا "گنجینۂ گوہر"، چراغ حسن حسرت کی "مردم دیدہ"، شوکت تھانوی کا "شیش محل" کنہیالال کپور کے بعض خاکے، اور عصمت چغتائی کا "دوزخی" ان سب کو استناد کا درجہ حاصل ہے۔ یہ سب ایسے ادبی کارنامے ہیں، جن کی اہمیت مسلّم ہے۔ اور جنہیں عرصے تک بھلایا نہیں جا سکے گا۔ مالک رام صاحب کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ وہ تحقیق کے مردِ میدان ہیں، اور بس اس میں شک نہیں کہ "ذکرِ غالب" "تذکرۂ معاصرین" کی متعدد جلدیں اور "عورت اور اسلامی تعلیم" ایسی تالیفات ہیں جو اپنے موضوع پر گرانقدر ہیں لیکن مرقع نگاری کے فن میں "وہ صورتیں الٰہی" ایک بہت دلچسپ اضافہ ہے۔ یہ دس قلمی خاکوں پر مشتمل ہے۔ مالک رام سلجھے ہوئے دل و دماغ کے آدمی ہیں، کثیر الاحباب ہیں صدق و مروّت و اخلاق کا پیکر مجسم ہیں، سیلانی انسان ہیں۔ وضعداری اور دوستی کو نبھانے والے ہیں۔ سرد و گرم زمانہ چشیدہ ہیں۔ انہوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی اور صحبتیں اٹھائی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اس تہذیب و ثقافت کے پروردہ ہیں اور اس کی بنیادی اقدار میں ایمان و ایقان رکھنے والے ہیں، جو اب محض داستان پارینہ ہو کر رہ گئی ہے۔ سفر، کتابیں، تصنیف و تالیف، دوستی اور محبت کے رشتوں کا احترام اور ان کی پاسداری انہیں دل و جان سے عزیز اور ان کے لئے جزوِ زندگی ہے۔

ایسے شخص کو مرقع نگاری کا اگر چسکا پڑ جائے تو کامیابی کے امکانات روشن اور یقینی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسی دسترس محض اتفاقی طور پر حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے واجب اور مقدم ہے، ایسا ذہن اور مزاج، جس میں رواداری اور لچک ہو۔ ہمدردی اور بھلمنساہٹ ہو، اور جو واقعات اور تاثرات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان سے ایسے نتائج کا استنباط کر سکتا ہو، جو اس کے مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہوں، اس میں کامیابی کا انحصار تین عناصر پر ہے۔ اوّل ممدوح کی شخصیت کے بیرونی خد و خال کی مصوری دوسرے اس سے جذباتی ہم آہنگی اور ارتباط اور عام طور پر وسیع انسانی ہمدردیاں، اور تیسرے واقعات اور تجربات کا موزوں انتخاب، جن سے ممدوح کی شخصیت کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہو، اور جو عام طور پر دلچسپی کا باعث ہوں۔ سائل دہلوی، نواب صدر یار جنگ، سید سلیمان ندوی اور جگر مراد آبادی کی تصویر کشی میں یہ سب عناصر ہمارے سامنے ابھرتے ہیں۔ اوّل الذکر میں سے ایک شخصیت کو ظاہری طور پر اس طرح متعارف کرا دیا گیا ہے۔

> زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستّر برس کا سن کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم، میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، لمبوترا کتابی چہرہ کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوکدار ناک، گلے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سفید داڑھی جو ایک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں سر پر ہلکی سی پلے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے

میں کاج پٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا
کرتا، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا اڑا پاجامہ
پاؤں میں خورد نوک کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں
لکڑی اور بائیں ہاتھ میں سگریٹ کا بکس اور
دیا سلائی کی ڈبیا۔ یہ تھے نواب سراج الدین
احمد خان سائل دہلوی۔

اور پنڈت دتا تریہ کیفی کا حلیہ اس طرح پیش کیا ہے۔

بہت مختصر قد، پانچ فٹ سے کسی طرح زیادہ نہ
ہوگا، آفتابی چہرہ، فراخ پیشانی سر پر مختصر کھچڑی
بال، سفید زیادہ، سیاہ کم، اندر دھنسی ہوئی
نیلگوں آنکھیں، نیکھی ناک، چھوٹے چھوٹے
نتھنے، جھریوں بھرا چہرہ، کلوں کے نیچے اور
گردن پر لٹکتا ہوا گوشت، داڑھی مونچھ کا صفایا
تنگ دہانا۔ مصنوعی دانت، جوانی میں رنگ ضرور
کھلتا ہوا اور صاف ہوگا۔ لیکن اب سنولا گیا تھا

دو اور مرقعوں میں محبت اور ہمدردی کی اس لہر کو، جو ممدوح اور مرقع نگار کو ایک وحدت میں ڈھال دیتی ہے، اس طرح منقش کیا گیا ہے۔ نواب صدر یار جنگ سے تجدید ملاقات کا حال ملاحظہ کیجئے۔

ملا احمد نے کہا ذرا اونچا کہئے۔ چنانچہ منھ کان
کے قریب لے جاکر خاصی اونچی آواز سے کہا:۔
آداب عرض کرتا ہوں۔ چند لمحے تک غور سے دیکھا
کئے۔ میں نے بھی نام نہیں بتایا، اور چپ چاپ
ان کے منھ کی طرف دیکھتا رہا۔ یک لخت پہچان کے

سروقد کھڑے ہوگئے۔ اور لپٹا لیا۔ اللہ اکبر اس معانقے کی گرمجوشی سے آج تک لذت اندوز ہو رہا ہوں۔

اسی طرح پنڈت ونا تریہ کیفی سے ایک ملاقات کا حال اس سے ملتا جلتا یوں بیان کیا ہے :۔

میں نے ذرا اونچی آواز سے اندر آنے کی اجازت چاہی۔ نظر اٹھا کے دیکھا زبان سے صرف ایک لفظ کہا: آئیے اور ہاتھ کے اشارے سے اجازت دے دی۔ میں اندر گیا تو مجھے غور سے دیکھ کر فرمایا آپ کا اسم گرامی؟ میں نے عرض کیا۔ مالک رام۔ تو فوراً کھڑے ہو گئے اور لپٹا لیا۔ یوں معلوم ہوا، جیسے ان کے قلب سے گرمی کی لہر نکل کر میرے جسم میں داخل ہو رہی ہے

یہ سب شخصیتیں ہماری تاریخ اور ہماری ادبی روایت کی بڑی ہی معتبر، محترم اور محبوب شخصیتیں ہیں۔ ان سب سے مالک رام صاحب کے تعلقات گہرے اور مراسم صدق دلی اور اخلاص قلب پر مبنی تھے۔ کیسے کیسے لوگوں سے ان کا سابقہ رہا۔ اور کتنے طویل عرصے تک! اور یہ سب باہمی تعلقات نبھانے میں کس وضعداری کا نمونہ تھے ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے تو بہت لوگ واقف ہیں۔ لیکن کم لوگ یہ جانتے ہونگے کہ یہ دیو قامت انسان، اپنے اپنے فن میں منتہی ہونے کے علاوہ نجی زندگی میں کیسے مخلص، بے ریا اور وضعداری اور وسعت اخلاق کا نمونہ تھے۔ ان سب میں انفرادی خصوصیات کے فرق کے باوجود جو قدر مشترک تھی، وہ تھی انسانی ہمدردی اور تعلقات کو برقرار رکھنے میں رواداری اور سیر چشمی۔

دوارکاداس شعلہ

مالک رام طبعی اور فطری بیباختگی کے باوجود خود ساختہ انسان ہیں۔ اوّل تو انسان ہونا ہی بڑی بات ہے، اس پر اگر اس شرف میں خود ساختگی کو بھی دخل ہو۔ تو شرف اور شرافت دو آتشہ ہو جاتے ہیں۔ سنتا ہوں بچپن میں ان کے مالی حالات اس درجہ ناماعد ہو گئے تھے کہ اس ہونہار بروا کی تعلیم کے مصارف کے کفیل بھی نہ ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود یہ چکنا پات اپنی چکنا ہٹ کے بل بوتے پر خود بڑھتا اور ٹرھتا چلا گیا یہ پڑھنے اور بڑھنے کا شغل تو کیا ختم ہونا، مدرسوں اور دانشگاہوں کے درجے ختم ہو گئے۔ درجے ختم ہونے پر بھی ان کی دیدہ ریزی کا شوق ختم نہ ہو سکا کہ

بُری عادت کوئی بھی ہو بآسانی نہیں جاتی

میں مالک رام کی ادبی اور علمی سرگرمیوں سے واقف تھا ان کی تحقیقی فتوحات سے آگاہ تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ بسلسلۂ ملازمت کوئی بڑے افسر بھی ہیں اور یہ جانتا بھی کیونکر کہ ان کی وضع قطع میں نہ کبھی افسری کی خو دیکھی، نہ بو۔ ہمیشہ عام بس سے سفر کرتے، لباس صاف ستھرا ضرور پہنتے، مگر ایسا ہی جیسا بابو لوگ عام طور پر پہنتے ہیں، اس میں بھی افسرانہ پیوند کہیں نظر نہ آیا۔ مجھ کو یہی خیال آیا کہ بہت ہونگے تو کسی دفتر میں ہیڈ کلرک ہونگے یا کہیں کے سپرنٹنڈنٹ میں نے زیادہ ٹوہ کی بھی کوشش نہ کی آخر اس کی ضرورت بھی کیا تھی! مگر ایک دن اتفاق سے یہ راز کھل گیا اور یہ اتفاق بھی دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ میں اپنی قرول باغ والی دکان میں بیٹھا حسب معمول گاہکوں کی ریلہ دیکھ رہا تھا کہ ایک چمکیلی لمبی سی موٹر کار دکان کے سامنے آکر رکی ڈرائیور نے جھٹ سے اُتر کر عقبی دروازہ کھولا، ایک سردار صاحب بڑے ٹھاٹھ سے اُترے اور دکان میں تشریف لائے۔ ملازم سے کہا "مجھے دوارکاداس صاحب سے ملنا ہے"۔ میں حاضر ہوا تو فرمایا" مالک رام صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ مجھے کچھ دوائیوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کہا' میرے بھائی کی دکان سے لے لیجئے۔ مناسب قیمت پر تازہ اور اچھی چیز مل جائے گی"۔ میں نے ان سے نسخے لے کر تیاری کے لئے ملازم کے حوالے کئے اور انہیں قریب کی کرسی پر بٹھایا۔ اتنے میں کہ دوائیاں تیار ہوں، ہم باتیں کرتے رہے۔ وہ مالک رام

کی تعریف نیازمندانہ فرما رہے تھے۔ میں نے پوچھا "سردار صاحب! آپ کو بھی کچھ ادبی ذوق ہے؟" انہوں نے پوچھا "وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے سوال کو آسان بنا کر پیش کیا "آپ بھی کچھ لکھتے ہیں؟" فرمایا "ہاں جی دفتر میں لکھنا تو پڑتا ہی ہے"۔ میں نے وضاحت کی "میرا مقصد تھا کوئی کہانیاں یا شعر وغیرہ"۔ فرمایا "نہیں جی!" میں نے کہا "مجھے اس کا خیال یوں ہوا کہ مالک رام صاحب تو بڑے ادیب ہیں، شاید آپ کو بھی اس کا شوق ہو"۔ کہنے لگے۔ "نہیں جی! وہ میرے افسر ہیں اور بڑے نیک افسر"۔ اب میں اس شش و پنج میں کہ ایسی شاندار موٹر اور قیمتی سوٹ والا افسر مالک رام کا ماتحت کیونکر ہوا۔ موٹر تو خیر مانگے کی بھی ہوسکتی ہے۔ مگر سوٹ تو یقیناً سردار صاحب کا اپنا ہے۔ میرے دوست کے جسم پر ایسی عمدہ تراش خراش کے کپڑے کہاں ہوتے تھے۔ اب میں یہ جاننے کے لئے بیتاب تھا کہ مالک آخر ہے کیا؟ مگر پوچھوں تو کیونکر کہ سردار صاحب خیال کریں گے۔ یہ عجیب احمق آدمی ہے، جسے یہ تک نہیں معلوم کہ اس کا بھائی کس عہدے پر ہے۔ اتنے میں نسخے تیار ہوگئے، دوائیاں پیش کی گئیں، تو سردار صاحب نے قیمت پوچھی میں نے کہا "چھوڑیئے، آپ میرے بھائی کے دوست ہیں۔ یہ دوکان ہی ان کی ہے۔ قیمت کا کیا سوال ہے؟" فرمایا نہیں صاحب! یہ تو نہیں ہوگا، یہی کیا کم ہے کہ تسلی بخش چیز مل گئی اور یہ کہہ کر بااصرار بل طلب فرمایا اور قیمت ادا کردی۔ جاتے جاتے رک گئے میری خوش اخلاقی کی تعریف کی یا اپنی خوش اخلاقی کا ثبوت۔ فرمایا۔ آئندہ ہمارے محکمے سے متعلق کوئی خدمت ہو تو بھائی صاحب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں، مجھے حکم دے دیا کیجئے، یہ لیجئے میرا تعارفی کارڈ۔ یہ صاحب کنٹرولر آف امپورٹس تھے۔ میں انہیں گاڑی تک پہنچا آیا۔ شام کو حسب معمول لپکتے لپکتے ہمارے بھائی صاحب بھی آگئے۔ میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "کیوں صاحب تم کنٹرولر آف امپورٹس بھی ہو؟" فرمایا "ہاں کیوں کیا بات ہے؟" میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ! تم عجیب بے تکے انسان ہو، آج تک بہ نہ بتایا کہ تم یہ بھی ہو۔ ہم لوگ تو تمہارے دفتر کے طواف کرتے کرتے پریشان ہوجاتے ہیں"۔ فرمایا "تم نے پوچھا کب کہ میں بتاتا۔ خیر اب کبھی کوئی کام ہو تو بتا دینا"۔ مگر یہ بات

جب کی ہے کہ حضرت تبادلے پر مصر جانے کے لئے پابرکاب تھے۔

اسی زمانے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے، جس سے مالک رام کی بیٹل و دیانتداری کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ آپ کنٹرولر آف امپورٹس ہیں، تو انھی دنوں کلکتے کی ایک بڑی کمپنی کے مالک دلی آئے۔ ہم شمالی ہند کے لئے اس کمپنی کے مال کے واحد تقسیم کنندگان تھے۔ وہ اپنے امپورٹ لائسنس کے حصول کے چکر میں آئے تھے۔ مجھ سے ذکر کیا تو میں نے بیتکلف کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں، یہ کام میرے ذمّے کر دیجئے۔ مالک رام صاحب سے اگر درخواست مناسب ہوئی، اور کمپنی امداد کی مستحق، تو جو مدد ہو سکتی ہے، کروں گا۔

میں نے دوسرے دن اپنے چھوٹے بھائی کو ہمراہ کیا یہ لوگ ان کے پاس پہنچے اور مستحق قرار پائے۔ چنانچہ درخواست منظور ہو گئی۔ صاحب ان کی تعریف میں رطب اللسان تشریف لائے۔ مدح سرائی ہو چکی تو پوچھا ان کے احسان کے جواب میں کیا خدمت کی جائے۔ میں نے کہا کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے فرمایا پھر بھی کچھ تو ہو۔ میں نے کہا کہ ہاں، دعائے خیر سے یاد فرما لیا کیجئے۔ معاملہ ختم ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد کمپنی کا نمائندہ کلکتے سے دلی آیا۔ تو اپنے ساتھ چھ بڑے بڑے کوزے رسگلوں کے لایا۔ رسگلے تو خیر پہلے بھی کلکتے والے تحفۃً بھیجتے ہی رہتے تھے۔ مگر اب کے مقدار زیادہ تھی۔ میں نے تحفہ وصول کیا اور شکر ادا کیا تو اس نے یہ پیغام دیا کہ ڈاکٹر صاحب (کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر جو پہلے تشریف لائے تھے) کی خواہش ہے کہ ان میں سے کچھ مالک رام صاحب کو بھی پہنچائے جائیں۔ میں نے ان کی خواہش کے احترام میں وعدہ کیا اور پوچھا ان میں سے ان کا حصّہ کتنا ہے؟ فرمایا ایک یا دو یا جیسا آپ مناسب سمجھیں میں نے کہا بھجوا دوں گا میں نے دو کوزے اپنے یہاں بھیجوا دئے ایک اپنے اس بھائی کو دیا جو علاحدہ رہتے تھے، باقی کی تقسیم میں مشکل یہ آ پڑی کہ میں بہنوں کے یہاں سوغات ضرور بھجوانا چاہتا تھا اور دلّی میں میری دو بہنیں ہیں۔ چنانچہ میں نے خیانت کی اور ایک ایک ان دونوں بہنوں کو بھجوا دیا۔ اور مالک رام کے لئے ایک کوزہ رہنے دیا کہ وہ کہاں کے ایسے شکر خور ہیں اور پھر یہ

خیال کر کے دل کو تسلّی دے لی کہ آخر دو کی تجویز بھی تو میری ہی تھی، ورنہ معاملہ تو مجھ ہی پر موقوف ہے، جس قدر چاہوں دے دوں۔ خیر شام کو میں یہ کوزہ لے کر مالک رام کے یہاں پہنچا یہ حسب معمول اپنی کرسی سے چسپاں چشمہ لگائے، مطالعے میں مشغول تھے، شام گہری ہو چکی تھی میں نے دوسری کرسی پر سے کتابوں کو اٹھایا اور میز کے انبار میں ان کا اضافہ کر دیا۔ میں نے سلام کیا تو حسب معمول "آپ آگئے" کہہ کر جواب دیا۔ پہلا چشمہ اتارا اور دوسرا چڑھایا اور یوں دیکھا، گویا پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اتنے میں میرا ڈرائیور کوزہ لے آیا میں نے اسے فرش پر رکھوا لیا کہ اور کوئی مناسب جگہ نظر نہ آئی۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا مٹھائی وٹھائی ہوگی۔ اس پر بےساختہ بچوں کو آواز دی، آفتاب سلمان! یہاں آنا، دیکھو، تمہارے چچا کیا لائے ہیں! آفتاب نے دروازے سے جھانکا، مگر پلٹ گیا، سمجھا ہوگا کہ اس چچا کو خدا سے یہ توفیق ہی نہیں ملی کہ کبھی بچوں کے لئے کچھ لائے اور ابا کی دعوت محض مذاق ہوگی یا اس بخیل کو سمجھانے کے لئے حسن طلب۔ اب انہوں نے پھر صدا لگائی: میاں پلیٹ ولیٹ لاؤ۔ اب کے چھوٹا بیٹا سلمان ایک پلیٹ لے آیا۔ مالک رام نے کوزے کو اپنی طرف سرکا کر کھولا، اور کہا یہ تو رسگلے معلوم ہوتے ہیں اور ساتھ ہی پوچھا "یہ کس تقریب کے سلسلے میں لائے ہو؟" رسگلے بڑے بڑے تھے۔ انہوں نے دو پلیٹ میں نکالے کہ میں نے اتنے میں جس شخص نے بھیجے تھے، ان کا نام لیا اور کہا کہ یہ وہی دوست ہیں۔ جن پر آپ نے کرم فرمایا تھا۔ اس پر انہوں نے آہستگی سے (یوں کہ انہیں ٹھیس نہ لگ جائے) وہ دونوں رسگلے کوزے میں ڈال دیئے۔ اور اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے میری طرف سرکا دیا اور سنجیدگی سے کہا "ان لوگوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے کوئی لین دین نہیں، تم جو چاہو لاؤ، اور سو مرتبہ لاؤ، مجھے لینے میں عذر نہیں ہوگا لیکن اُن سے کچھ قبول کر لوں، یہ میرا ضمیر گوارا نہ کرے گا اور تم، بحیثیت دوست کے یہ کبھی پسند نہیں کرو گے کہ میں کوئی ایسا کام کروں جو میرے ضمیر پر بار رہے۔" اس پر میں نے کہا "اور اگر میں کہتا کہ میں لایا ہوں!" تو فرمایا "میں بلا تکلف لے لیتا، مگر تم تم نہ رہتے کہ میں تم سے سنجیدگی میں جھوٹ تو در کنار، مبالغے کی بھی توقع نہیں کرتا۔" میں نے ان

کی طرف غور سے دیکھا تو یوں محسوس ہوا، جیسے ان کے چہرے کے گرد ایک روشنی کا ہالہ سا ہو۔ مزید بحث کی جرأت نہ ہوئی، سلمان سے کہا "میاں! یہ کوزہ باہر میری گاڑی میں چھوڑ آؤ۔ بچہ کوزہ لے کر باہر چلا گیا، تو مالک رام نے نہایت اطمینان سے کہا "دیکھو بھئی! کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے جس شخص کا کام کیا تھا۔ وہ دراصل مستحق تھے اور تم صرف ان سے تعارف کی حد تک ذمہ دار۔ اگر وہ واقعی مستحق نہ ہوتے، تو میں تم سے صاف کہہ دیتا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں۔ اور ہاں، اگر اس قسم کے مستحق لوگ اور بھی تمہارے پاس آئیں، تو بلا تکلف انہیں میرے پاس بھیج دیا کرو، ان کی جو خدمت مجھ سے ممکن ہوگی ضرور کرونگا۔"

پنڈت ہری چند اختر کا انتقال ہوا، تو ان کے پسماندگان کی خدمت کے لئے عرش ملسیانی نے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ پنڈت جی کی وفات کے وقت ان کے گھر والوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اور تو اور وفات تک ان کی پنشن کا معاملہ بھی کھٹائی میں پڑا تھا مزید برآں کئی ماہ کی تنخواہ بھی حکومت کے ذمے واجب الادا تھی۔ غرض حکومتِ ہند، حکومتِ پنجاب، حکومت کشمیر کو بھی امداد کے لئے درخواست بھیجی گئی۔ اور ہر درخواست تحقیقات کے لئے دلّی آئی۔ نائب تحصیلدار مونسگانی کرتا۔ ہر پیشی پر پنڈت جی کے عزیزوں کے ہمراہ میں اور عرش ہر عدالت میں حاضر ہوتے کہ بزعم خود معتبر تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ عرش کو عین وقت پر نزلہ ہو جاتا اور نہ آسکتے یا میں شستر غمزے کا اظہار کرتا، تو مالک رام اطلاع ملتے ہی پہنچ جاتے۔ گواہی کی ضرورت ہوتی، تو گواہی دیتے، ضمانت کی حاجت ہوتی، تو ضمانت گواہی اور ضمانت تو خیر بڑی بات نہ تھی کہ گواہی سچّی اور ضمانت برحق تھی۔ مگر خوبی کی بات یہ کہ ٹیلیفون پر پیغام ملتے ہی دوڑے چلے آرہے ہیں۔ کبھی یہ نہ کہا کہ میاں! ضرورت تھی، تو پہلے سے کہا ہوتا۔ یا کبھی اپنی مصروفیت ہی کا اظہار کرتے کہ آخر مصروف انسان ہیں۔ اور پھر جلد اور بروقت پہنچنے کے لئے ہمیشہ ٹیکسی پر آنا ہوتا، حال آنکہ عام طور پر بس وغیرہ میں سفر کرتے ہیں۔

کچہری پہنچ کر کبھی افسرانہ شان نہیں دکھائی۔ انتظار کرنا پڑا، تو غلام گردش میں کھڑے رہے عدالت نے یاد فرمایا تو فوراً حاضر ہو گئے۔ پتا گھر کا بتایا، کاروبار پوچھا گیا، تو نشنا ختی

کارڈ پیش کر دیا ہمیں بھی پتا نہ چلا کہ دراصل اس بزرگ کا روزگاری شغل کیا ہے۔ عدالت سے چھٹی ملی، تو پنڈت جی کے بچّوں کو ٹیکسی میں گھر پہنچا کر واپس ہوئے۔ مالک رام خدا ترس تو ہے ہی۔ خود شناس بھی ہے، اس کو کبھی دون کی لیتے سنا، نہ دیکھا یہ بات تو نہیں کہ اسے اپنے مرتبے کا علم نہ ہو۔ مگر ضبط کا یہ عالم ہے کہ کبھی فخر تک کو قریب نہ آنے دیا، غرور تو بہت دور کی بات ہے۔

ایک مرتبہ حفیظ دلّی آئے، تو مالک رام بھی میرے ہمراہ ہونے کے باعث پلیٹ میں آ گئے میں تو حفیظ کا شاگرد ہوں، ان کی خدمت میں رہنا مجھ پر فرض ہے۔ مگر یہ بایں علم و دانش و بایں رتبہ واقتدار محض میری وجہ سے نیازمندی کا دم بھرنے لگے۔ نتیجہ یہ کہ دوپہر سے رات کے دو بجے تک مجلسوں اور مشاعروں میں خوار پھرتے اور بھوکے پیاسے جذبۂ دوستی کو بہلاتے رہتے میری حیثیت تو مالک رام کے مقابلے میں پرِ کاہ کی سی ہے، حفیظ بھی تو بلند مرتبہ شاعر ہونے کے باوجود فن اور مطالعہ اور وسعت معلومات میں مالک رام کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے حفیظ بحیثیت شاعر جو جی میں آئے لکھتے ہیں مالک رام بحیثیت محقق اور تذکرہ نویس نپی تلی بات کہتے ہیں۔ حفیظ کی بات سے اختلاف ممکن ہے۔ لیکن ان کے فرمودہ میں حرف گیری کی گنجائش نہیں کہ جو کہتے ہیں، با ثبوت کہتے ہیں۔ فرق ظاہر ہے شاعری کی رونق حقیقت نگاری کے دعوے کے باوجود مبالغہ اور ایہام وابہام کی مرہون منت ہے تحقیق کا تعلق واقعیت سے ہے۔ بسا اوقات انبار در انبار کتابیں اور مسودے دیکھنے کے بعد گوہر مراد حاصل ہوتا ہے اور کبھی یہ بھی نہیں ہوتا، کوہ کندن و کاہ برآوردن والا معاملہ۔ مگر مالک رام کی ہمت اور خاطر جمعی کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ نہ دیدہ ریزی سے گھبراتے ہیں، نہ محنت سے جی چراتے ہیں۔ اس علم و فن کے باوجود حفیظ کے معاملے میں ان کا انکسار، ان کی رواداری اور دوست نوازی کی روشن مثال ہے۔

ان کی وضعداری کا ایک اور واقعہ سنئے۔

دوستی کے معاملے میں انکسار وایثار ان کے مزاج کے ترکیبی عناصر ہیں۔ ۱۹۵۷ء کے اواخر میں یا شاید ۱۹۵۸ء کے شروع میں دلّی میں اُردو کانفرنس ہوئی تھی۔ یہ مجھے بھی ساتھ

لینے گئے۔ ان کا شمار ہمارے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے اور ان کے پاس اسٹیج پر بیٹھنے کا خاص دعوت نامہ بھی تھا۔ میں تین میں، نہ تیرہ میں، یہ ان کے مزاج کے خلاف کہ اپنی برگزیدگی کے بل بوتے پر مجھے بھی اسٹیج پر بٹھا لیتے۔ نتیجہ یہ کہ ہم دونوں اسٹیج کے سامنے نیچے زمین پر بیٹھ گئے اور زمین کا بھی وہ حصہ جہاں فرش تو خیر درکنار، گھاس بھی نہ تھی۔ غرض ہم تین چار گھنٹے تک جاڑے کے برفا دینے والے موسم میں نم آلود زمین پر بیٹھے رہے۔ اس دوران میں کارکنانِ مجلس نے بارہا ان سے کہا۔ یہ آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ اپنی جگہ پر چلئے۔ آپ کا یہاں بیٹھنا ہم سب کی توہین ہے۔ میں نے بھی التجا کی کہ آپ چلے جائیے۔ میں بہت آرام سے بیٹھا ہوں مگر یہ شیلد نوازی کے صدقے مسند نشینی کی جگہ خاک نشینی کے مزے لیتے رہے۔

ایم حبیب خاں

مالک رام صاحب بنیادی طور پر محقق اور ماہر غالبیات ہیں۔ انھوں نے " وہ صورتیں الٰہی " میں جو مرقع لکھے ہیں وہ یقیناً ان کے شاہکار کہے جا سکتے ہیں۔ ہر ادیب شاعر اور عالم دین کے حالات اس طرح سے تحقیق کر کے شگفتہ اور دلنشیں انداز میں پیش کئے ہیں کہ کتاب کا ہر مرقع زندگی کی تصویر معلوم ہوتا ہے انھوں نے اس میں ایسی نئی راہ نکالی ہے جس کا تعلق انسان کی نجی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔ ان مرقعوں میں خاکے کی وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جن سے وہ عبارت ہیں عالم دین نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمان خاں شروانی کے خاکے کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

" خاصا لانبا قد۔ کوئی چھ فٹ کے قریب، کسرتی جسم سرخ و سپید رنگت۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی ستواں ناک۔ خضاب لگی بھرواں ڈاڑھی، خضاب لگے کچھ دن ہو چکے تھے کیوں کہ جڑوں میں سپیدی جھانکنے لگی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی جس سے سامنے کے دانت نمایاں ہو گئے تھے اور ان کے پان کے شوق کے غماز تھے۔ جسم پر بند گلے کا شیروانی نما گرم کوٹ اور نیچے غالباً اسی کپڑے کا پاجامہ تھا۔ سر پر ٹوپی تھی

اور اس کے اوپر منڈا سے کی شکل میں سپید شال
اوڑھے تھے، ایسے خوبصورت اور جامہ زیب آدمی میں
نے بہت کم دیکھے تھے، بہت تپاک سے ملے، اور اٹھا کے
اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے، برآمدے
میں سے گزرتے ہوئے فرمایا "آپ نے خط کیوں نہ لکھا؟
اسٹیشن سے یہاں تک آنے میں تکلیف تو ہوئی ہوگی
آپ کو؟ مکان تو آسانی سے مل گیا تھا؟ آپ نے لکھا
ہوتا تو میں کسی کو اسٹیشن بھیج دیتا"۔[1]

چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسی روانی اور سادگی سے نواب صاحب کا حلیہ بیان کیا ہے
کہ کم پڑھا لکھا انسان بھی اس کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں مرقع نگار
کا حلیہ بیان کرنے کا خاص ملکہ ہے۔ کتاب میں دس خاکے ہیں جو سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں
اس میں سے جن ادیبوں، شاعروں نقادوں اور صحافیوں کے انھوں نے نقشے کھینچے ہیں ان سب سے
ان کے گہرے تعلقات اور روابط تھے اور وہ سب معاصرین ان سے گہری محبت اور انسیت رکھتے تھے۔

آزادی کے بعد جن لوگوں نے اس فن میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور لازوال نمونے اردو
والوں کے سامنے پیش کئے ان میں مرزا فرحت اللہ بیگ، ڈپٹی نذیر احمد، وحید الدین سلیم، اور خواجہ
حسن نظامی کے بہترین مرقع کہے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس صنف کو مولوی عبدالحق، رشید احمد
صدیقی، شاہد احمد دہلوی، اور مالک رام صاحب نے چند ہم عصر، ہم نفسان رفتہ "گنجینۂ گوہر" اور "وہ صورتیں الٰہی" کے
ذریعہ آگے بڑھایا۔ مالک رام صاحب کے ان خاکوں کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ رشتوں کا
احترام ان کی پاسداری اور وضع داری انھیں دل و جان سے عزیز ہے۔ اس لئے وہ صورتیں الٰہی مرقع
نگاری کے فن میں ایک دل چسپ اضافہ ہے۔

---

[1] "وہ صورتیں الٰہی" ص ۹۷

شمیم جہاں

مالک رام صاحب مکتوب نگار کی حیثیت سے

مالک رام صاحب کا نام ان محققوں میں شامل ہے جنھوں نے اپنے ہمعصر ادیبوں، شاعروں اور دیگر حضرات کو بے شمار خطوط لکھے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ رہی کہ مالک رام صاحب کی زندگی کا بڑا حصّہ ہندوستان سے باہر گزرا ہے۔ ان کا حلقۂ احباب ادیبوں اور شاعروں پر مشتمل تھا جن سے رابطے کا واحد ذریعہ خط و کتابت ہی تھا۔ اسی لیے انھوں نے ہندوستان اور پاکستان میں مقیم سیکڑوں ادیبوں شاعروں اور مدیروں کو بہت زیادہ خطوط لکھے اور جب وہ ریٹائر ہو کر ہندوستان میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے تب بھی خطوط لکھنے کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اس کے علاوہ اسی زمانے میں ایک اور وجہ سے اُن کے مکتوب الیہ کا حلقہ وسیع ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ ۱۹۶۷ء میں مالک رام صاحب نے اپنے دوستوں کی اعانت سے "تحریر" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا جو ۱۹۷۸ء تک برابر نکلتا رہا۔ تحریر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے مالک رام صاحب نے لوگوں کو بڑی تعداد میں خطوط لکھے۔

مالک رام صاحب نے 'وفیات' کے عنوان سے 'تحریر' میں باقاعدہ طور پر مختصر مضامین لکھنے شروع کیے۔ یہ مختصر سے سوانحی مضامین زمانۂ حال میں فوت ہونے والے ادیبوں اور شاعروں پر لکھے جاتے تھے۔ مرحومین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مالک رام صاحب کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بہت سے لوگوں کو خطوط لکھنے پڑتے تھے۔ مالک رام صاحب کے مکتوب الیہم میں ادیبوں، شاعروں کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل تھے جو کسی مرحوم ادیب یا شاعر کی اولاد میں سے تھے یا ان کے رشتے دار یا دوستوں میں تھے۔ اس طرح مالک رام صاحب کے مکتوب الیہم کا حلقہ پہلے سے بہت وسیع ہو گیا کیوں کہ اس حلقے میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ 'وفیات' کے تحت مالک رام صاحب نے جو مضامین لکھے تھے وہ "تذکرۂ معاصرین" میں شائع ہو چکے ہیں، جو مکتبہ جامعہ سے چار جلدوں میں چھپی ہے: پہلی جلد ۱۹۷۲ء دوسری ۱۹۷۶ء تیسری ۱۹۷۸ء اور چوتھی جلد ۱۹۸۲ء میں چھپی۔ ان چاروں جلدوں میں تقریباً ۲۱۹ شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے حالات

زندگی اور ان کا نمونۂ کلام شامل ہے،

میں نے اب تک مالک رام صاحب کے تقریباً دو سو خطوط کا مطالعہ کیا ہے جو انھوں نے مختلف لوگوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوط کی پہلی چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے اپنے دوستوں، شاعروں اور ادیبوں کو ایک خط بھی شوقیہ نہیں لکھا مطالعہ شدہ خطوط میں سے میری نظر سے ابھی تک ایسا کوئی خط نہیں گزرا جس میں محض خیر و عافیت پوچھی گئی ہو۔ ہندوستان کے باہر انھوں نے اپنے دوستوں کو جو خطوط لکھے تھے ممکن ہے ان میں خیر و عافیت کے خطوط بھی ہوں، لیکن ریٹائر ہونے کے بعد جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں ان میں بیشتر ادبی مسائل سے متعلق ہیں یا کسی کو شکریے یا مبارک باد کا خط لکھا گیا ہے کسی کے خط کا جواب دیا گیا ہے یا پھر کسی کام کے متعلق لکھا ہے۔ اختصار اور غیر ضروری باتوں سے بچ کر نکلنے کے باوجود ان کی تحریر کی جاذبیت اور حسن میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مالک رام صاحب کا اپنا ایک مخصوص اور محتاط سا انداز ہے جو ان کی تحریریں ہی نہیں بلکہ ان کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے مالک رام صاحب شوقیہ خط نہیں لکھتے بلکہ کسی وجہ سے لکھتے ہیں اس کی وجہ میری سمجھ میں صرف یہی آتی ہے کہ ان کی ادبی اور دیگر مصروفیات ان کو کوئی شوقیہ کام کرنے کا موقع نہیں دیتیں۔ دوران ملازمت اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی ان کی مصروفیت کا یہی عالم ہے۔ ۲۵/ اپریل ۱۹۶۵ کو مالک رام صاحب ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور ان کے ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی ڈاکٹر ذاکر حسین نے انھیں ساہتیہ اکیڈمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کتابیں مرتب کرنے کا کام سونپ دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ان کی علمی اور ادبی مصروفیات میں برابر اضافہ ہوتا رہا جس کا اثر ان کی صحت پر بھی خاصا پڑا۔ خراب صحت کی بنا پر ڈاکٹروں نے ان کو لکھنے پڑھنے سے منع کر دیا۔

آگے بڑھنے سے پہلے ایک واقعہ سنا دوں جس سے اندازہ ہوگا کہ مالک رام صاحب کو لکھنے پڑھنے سے کتنا عشق ہے۔ وہ شاید کچھ دن کھانے کے بغیر تو زندہ رہ سکتے ہیں لیکن مطالعے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہوا یوں کہ مالک رام صاحب کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ گزشتہ سال ان کی ایک آنکھ کا آپریشن ہوا آپریشن بہت کامیاب رہا۔

دس دن بعد مالک رام صاحب نے ڈاکٹر سے لکھنے پڑھنے کی اجازت مانگی۔ ڈاکٹر سمجھا کہ وہ اخبار اور خطوط لکھنے پڑھنے کی اجازت مانگ رہے ہیں۔ اس نے اجازت دے دی۔ لیکن مالک رام صاحب

نے اجازت ملتے ہی باقاعدہ مطالعہ کرنا اور لکھنا شروع کردیا دو تین دن بعد ایک رات کو اُس آنکھ میں اس قدر تکلیف ہوئی کہ اگر بروقت طبی امداد نہ دی جاتی یا ڈاکٹر ہوشیار نہ ہوتا اور قسمت ساتھ نہ دیتی تو خدا نہ کرے آنکھ کی بینائی بھی جا سکتی تھی۔ اس بے احتیاطی کی سزا مالک رام صاحب کو تقریباً دو مہینے اٹھانی پڑی۔

معاف کیجئے جملۂ معترضہ کچھ طویل ہوگیا، دراصل یہ واقعہ بیان کرنے سے میرا مقصد یہ بتانا تھا کہ مالک رام صاحب کی زندگی کا اوڑھنا، بچھونا صرف کتابیں ہیں ان کا ڈرائنگ روم جو خاصا بڑا ہے اور صرف مالک رام صاحب کے استعمال میں رہتا ہے۔ وہاں کتابوں کے انبار میں مالک رام صاحب غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتے ہیں۔

انہی علمی و ادبی مصروفیات میں سے خطوط لکھنے کے لیے مالک رام صاحب وقت ضرور نکال لیتے ہیں۔ اور ان کے بیشتر خطوط کا موضوع علمی اور ادبی مسائل ہوتا ہے۔ اور جو خطوط انھوں نے کسی کام کے سلسلے میں لکھے ہیں اُن میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا ہو جسے زائد کہا جا سکے۔ وہ خطوط میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں لکھ جاتے ہیں۔

بیشتر لوگوں کے خطوط ان کے سوانح نگاروں کے لیے بہت مواد فراہم کرتے ہیں کیوں کہ مکتوب نگار خود اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے بارے میں تفصیلی واقعات تحریر کرتا ہے لیکن مالک رام صاحب کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ مالک رام صاحب خطوط لکھتے ہوئے اپنی ذات کو یکسر فراموش کردیتے ہیں۔ وہ مکتوب الیہ کو اپنے بارے میں صرف اتنی بات لکھتے ہیں جس کا مکتوب الیہ کے لیے جاننا ضروری ہے۔ وہ خط میں جو معلومات دیتے ہیں یہ معلومات مختصر اور سیدھے سادے الفاظ میں ہوتی ہیں۔ نہ کوئی بناؤ نہ گھماؤ، نہ اشارہ نہ کنایہ، بس جو کچھ کہنا چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں۔ یہی کھلاپن اور صاف گوئی ان کی شخصیت کا بھی وصف ہے۔ بات سچی کہتے ہیں سچی لکھتے ہیں چاہے کسی کو کڑوی کیوں نہ لگے۔ علمی مسائل میں وہ کسی کے علمی و ادبی سوال کا جواب دیتے ہیں یا خود کسی مسئلے پر استفسار کرتے ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے خطوط خود ان کی زندگی کے بارے میں تو اہم معلومات فراہم نہیں کرتے یا بہت کم کرتے ہیں لیکن بے شمار ادبی اور علمی مسائل پر بیش بہا روشنی ڈالتے ہیں۔ مالک رام صاحب کی نثر کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ یہ تصنع یا بناوٹ سے یکسر پاک ہے۔ ایک اعلیٰ درجے

کے نثر نگار کی طرح وہ خطوط بھی قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ بے تکلفی اور برجستگی کی ایک فضا ان کے خطوط میں شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ صاف اور بات چیت کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ جن لوگوں کو مالک رام صاحب سے اکثر ملاقات کا شرف حاصل ہوا ہے یا بے تکلف محفلوں میں مالک رام صاحب کی صحبت اٹھائی ہے وہ میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ مالک رام صاحب کے خطوط پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے بے تکلفی سے گفتگو کر رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ مالک رام صاحب اپنے بارے میں بہت کم لکھتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے معاملات دکھ یا سکھ میں ان کی گہری دلچسپی رہتی ہے۔ اگر مکتوب نگار یا اس کا کوئی عزیز بیمار یا کسی پریشانی میں ہوتا ہے تو مالک رام صاحب اس کی خیر و عافیت ضرور دریافت کرتے ہیں اور پریشانی و دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔

مالک رام صاحب کے جو خطوط میرے پیش نظر ہیں ان میں اور باتوں کے علاوہ ایک خصوصیت مجھے یہ نظر آتی ہے کہ خط زیادہ طویل نہیں ہیں ان کا کوئی بھی خط ایک ڈیڑھ صفحے سے زیادہ طویل نہیں ہے ہو سکتا ہے انھوں نے کچھ طویل خط بھی لکھے ہوں لیکن اس وقت ایسا کوئی خط بھی میرے سامنے نہیں ہے۔ لیکن ان کے محتاط اور لگے بندھے انداز کو دیکھتے ہوئے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اس طرح کے خطوط کی تعداد یقیناً بہت کم ہوگی۔ خطوط میں اختصار کی بعض معقول وجوہ ہماری سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ مالک رام صاحب اپنے علمی کاموں میں ہمہ وقت مستغرق رہتے ہیں اس کے علاوہ ان کاموں سے جو تھوڑا بہت وقت ان کو ملتا ہے وہ ادبی محفلوں کی نذر ہو جاتا ہے اس عمر اور کمزور صحت کے باوجود وہ بہت سے علمی اور ادبی اداروں سے منسلک ہیں کہیں صدر ہیں کہیں سکریٹری اور کہیں چیرمین وغیرہ وغیرہ اس طرح ظاہر ہے کہ ان کو فرصت سے بیٹھ کر خط لکھنے کے مواقع کم ہی میسّر آتے ہیں۔ لیکن ان کی زندگی میں جو نظم و ضبط اور رکھ رکھاؤ ہے اسکی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مالک رام صاحب نہ تو ضروری خطوط کا لکھنا ٹالتے ہوں گے اور نہ جواب طلب خطوط کے سلسلے میں خاموشی اختیار کرتے ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے خطوط لکھنے سے متعلق عہدہ برآ ہونے کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ وہ مختصر خطوط لکھنے پر ہی اکتفا کریں لیکن مختصر ہونے کے باوجود ان کے خطوط کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ کم الفاظ میں وہ تمام باتیں آجاتی

ہیں جن کا لکھنا ضروری ہے۔ خط میں ادھورے پن اور تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ بالفاظ دیگر وہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ مالک رام صاحب کے مختصر خطوط لکھنے کی دوسری بڑی وجہ ان کا محقق ہونا بھی ہے۔ مالک رام صاحب اردو کے اعلیٰ پائے کے محقق ہیں اور تحقیق میں انشا پردازی اور طول کلامی کی گنجائش نہیں ہوتی اور جو آدمی پچھلے پچاس ساٹھ برسوں سے تحقیق کے کاموں میں منہمک ہو تو پھر یہ اس کی زندگی کا مزاج بن جاتا ہے کہ وہ معمولاتِ زندگی میں بھی اور تحقیق کے علاوہ اپنی دوسری تصانیف میں بھی براہِ راست اندازِ بیان سے کام لے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مالک رام صاحب کے خطوط عام طور پر مختصر ہوتے ہیں مالک رام صاحب نے جتنے بھی خطوط اب تک لکھے ہوں گے ظاہر ہے ان کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ ان تمام خطوط کو سامنے رکھ کر جب دیکھا جائے گا تو بہت سے علمی مباحث اور ان کی ذات سے متعلق بہت سے دلچسپ حقائق ہمارے سامنے آئیں گے۔ اس مضمون میں شامل یہ تمام خطوط مالک رام صاحب کی مکتوب نگاری کی چھپی ہوئی اور بعض بہت اہم خصوصیات پر پوری طرح روشنی ڈالنے کے لیے ظاہر ہے ناکافی ہیں اور اسی لیے ان خطوط کی بنیاد پر مالک رام صاحب کی مکتوب نگاری کے بارے میں کوئی آخری رائے نہیں دی جا سکتی۔ میرے اس مختصر مضمون کا مقصد مالک رام صاحب جیسی شخصیت کی مکتوب نگاری کی اہمیت کی طرف محض توجہ دلانا ہے۔ اس اعتبار سے ان خطوط کا مطالعہ بھی یقیناً مفید اور اس طرف ایک قدم ہوگا۔

انجمن کے خطوط سیکشن میں مالک رام صاحب کے خطوط کی بہت بڑی تعداد موجود ہے اور میری ناقص معلومات کے مطابق مالک رام صاحب کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ ان کے ہمعصروں اور ان سے کم عمر ادیبوں کے پاس موجود ہے۔

میں مالک رام صاحب کے خطوط جمع کر رہی ہوں۔ یہ کام میں نے گزشتہ سال سے شروع کیا ہے اور اس میں میرے مخلص مہربان دوستوں اور بزرگوں نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے میری درخواست پر انھوں نے مالک رام صاحب کے خطوط کی بڑی تعداد مجھے عنایت کی ہے۔ ان مخلص حضرات میں جناب جگن ناتھ آزاد صاحب، جناب گوپی چند نارنگ جناب نثار احمد فاروقی جناب ظفر ادیب مرحوم اور جناب عبدالمغنی صاحب ہیں۔ میں ان حضرات کی شکر گزار ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آئندہ بھی مجھے ان کا تعاون حاصل رہے گا۔ جناب مشفق خواجہ صاحب اور جناب کالی داس گپتا رضا صاحب نے بھی وعدہ

فرمایا ہے کہ وہ اپنے نام مالک رام صاحب کے خطوط عنایت فرمائیں گے تاکہ میں انھیں مرتّب کر کے کتابی صورت میں شائع کر سکوں۔ اس کام میں وقت لگے گا۔ یہاں میں مالک رام صاحب کے چند خطوط پیش کر رہی ہوں۔
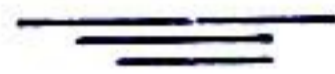
مکتوب الیہم

پروفیسر گیان چند جین

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ڈاکٹر خلیق انجم

پروفیسر گوپی چند نارنگ

پروفیسر نثار احمد فاروقی

ڈاکٹر عبدالمغنی

سرور تونسوی

ظفر ادیب

ہمت رائے شرما

پروفیسر گیان چند جین

نئی دلّی

(۱)

۲۸ اپریل ۱۹۷۳ء

مکرمی آداب

میں پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ ہم تینوں ۷ مئی کو علی گڑھ سے رام پور جائیں گے۔ وہاں سے حضرت مولانا عرشی مدظلہ' العالی کا جواب آ گیا ہے کہ ۷ مئی کو آجائیے۔ جن اصحاب سے وہاں بات چیت کرنا ہے' انھیں بھی اطلاع دے رہا ہوں ۷ مئی سہ پہر میں رضا لائبریری میں اجتماع ہوگا۔ عرشی صاحب لکھتے ہیں کہ رامپور میں آج کل سبزی ترکاری بالکل نہیں مل رہی ہے' اگر کوئی صاحب گوشت سے پرہیز کرتے ہوں' تو انھیں رامپور میں گھاس کے سوائے اور کچھ کھانے کو نہیں ملے گا۔ مجھے تو آپ کا خیال ہے۔ بہتر ہوگا آپ اپنے لیے ترکاری پکوا کے جموّں سے ساتھ لے آیئے' ورنہ رامپور میں گھاس کھانا پڑے گی۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۲)

۲۶ دسمبر ۱۹۷۴ء

محبی آداب

آج پندرہ روپے کا منی آڈر موصول ہوا۔ کوپن پر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ شعبے کی طرف سے ۱۹۷۵ء کا چندہ ہے حقیقت یہ ہے کہ شعبے کی طرف سے ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک تین برس کا چندہ واجب الادا ہے۔ کم از کم میری حساب کی کتاب یہی بتاتی ہے۔ کرم ہوگا اگر شعبے سے معلوم کرکے اطلاع دیں کہ کیا ان تین برس کا چندہ ادا کیا گیا ہے! اگر جواب اثبات میں ہو' تو معلوم ہو جائے کہ یہ کیسے ادا کیا گیا! شکریہ۔ ڈاکٹر نارنگ والی تقریب میں آپ نہ آسکے بہت دوست جمع ہو گئے تھے اچھی رونق رہی گھر میں میری طرف سے سب نمستے قبول کریں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

۲۱ نومبر ۷۵ء (۳)

محبّی۔ کیا آپ مجھے رشید احمد صدیقی کے فن کے کسی پہلو پر ایک مضمون دے سکتے ہیں؟ میں ان کے مزاح یا خاکہ نگاری کو ترجیح دوں گا، لیکن ظاہر ہے کہ اصرار نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کوئی اور موضوع پسند کریں تو اسی پر لکھیے۔

اور یہ فوراً بتایئے کہ کب تک یہ مضمون بھیج سکینگے؟ میں ممنونِ احسان ہوں گا اگر یہ دو تین ہفتے میں مہیا ہو سکے۔ شکریہ پیشگی۔

آپ کے پچھلے خط کا جواب عنقریب حاضر کر دوں گا بس توفیقِ خداوندی کے لیے دعا کرتے رہیے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

۲ مئی ۷۷ء (۴)

محبّی، ۲۸ اپریل کے گرامی نامے اور مبارک باد کا دلی شکریہ۔ حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے یہ خط لکھ رہا ہوں اور اس کے لیے معذرت خواہ ہوں اگر ڈاکٹر نارنگ صاحب نے جانے سے پہلے ملاقات کی زحمت فرمائی، تو تحریر کا تازہ شمارہ بھی بھیج دوں گا، جو دو ایک دن میں آنے والا ہے۔

بحمدہٗ میری صحت تسلی بخش ہے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت پر عمل پیرا ہوں آپ بھی دعاؤں میں یاد رکھیے۔

مسز گیان چند نمستے قبول فرمائیں۔ اب آپ کے نیاز کب اور کہاں حاصل ہوں گے؟

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

(۱)

۱۲ نومبر ۸۵ء

برادرِ عزیز۔ گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ ہوتے تو سب کو خوشی ہوتی، لیکن مجبوری ہے۔

سرور تونسوی صاحب نے آپ کو کنور مہندر سنگھ بیدی سحر صاحب سے متعلق مضامین دیے تھے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ انھیں مرتب کر کے شائع کرنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ پس آپ انھیں ساتھ لیتے آیئے گا۔ یعنی اگر حیدرآباد جاتے ہوئے یہاں دلّی ہمیں نہ دے سکیں تو حیدرآباد لیتے جایئے اور واپسی پر مجھے دے دیجیے۔۔ یہ ضروری کام ہے۔ آپ کی پیدائش عیسیٰ خیل کی ہے۔ یا کلدر کوٹ کی ؟۔

کملا رانی نمستے قبول کریں۔ والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۲)

۵/ فروری ۱۹۷۴ء

برادرِ عزیز۔ افسوس کہ آپ کی آخری آمد دلّی کے موقع پر ملاقات نہ ہو سکی آپ نے بھی اتنے دن کے قیام میں دوبارہ کوشش نہ کی۔

مجھے آج تک سرینگر ریڈیو والوں کی طرف سے 'بیرونی' والی تقریر کا معاوضہ نہیں ملا۔ رقم اتنی تھوڑی ہے کہ بار بار کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے، آخر اس میں مانع کیا ہے ؟ اور خود آپ نے اسے سائیکلو اسٹائل کرا کے چند نسخے بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی پورا نہ ہوا میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے آپ کو یاد ہوگا کہ عادل رشید کے بارے میں 'تحریر' میں جو مضمون چھپا تھا اُس کے شروع میں نوح ناروی کا ایک مصرع دیا تھا:

پھر چڑھیں ریل پر اور پہنچیں سرا تھو، سرا تھو سے نو میل دکھن ہے نارہ

آپ نے ایک ملاقات کے دوران میں اس کا پہلا مصرع پڑھا تھا اسے بھول گیا ہوں ذرا لکھ بھیجیے تاکہ اسے محفوظ کر لوں۔ کملا سے نمستے کہیے بچوں کو پیار والسلام

خاکسار مالک رام

(۳)

۹/ دسمبر ۱۹۸۵ء

برادرِ عزیز۔ میں نے لکھا تھا کہ سرور تونسوی نے آپ کو جو مضامین کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

سے متعلق دیے تھے وہ مجھے بھیج دیجیے۔ وقت تنگ ہو رہا ہے اور ان تمام مضمون کو دیکھنا اور ان کی کتابت کرانا ہے پس یہ کام بلا تاخیر کر دیجیے۔

کل اخبار میں جانکی ناتھ زتشی کے انتقال کی خبر پڑھی ان کے مفصل حالات درکار ہیں، یہ کیوں کر ہوا ؟ بملا سے نمستے کہئے۔ جواب فوراً دیجیے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۴)

۱۸ر جنوری ۱۹۷۳ء

برادرم آپ سرینگر پہنچ کر بھول گئے۔ آج تک نہ بیرونی والے مضمون کے نسخے موصول ہوئے نہ AIR کی طرف سے کوئی رقم۔ ذرا توجہ دلائیے۔

دوسری بات وہی سید میر قاسم صاحب سے "نذر عابد" کے لیے کچھ دلوانے کی ہے۔ زیدی صاحب نے بھی غالباً ان کی خدمت میں اس سلسلے میں ایک خط لکھا ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ کیا اس کے بارے میں کچھ نہیں ہو سکتا ؟ مجھے یہ سارا خرچ اپنی جیب سے دینا پڑے گا۔ میں نے یہاں کشمیر ایمپوریم میں اپنا آدمی بھیجا تھا کہ وہاں سے شہد لے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ ہمارے ہاں کا اسٹاک ختم ہو چکا ہے۔ پس اگر کوئی آنے والا ہو تو اس کے ہاتھ دو بوتل شہد بھیج دیجیے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

ڈاکٹر خلیق انجم

(۱)

یکم فروری ۱۹۶۶ء

مکرمی ! میں آپ سے محروم صاحب سے متعلق کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہوں کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ اتوار ۶ فروری کو آپ ساڑھے تین بجے سہ پہر کو چائے میرے ساتھ پئیں۔ شکریہ۔ میرا مکان بستی نظام الدین کے مقابل ساہی ہسپتال کے نزدیک شاہراہ پر ہے۔ بس ۱۸۔ ۲۴۔ ۲۹۔ تینوں اس کے قریب ٹھہرتی ہیں، ۱۸ شاہراہ پر اور اس سے چند قدم واپس آنا پڑتا ہے دوسری دونوں ۲۴ اور ۲۹ مکان کی پشت پر ٹھہرتی ہیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۲)

۱۲/اپریل ۱۹۶۶ء

مکرمی: اگر کسی وقت فرصت ملے تو مجھے ٹیلیفون کر لیجیے آپ سے کچھ کام ہے۔ میرا نمبر ساہتیہ اکاڈمی میں یہ ہے (۴۳۵۸۱)۔ والسلام

خاکسار مالک رام

(۳)

۲۶/جون ۱۹۸۶ء

آپ اقبال کی سوانح عمری "زندہ رود" کی تین جلد لے گئے تھے۔ پہلی جلد کی ضرورت ہے۔ اگر ممکن ہو، تو یہ بھجوا دیجیے۔ شکریہ! مالک رام

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(۱)

قاہرہ ۷/۳/۱۹۵۹ء

مکرم بندہ! تسلیمات

دونوں گرامی نامے ملے۔ پہلے میں آپ نے بے صبر کے دیوان کی مطلوبہ چیزیں نقل کر کے بھیجنے کی زحمت گوارا فرمائی، اس کے لیے شکریہ قبول فرمائیے۔

منشی جیون لال صاحب نے جو سکہ غالب سے منسوب کیا ہے، اس سے متعلق یقین سے کچھ لکھنا تو ناممکن ہے، لیکن ایک بات ہے کہ منشی صاحب موصوف دربار میں حاضر نہیں ہوں گے۔ وہ کمشنر دہلی کے دفتر میں ملازم تھے شورش کے بعد وہ سانڈرس کمشنر کے منشی تھے۔ غالب کی ان سے ملاقات تھی اور ان کے ایک خط میں جو انھوں نے میر مہدی مجروح کے نام لکھا ہے، ان کا نام آیا ہے۔ تو خیر، مدعا یہ کہ انگریزی ملازم ہونے کی وجہ سے غدر کے ایام میں ان کا ظفر کے دربار میں آنا جانا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ سکہ انھوں نے غالب سے منسوب کیا ہے تو ظاہر ہے کہ کسی نے ان سے یوں کہا ہو گا اب اس دوسرے شخص کی روایت کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ گوری شنکر کی روایت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے میرا خیال ہوتا ہے کہ غالبًا یہ سکہ بھی غالب نے نہیں لکھا تھا۔ خود غالب بھی کسی سکہ لکھنے سے انکاری ہیں۔ واللہ اعلم انشار کا دیوان کون سے مطبع اور کس سنہ کا ہے؟ کیا قایم کا دیوان وہی ہے جو

حسرت موہانی نے کسی زمانے میں شائع کیا تھا یا کوئی اور نسخہ؟ کیا میر کا کلیات بازار میں ملتا ہے؟ اس کا ناشر کون ہے اور کیا دام ہیں؟

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۲)

برسلز ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۶۱

جناب بندہ ۲؍ اکتوبر کے گرامی نامے کا شکریہ

خوشی ہوئی کہ "ذکرِ غالب" کی کتابت شروع ہو گئی ہے۔ خدا کرے انھوں نے کاتب کوئی ڈھنگ کا اس کام پر لگایا ہو۔ پچھلی مرتبہ کی کتابت مجھے پسند نہیں تھی۔ لیکن میں ان ایام میں مصر میں تھا۔ جب تیسرا ایڈیشن لکھا گیا ہے۔ اگرچہ اس کی کاپیاں میں نے دیکھ لی تھیں کیوں کہ اس وقت تک میں دہلی پہنچ گیا تھا، اب کے یہ بھی ممکن نہیں۔

آپ نے کسی خط میں لکھا تھا کہ آخری پروف آپ میرے پاس بھیجنا چاہتے ہیں۔ بے کار جھنجھٹ کے علاوہ یہ غیر ضروری بھی ہے۔ مسودہ صاف ہے اگر پہلے کاپیاں احتیاط سے دیکھ لی جائیں اور بعد کو پروف، تو غلطی کا امکان کم رہ جائے گا۔ کاپی میں اصلاح ہو جائے تو اس سے یہ فائدہ ہے کہ پتھر پر کام بہت کم ہوگا۔ قاضی صاحب نے لکھا تھا کہ انھوں نے اپنے آخری سفرِ دہلی کے دوران میں "معاصر ۶" کا ایک شمارہ آپ کو دیا کہ مجھے بھجوا دیا جائے۔ یا آپ نے خود ان سے یہ طے کر لیا کہ اسے میرے پاس بھیج دیں گے۔ یہ بھیج دیجئے گا۔ اس میں ایک مضمون "خاشش و خماش" سے متعلق ہے اس میں سے مطبع اور سنہ اشاعت دیکھ کر "ذکرِ غالب" کتابیات میں مناسب جگہ پر اضافہ کر لیجئے۔ کتاب کا نام پہلے سے وہاں موجود ہے۔ مطبع کا نام اور سالِ اشاعت "معاصر" سے دیکھ کر درج کر لیجئے۔ شکریہ۔ گھڑی سے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا، یہ غالباً ممکن نہیں ہوگا۔ یہاں جو کوئی بھی آتا ہے گھڑی ضرور ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ پچھلے مہینے یہ لوگ سوئٹزرلینڈ گئے تھے اور وہاں سے دو دو گھڑیاں خرید لائے ہیں، حالانکہ انھیں ساتھ صرف ایک فالتو گھڑی لے جانے کی اجازت ہے، ورنہ بمبئی میں محصول داخلہ دینا پڑے گا اور یہ گھڑی کی قیمت کے برابر ہے اس صورت میں قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ میں گھڑی کے بھیجنے کا ان شاء اللہ کچھ اور انتظام کروں گا۔ آپ یہ لکھیے کہ آپ کو کونسی گھڑی

درکار ہے۔ بھیجنے سے متعلق پھر لکھوں گا۔ بظاہر پہلوان کے معنی کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتے۔ آپ نے ریڈرشپ کی جگہ سے متعلق کچھ نہیں لکھا کہ تقرری سے متعلق کیا فیصلہ ہوا۔ حالانکہ پہلے آپ نے لکھا تھا کہ اس کے بارے میں عنقریب اعلان ہونے والا ہے۔

والسلام والاکرام
خاکسار مالک رام

(۳)

برسلز: ۳ جنوری ۱۹۶۲ء

مکرمی ۱۷ دسمبر کے گرامی نامے کا شکریہ۔

"ذکر غالب" کی کتابت سے متعلق مجھے واقعی تشویش ہو رہی ہے۔ تاباں صاحب کا خط ملا تھا اور میں نے اس کا جواب بھی پچھلے ہفتے لکھ دیا تھا آج ایک اور خط لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی ان سے ملیے اور ان سے کہیے کہ وہ اس طرف توجہ کریں۔

اگر آپ آزاد کتاب گھر سے دریافت کریں کہ تلامذۂ غالب کی کتابت کس نے کی تھی (ان صاحب کا نام غالباً محمد شفیع تھا) تو پتا لگا ہے کہ کچھ وہ ذکر غالب کی کتابت کر سکتے ہیں، لیکن ان سے طے کر لیجیے کہ وہ اس کام کو ایک مہینے میں ختم کریں گے۔ یوں ان کاتبوں کا دین ایمان کوئی نہیں اور وہ ایک ہی وقت میں چار چار جگہ کام لے لیتے ہیں اور سب کو دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ بہرحال آپ تاباں صاحب سے مشورہ کر کے محمد شفیع صاحب سے ملیے۔ خدا کرے سہگل صاحب والی چیزیں آپ لے آئے ہوں۔ سہگل صاحب عنقریب سیگون جانے والے ہیں۔ میں نے اس معاملے کی لالہ دوارکا داس صاحب کو اطلاع نہیں دی تھی۔ ذرا عجلت سے کام لیجیے۔ اوشا واپس چلی گئی ہے اب گھڑی جلد نہیں بھیجی جا سکتی۔ آپ کا خط بھی کرسمس کے بعد ملا اور مجھے علم بھی نہیں کہ کرسمس کے ایام میں کوئی خاص رعایت ہوتی ہے۔ وزارت کے ذریعے اب چیزیں مسٹر نریش گھوشال کے حوالے سے بھیجی جا سکتی ہیں یہ وزارت خارجہ (P.C.S. Section) میں کام کرتے ہیں ان سے مل کر طے کرنے کی کوشش کیجیے یہ خط بہت عجلت میں لکھا ہے ڈاک بند ہو رہی ہے اس لیے؛ میں نے یہ چند سطریں جلدی میں گھسیٹ ڈالی ہیں۔

والسلام خاکسار مالک رام

برسلز ۹ اگست ۱۹۷۱ء

(۴)

بندہ نواز۔ امید ہے کہ میرا گزشتہ ہفتے کا خط بھی مل گیا ہوگا۔

ابھی مسودے میں ایک جگہ تبدیلی کی ضرورت ہے اور یہ 'سبد باغ دو در' کا مضمون ہے، لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک میگزین کا وہ شمارہ میں نہ دیکھ لوں جس میں یہ شائع ہوا ہے۔ اس لیے مہربانی فرماکر اسے جلد بھجوانے کی کوشش کیجیے گا۔ کیا اس کے بعد انھوں نے اس کا نثری حصہ شائع نہیں کیا؟ اگر یہ بھی شائع ہوگیا ہو تو وہ شمارہ بھی بھجوا دیجیے گا۔

یہاں بفضلہ تعالیٰ سب افرادِ خانہ بخیر ہیں اور دعاگو۔

والسلام والاکرام

کتابیات میں چند اضافے کرنا تھے، امید ہے کر دیے گئے ہوں گے۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

۷/۱۲/۱۹۵۸ء

(۱)

بندہ نواز آج آپ کا دوسرا خط ملا جس سے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ میں نے آپ کے گزشتہ خط کا جواب لکھا وہ موصول نہیں ہوا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ آپ کا پتا غیر محفوظ ہے۔ میں نے اس خط میں لکھا تھا کہ المنجد/۴۲ روپے دام کی ہے۔ اس کا ایک نیا اڈیشن کوئی سال بھر ہوا چھپا تھا۔ یہ کتاب اچھی ضخیم اور وزنی ہے اس لیے اسے ڈاک میں بھیجنے سے بہت خرچ آجائے گا۔ غالباً مہینے ایک تک یہاں سے ایک صاحب دلّی جا رہے ہیں ان کے ہاتھ ایک نسخہ بھیج دوں گا۔

یہاں بفضلہ تعالیٰ کم و بیش سب تندرست ہیں۔ معمولی شکایت تو لازمۂ بشریت ہے اس سے مفر نہیں۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی حفظ و اماں میں رکھے۔ آمین۔

سب پرسانِ حال سے سلام کہیے گا   والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

ہاں ایک اور بات بھی اس میں لکھی تھی کہ عنایت علی آہ، حاتم علی مہر کے چھوٹے بھائی تھے نہ کہ بیٹے جیسا کہ آپ نے برہان کے ایک مضمون میں لکھا تھا۔ یہ آتش کے شاگرد تھے۔ مہر نے ناسخ سے اصلاح لی۔

(۲)

قاہرہ ۱۷/ دسمبر ۱۹۵۹ء

کرم فرمائی من، ۱۲/۳ کے گرامی نامے کا شکریہ۔ آپ کی پریشانیوں کا حال پڑھ کر افسوس ہوا خدا کرے اب آپ کو اطمینان حاصل ہو گیا ہو۔

سنہا صاحب کا کام بہت معلق ہو گیا۔ خدا معلوم، وہ کیا خیال کرتے ہوں گے میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ آپ نے اسے مکمل کر کے ان کے حوالے کر دیا ہو گا۔ چونکہ یہاں آنے کے بعد ہماری خط و کتابت نہیں رہی اس لیے انھوں نے بھی نہیں لکھا بہرحال جتنی جلد یہ کام ہو جائے اچھا ہے تاکہ ایک ذمے داری جو لی گئی ہے اس سے گلو خلاصی ہو۔ ہاں ان کی کہانیوں میں جان ہونا، یا نہ ہونا یہ ان کا اپنا معاملہ ہے۔ آپ ترجمہ کر کے ان کے حوالے کر دیجیے۔ بقیہ سے ہمیں سروکار نہیں تلامذۂ غالب بازار میں ہے۔ ہر ایک شخص اس پر گفتگو اور جرح کرنے میں آزاد ہے۔ اگر آپ کو بھی اس سے اختلاف ہے تو آپ بھی اپنی رائے کے اظہار میں پوری طرح آزاد ہیں۔ جب مضمون شائع ہو گا تو دیکھوں گا انشاء اللہ "میری کی آپ بیتی" پر انعام کی خبر سے خوشی ہوئی۔ مبارک ہو اور دعا ہے کہ خداوند کریم اسے مزید ترقیات اور خدمات کا پیش خیمہ ثابت کرے پگڈنڈی کا پرچہ نہیں ملا یہاں بحمدہٖ تعالیٰ تمام افراد قافلہ بخیر ہیں فالحمد للہ علیٰ ذالک سب احباب سے سلام کہیے گا۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۳)

۳/ مارچ ۱۹۶۰ کرم فرمائے من۔ ۲/۱۲ کے گرامی نامے کا شکریہ۔

اگر آپ کے خیال میں وہ مضمون "خرافات" کی قسم سے تھا تو اسے شائع نہیں ہونا چاہیے تھا اور اگر یہ سنجیدہ چیز تھی، تو آپ کو اس کے لیے بار بار معذرت کرنے کی ضرورت نہیں رہی آپ کی اس پر آمادگی کہ اگر مجھے اس کے مندرجات سے کہیں اختلاف ہو تو آپ تلافی کر دیں گے تو جہاں اس کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں وہیں یہ بھی کہنے سے نہیں رک سکتا کہ اب اس کا کون موقع ہے مضمون چھپ گیا اور اگر اس میں کوئی اغلاط ہیں (اور واقع میں ہیں بھی) تو اب تلافی کیسے ہو سکتی ہے بہر حال آپ نے جن اغلاط اور میرے تسامحات کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا شکریہ۔ اگر کبھی کتاب کی طبع ثانی کا موقع آیا تو انھیں نظر میں رکھوں گا۔

خدا کرے جناب اشک صاحب نے پورا غور کرلیا ہو کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ پگڈنڈی کا مرسلہ پرچہ مجھے نہیں ملا۔

میرے مضامین کی اشاعت کا مسئلہ ابھی قبل از وقت ہے۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ ڈل کی جو تاریخ وفات ان کے صاحبزادے نے لکھی ہے، طبعاً وہی درست ہے اور اس میں مزید تردد کی ضرورت نہیں۔

آپ نے سنہا صاحب کی کتاب اور اس کے ترجمہ سے متعلق پھر کچھ جواب نہیں دیا۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۴)

۲۵ ستمبر ۱۹۷۰ء

مکرمی جناب نثار احمد صاحب آداب

میں ابھی ابھی ڈائری دیکھ رہا تھا، تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا، میں نے آپ کو آئندہ ہفتے کے دن سہ پہر ۴ بجے آنے کے لیے کہا ہے، حالانکہ ہفتے کے دن ہمارا دفتر صرف ۲ بجے تک ہوتا ہے۔ براہ کرم پیر کے دن ۴ بجے تشریف لائیے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ٹیلیفون پر بتائیے کہ کس دن آ سکیں گے۔

والسلام خاکسار مالک رام

اگر ممکن ہو تو "صبا" کا آزاد نمبر بھی تلاش کیجئے۔

ڈاکٹر عبدالمغنی

(۱)

۱۵ دسمبر ۱۹۷۹ء

محب مکرم! سہیل کی اچانک اور بےوقت وفات کا کتنا صدمہ ہوا، بیان نہیں کرسکتا۔ خدا کے کاموں میں انسان کیا دخل دے سکتا ہے۔ راضی برضا رہنے میں ہی دنیا اور آخرت کی عافیت ہے۔ دعا ہے کہ وہ اس کی توفیق ارزانی فرمائے۔

میں نے ان کی بیگم کی خدمت میں آج ہی ایک تعزیتی خط لکھا ہے۔ میں خود پچھلے دنوں بہت

مضمحل رہا اور اس پر افسردگی کا یہ عالم تھا کہ کچھ لکھنے پر طبیعت کسی طرح آمادہ نہیں ہوئی۔ طبیعت بہت افسردہ ہے۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ وہاں جن رسائل وجرائد میں ان کے حالات شائع ہوں ان کے تراشے مہیا کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں اپنے کسی شاگرد کو ہدایت کر دیجئے کہ وہ یہ سب چیزیں جمع کر کے مجھے بھیج دے۔ شکریہ

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

۲۸ ستمبر ۱۹۸۶ء

(۲)

محبّ مکرم! یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے کہ انسان کو ہمدرد اور محبت کرنے والے دوست ملیں اس پہلو سے میں واقعی اس کا شکر ادا کرنے سے قاصر ہوں فالحمد اللہ آپ نے جس محبت سے اوارڈ پر مبارک باد دی ہے سچ مانئے میرے دل پر اس کا بہت اثر ہوا ہے۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش اور کامران رکھے آمین ثم آمین۔

میری صحت ابھی تک تسلی بخش نہیں آنکھوں کی شکایت ابھی ہنوز باقی ہے نقاہت کا کچھ نہ پوچھئے دعا کی درخواست ہے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

۲۹/ مئی ۱۹۸۶ء

(۳)

محبّ مکرم۔ گرامی نامہ ملا۔ تہنیت کا شکریہ قبول فرمائیے۔ مجھے اس سے خوشی ہے کہ اس انتخاب نے میرے متعدد دوستوں کو مسرت کا موقع مہیا کیا اور مجھے معلوم ہوا کہ احباب کو مجھ سے کتنی محبت ہے۔

فالحمد اللہ علی ذالک

والسلام والاکرام خاکسار مالک رام

سرور تونسوی

(۱)

۵ فروری ۱۹۷۵ء

مکرمی جناب سرور صاحب آداب۔

آپ کے ۳ فروری کے گرامی نامے کا دلی شکریہ۔ شاید اس دن مجھے مفتون صاحب کی تعزیتی

تقریب میں دیکھ کر آپ کو لکھنے کا خیال آیا۔ یہ محض مرحوم کی محبت تھی کہ میں نے جانے کی جرأت کی۔

میری صحت ابھی تک سقیم ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام بالکل بند ہے سچ مانئے خط تک لکھنے میں تکلّف ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں نے کچھ ایسی جانگزا پابندیاں عائد کر رکھی ہیں کہ کچھ کرتے نہیں بنتی۔

کنور صاحب میرے پرانے مہربان اور عزیز دوست ہیں انھوں نے اردو کے قیام اور ترویج بالخصوص تقسیم ملک کے بعد جو کام کیا ہے کون اردو داں اس سے انکار کر سکتا ہے؟ آپ ان کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کر کے ہم سب کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں کاش کے میں ٹھیک ہوتا اور اپنی خواہش کے مطابق مضمون لکھ سکتا۔ لیکن میری مجبوریاں آپ سے مخفی نہیں۔ یقیناً آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

ظفر ادیب

برسلز ۲۵ ستمبر ۶۲ء ۱۹ (۱)

جناب ظفرؔ صاحب! آداب

گرامی نامے کا شکریہ

میں نے کیفیؔ صاحب کی زندگی میں ان کی مثنوی 'جگ بیتی' (یہی نام ہے نا؟) سے متعلق ایک خاصا مفصل مضمون لکھا تھا۔ یہ بمبئی کے سہ ماہی رسالے 'نوائے ادب' میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی وفات کے بعد میرا ایک مضمون (یا شاید دو مضمون) متلؔ صاحب کے پرچے تحریک میں بھی چھپے تھے۔ اگر آپ چاہیں، تو انہیں میں سے کوئی مضمون شامل مجموعہ کر لیجیے۔ میں اس پر نظر ثانی کر دوں گا حالات اور میری مصروفیات کچھ اس طرح کی ہیں کہ شاید فوری طور پر تازہ مضمون لکھنا ممکن نہ ہو۔

مرحوم کی سالگرہ پر جو مضمون لکھے گئے تھے۔ وہ میرے علم کے مطابق جناب دھرم پال گپتا صاحب کے پاس تھے۔ آخر ان کے ضائع ہونے کا کیا سبب ہو سکتا ہے! ان سے دریافت کیا آپ نے؟ اور کون اصحاب اس تقریب کے کارفرما تھے؟ ان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ میرے مضمون کا مسودہ میرے پاس نہیں۔ یہ ان کی دونوں تحقیقی نثری کتابوں۔ منشورات اور کیفیہ۔ سے متعلق تھا۔ میں بالعموم اپنے مضامین کے مسودے نہیں رکھتا۔ اگر وہ مضمون دستیاب نہ ہو سکے، تو نیا مضمون اس وقت تک نہیں

لکھا جا سکتا، جب تک یہ دونوں کتابیں میرے پاس نہ ہوں۔ اپنی رائے سے مطلع فرمایئے ماہر صاحب سے میرا آداب کہیے۔ اور کن اصحاب سے آپ نے استدعا کی ہے ؟!

والسلام والاکرام

۲۳/نومبر ۷۷ء خاکسار مالک رام

(۲)

مجتبیٰ ظفرادیب صاحب آداب

یادآوری کا شکریہ۔

صورت حال آپ نے خود اپنے گرامی نامے میں تفصیل سے لکھ دی ہے۔ اور اس پر میری طرف سے اضافہ غیر ضروری ہے۔

میرا ارادہ ضرور اقبال سیمینار میں شرکت کے لیے لاہور جانے کا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحبان مانع آرہے ہیں کہ صحت کی اس حالت میں دوسرے ملک کا سفر قرین مصلحت نہیں ہے بظاہر میری صحت بفضلہ تعالیٰ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں، اس مرض کے اتار چڑھاؤ ایسے ہیں کہ خدا معلوم، کس وقت کیا ہو جائے۔ اور اس کا تو مجھے یقین ہے کہ وہاں زندگی کا پورا پروگرام تلپٹ ہو جائے گا۔ اور مطلوبہ آرام یقیناً نہیں مل سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے پرسوں ۲۵ نومبر کو بلوایا ہے جب طے ہوگا کہ جا سکتا ہوں یا نہیں۔ میں بیشتر گھر ہی پر رہتا ہوں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ یہ قید تنہائی بھی بڑی اذیت ناک ہے کبھی کبھی رسّی تڑا کر گھر سے نکل بھی جاتا ہوں۔ جس سے تھکان تو ضرور ہو جاتی ہے لیکن تھوڑی دیر کی تفریح کے لیے اسے میں برداشت کر لیتا ہوں۔ کل ۲۷ نومبر کو آپ کے وہاں جلسہ ہے عزیزہ حمیدہ سلطان سے میں نے وعدہ تو کر رکھا ہے۔ شاید آنکلوں۔ بہرحال کوشش کروں گا کہ آپ کا مسودہ ایک نظر دیکھ لوں، انشاءاللہ۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۳)

۲۶/مئی ۱۹۷۸ء

حضرت، مجھے سحر عشق آبادی کے حالات آج تک نہیں ملے۔ اور اس سے بہت الجھن ہو رہی ہے فوری توجہ کا خواہاں ہوں شکریہ۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۴)

برسلز ۱۱ ستمبر

جناب ظفر صاحب آداب و تسلیمات

یکم ستمبر کے گرامی نامے کا شکریہ۔

پچھلے چار برس سے شاید ہی آپ نے کسی مجلے، رسالے میں میرا مضمون دیکھا ہو سبب ظاہر ہے! دفتری کام کی وہ بھرمار ہے کہ اللہ کی پناہ، فرصت ہی نہیں ملتی سچ مانئے کہ بعض اوقات کئی کئی دن کتاب کھولنے کی توفیق نہیں ہوتی، لکھنا تو دور کی بات ہے۔

دوسری مصیبت یہ کہ میں ساتھ کتابیں نہیں لایا۔ آپ ہی سوچیے کہ سفر میں پورا کتاب خانہ کہاں کہاں لیے پھروں خانہ بدوشی کی زندگی تو ہے ہی۔ دو برس قاہرہ (مصر) میں گزارے اب دو برس (۲) یہاں ہو گئے۔ خدا معلوم، کل کہاں کا تبادلہ ہو جائے۔

ان حالات میں کوئی تازہ مضمون لکھنے سے معذور ہوں البتہ ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے کیفی مرحوم کی زندگی میں بعض حضرات نے ایک خاص تقریب ان کے اعزاز میں کی تھی۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں سے مضمون بھی لکھوائے گئے تھے۔ میں نے انہیں ایام میں ایک مضمون کیفیہ اور منشورات سے متعلق لکھا تھا۔ یہ مضمون کس صاحب کے پاس ہیں؟ اگر یہ حاصل ہو جائیں تو انہیں میں میرا مضمون بھی نکل آئے گا اسے میرے پاس بھیج دیجیے، میں اس پر نظر ثانی کر کے حاضر خدمت کر دوں گا۔ اگر یہ منظور نہ ہو، تو مرحوم کی کتابیں بھجوا دیجیے، اپنی ذاتی کوشش کر کے مضمون لکھوں گا[۳]۔ میں حتیٰ الوسع اس کتاب میں شامل ہونا چاہتا ہوں، آگے جو خدا کو منظور ہے۔

شاید آپ کو معلوم ہو! مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کوئی صاحب ڈاکٹریٹ کے لیے کیفی صاحب سے متعلق مقالہ لکھ رہے ہیں۔ پارسال ان کا ایک خط ملا تھا۔ نام بھول گیا ہوں۔

۱۔ تاریخ تحریر ہے سنہ نہیں ہے۔ ڈاکخانے کی مہر سے پتا چلتا ہے کہ یہ سنہ ۱۹۶۲ء ہے۔

۲۔ اس میں (سے) زائد ہے۔

۳۔ خط کا کچھ حصہ غالباً چوہے کی نذر ہو گیا ہے اس لیے پڑھا نہیں جاتا غالباً یہ لفظ (لکھوں گا) ہے۔

ماتھر صاحب کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔ اور احباب بھی سلام قبول فرمائیں۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

ہمت رائے شرما

(۱)

۲۴ اپریل ۱۹۸۳ء

کرم فرمائی من جناب شرما صاحب آداب

۱۸/ اپریل کے گرامی نامے کا دلی شکریہ قبول فرمائیے۔ آپ کو مضمون پسند آیا، یہ آپ کی نوازش اور محبت کا نتیجہ ہے، ورنہ میں جانتا ہوں کہ وہ مضمون اس سے زیادہ مفصل ہونا چاہئے تھا وقت کی تنگی کے باعث مکمل طور پر نہیں لکھا جا سکتا بدقسمتی سے مجھے آج تک آپ کی تصنیفات دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جو نہی موقع ملتا ہے، ان سے استفادہ کروں گا۔ انشاء اللہ خدا کرے آپ ہر طرح بخیر و خوبی ہوں۔ آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۲)

۲۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء

محب مکرم شکریہ

خدا کرے، آپ کو اور آپ کے خاندان کو دیوالی کی خوشیاں سال بھر اور ساری عمر حاصل رہیں آمین۔

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

(۳)

۲۶ جون ۱۹۸۳ء

میرے مکرم آداب

بہت دن ہوئے، آپ کا گرامی نامہ ملا تھا اس کے بعد آپ کی دو کتابیں "ہندو مسلمان" اور نکات زباندانی۔ موصول ہوئیں۔ معذرت خواہ ہوں کہ ان کا شکریہ اتنی تاخیر سے ادا کر رہا ہوں۔ کیا

کہوں پیری وصد عیب کے مصداق مختلف مکروہات کا شکار ہوں۔ اسی سے معمولاتِ زندگی درہم برہم ہو گئے ہیں۔

اگر کبھی دلّی کا پھیرا ہوا، تو قدم رنجہ فرمائیے۔ میرا تھوڑا سا وقت خوشگوار ماحول میں بسر ہو جائے گا خدا کرے، آپ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ آمین!

والسلام والاکرام

خاکسار مالک رام

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

سہ ماہی تحریر

تعارف اور مندرجات کا اشاریہ

۱۹۶۶ء میں علمی مجلس دلّی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا بنیادی مقصد اردو میں تحقیق کو فروغ دینا اور معیاری متون کی بازیافت اور ان کی اشاعت کا اہتمام کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ایک ایسے رسالہ کا جاری کرنا بھی تھا جو اس مجلس کے ترجمان کے طور پر کام کرے اور اس کے مقاصد کو آگے بڑھائے۔ چنانچہ یکم جنوری ۱۹۶۷ء کو جناب مالک رام کی ادارت میں "تحریر" کے عنوان سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہوا جو بارہ سال جاری رہ کر ۱۹۷۸ء میں ابدی نیند سو گیا۔ اس کے اجرا کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے اس کے اولین شمارے میں جناب مالک رام تحریر فرماتے ہیں:

> اردو میں علمی تحقیق ابھی ابتدائی مراحل میں ہے اور اس پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جس کی یہ مستحق ہے۔ جب تک کسی زبان میں اعلا پائے کی علمی اور تحقیقی کتابیں نہیں چھپتیں، اس کا وقار قائم نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں ایسے رسالے جو صرف تحقیقی موضوعات کے لیے وقف ہوں گویا ناپید ہیں۔ یاد رہے کہ اگر تعلیم کے نتیجے میں سچائی کی طلب کا صحیح جذبہ پیدا نہیں ہوتا تو ہمارا علم بے مصرف ہے۔ اسی طلب کا دوسرا نام تحقیق ہے۔
>
> ہم چاہتے ہیں کہ اردو میں تحقیقی کام کرنے والے

اصحاب اور اداروں سے تعاون کرکے ایسی چیزیں
منظر عام پر لائیں جن سے واقعی زبان کے سرمایے
میں اضافہ ہو اور اس کا معیار بلند ہو۔ کام بہت
ہے اور کام کرنے والے تھوڑے ہیں۔ ضرورت
اس بات کی ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی صلاحیتوں
کے مطابق کچھ مفید کام کرنے کا موقع دیا جائے۔ علمی
مجلس کا قیام اور ماہی "تحریر" کا اجرا اسی مقصد کے
حصول کے لیے ایک علمی اقدام ہے۔"

ان عزائم کے ساتھ 'تحریر' مطلع صحافت پر طلوع ہوا۔ اور جلد ہی اس نے علمی دنیا کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کرنا شروع کر دیا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی، اور اس میں اس کے مدیر محترم کی بلند قامت شخصیت کا بھی طفیل تھا کہ اسے شروع سے ہی صف اول کی علمی اور ادبی شخصیات کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ ان میں ناقدین بھی ہیں، محققین بھی۔ ماہرین تاریخ بھی ہیں اور ماہرین لسانیات بھی۔ مزید یہ کہ اس محفل میں اردو کے علاوہ فارسی، عربی اور ہندی کے فضلا بھی نظر آتے ہیں۔ ان میں مالک رام صاحب کے علاوہ جناب قاضی عبدالودود، پروفیسر مسعود حسن رضوی پروفیسر نورالحسن ہاشمی، جناب اکبرالدین صدیقی، پروفیسر آل احمد سرور، جناب امیر حسن عابدی، جناب اکبر علی ترمذی، ڈاکٹر نذیر احمد، جناب ضیاء الدین احمد ڈیسائی، ڈاکٹر ایوب قادری، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر مختار الدین احمد، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب عرش ملسیانی، جگر بریلوی، شمس الرحمن فاروقی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، حکم چند نیر، وغیرہ جیسی نادر روزگار شخصیات شامل ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر حضرات نے بھی اپنی رشحات سے اسے نوازا اور اس کے مندرجات میں تنوع پیدا کیا۔ ان کی بدولت اردو میں تحقیق کا معیار بلند ہوا اور اسے ایک متعین سمت عطا ہوئی۔ اس طرح اپنے بارہ سالہ دور حیات میں سہ ماہی تحریر نے ایسے نقوش چھوڑے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے رہیں گے۔
اردو میں تحقیق کا معیار بلند کرنے کے علاوہ تحریر کا ایک اور اہم اور زبردست کارنامہ

اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی 'وفیات' ہے۔ مغربی زبانوں میں بالخصوص انگریزی زبان میں OBITUARY کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے۔ وہاں اس کو ایک ادبی صنف کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ عربی زبان میں یہ صنف ترقی یافتہ شکل میں موجود ہے۔ لیکن ہندوستانی زبانوں میں اس کا رواج عام نہیں ہے۔ اردو میں اس کی ابتدا، علامہ سید سلیمان ندوی نے کی تھی۔ آپ نے اپنی ادارت کے زمانے میں ماہنامہ 'معارف' اعظم گڑھ میں مرحوم مشاہیر پر سوانحی و تاثراتی مضامین شائع کیے جو بعد میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ آپ کے بعد یہ مفید سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس کے تقریباً بیس سال بعد مالک رام صاحب نے 'تحریر' میں یہ سلسلہ پھر شروع کیا۔ آپ نے 'وفیات' کے عنوان سے 'تحریر' کے تقریباً ہر شمارے میں اردو کی ادبی شخصیتوں کے انتقال پر تعزیتی مضامین اور سوانح خاکے قلم بند کئے۔ اس طرح انھوں نے سید صاحب کی قائم کردہ روایت کو پھر سے زندہ کیا اور اسے آگے بڑھایا۔ اس سلسلے کے تحت مجموعی طور پر آپ نے ۲۲۹ مشاہیر پر تعزیتی مضامین شائع کئے اب یہ تذکرہ 'معاصرین' کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو گئے ہیں۔ ان کی حیثیت فوری حوالہ (REAdY REFERENCE) کی سی ہے۔ یہ ادب کی طالبعلموں اور محققوں دونوں کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریر کے بند ہو جانے سے یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب دیگر حضرات بھی اس طرف توجہ فرمائیں؛ اس سلسلہ کو جاری رکھیں اور اس اہم صنف کو فروغ دیں۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا 'تحریر' ۱۹۶۷ء کو جاری ہوا اور دسمبر ۱۹۷۸ء کے بعد بند ہو گیا اس بارہ سال کی مدت میں اس کے ۴۶ شمارے شائع ہوئے۔ ان میں مجموعی طور پر ۲۲۹ مضامین شائع ہوئے۔ ان میں بیس مضامین مالک رام صاحب کے ہیں۔ ملاحظات اور وفیات' ان کے علاوہ ہیں۔ تحریر کے خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے۔ ان میں جگر بریلوی نمبر (جلد ۴۔ شمارہ ۲، ۱۹۷۰ء) غالب نمبر (جلد ۴۔ شمارہ ۴۔ ۱۹۷۱ء) جوش ملسیانی نمبر (جلد ۶۔ شمارہ ۴۔ ۱۹۷۲ء) سید ین نمبر (جلد ۷۔ شمارہ ۳۔ ۱۹۷۳ء) مسعود حسن رضوی ادیب نمبر (جلد ۸۔ شمارہ ۲۔ اپریل، جون ۱۹۷۴ء) ل۔ احمد اکبر آبادی نمبر (جلد ۸۔ شمارہ ۳۔ جولائی، ستمبر ۱۹۷۴ء) رشید احمد صدیقی نمبر (جلد ۹۔ شمارہ ۴۔

اکتوبر / دسمبر ۱۹۷۵ء) ضیا فتح آبادی نمبر (جلد ۱۱۔ شمارہ ۳۔ جولائی / ستمبر ۱۹۷۷ء) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جلد ۲۔ شمارہ ۱ (۱۹۷۲ء) مرزا غالب کے لیے اور جلد ۱۲، شمارہ ۳ (جولائی / ستمبر ۱۹۷۸ء) ملا واحدی کے لیے مختص ہیں۔ ان دونوں کو بھی خصوصی شماروں کے زُمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے اس طرح ان خصوصی شماروں کی تعداد دس ہو جاتی ہے۔ یہ تمام شمارے اردو ادب اور اردو صحافت کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریر جن مقاصد کے حصول کے لیے جاری ہوا تھا اس میں بڑی حد تک اسے کامیابی نصیب ہوئی۔ افسوس کہ اس کی زندگی بڑی مختصر رہی۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں اس نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو دوسرے رسالے طویل مدّت میں انجام نہ دے سکے۔

شمارہ ۱۔ جلد ۱ ۱۹۶۷ء

۱ تعارف۔ از مالک رام ص ۲۔۴

۲ کرم علی مرثیہ گو از مسعود حسن رضوی ادیب ص ۵۔۱۴

۳ جدید مرثیے کے بانی۔ ضمیر لکھنوی از علی زیدی۔ ص ۷۷۔۸۲

۴ غبار خاطر از مالک رام۔ ص ۶۱۔۷۶

۵ اردو کے افعال مرکبہ از گوپی چند نارنگ۔ ص ۷۷۔۸۲

۶ مصحفی کا مطالعہ از عابد رضا بیدار ص ۸۳۔۱۲۷

۷ ساحر کاکوروی از امیر حسن عابدی ص ۱۲۹۔۱۴۴

۸ کلام نصیر کے ماخذ از تنویر احمد علوی ص ۱۴۵۔۱۶۱

شمارہ ۲۔

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۱۶۲

۲ نعت نگاری اتر پردیش میں۔ از علی جواد زیدی ص ۱۶۳۔۲۰۵

۳ مراسلہ از علی جواد زیدی۔ ص ۲۰۶

۴ ڈوگری زبان۔ ایک لسانی تعارف۔ از بنسی لال ص ۲۰۷۔۲۲۴۔

۵ ہفتہ وار کوہ لاہور از مالک رام ص ۲۲۵۔۲۴۸

۶ مرزا جعفر زٹلی۔ ایک مطالعہ۔ از نعیم احمد۔ ص ۲۴۹۔۲۷۶۔

۷ مرثیہ امام مظلوم۔ از فضل علی فضلی۔ ص ۲۷۷۔۲۸۰

۸ فارسی میں ستی کی داستانیں۔ از امیر حسن عابدی ص ۲۸۱۔۲۹۲

۹ دسویں صدی ہجری کا ایک اردو کتبہ۔ از ضیاالدین ڈیسائی۔ ص ۲۹۳۔۲۹۶۔

۱۰. شاہجہانی عہد کی ایک گجراتی مثنوی از اکبر علی ترمذی۔ ص ۲۹۷-۳۰۶

۱۱. وفیات از مالک رام۔ ص ۳۰۷-۳۱۲

(اثر لکھنوی، اخگر فیروزپوری، رفیق مارہروی، شاہد احمد دہلوی، لال چند فلک)

شمارہ ۳-۴

۱. نواز اور شکنتلا ناٹک۔ از مسعود حسن رضوی ص ۳۱۵-۳۲۶

۲. دیوان ساحر کاکوروی۔ از قاضی عبدالودود ص ۳۲۷-۳۲۹

۳. اوزان رباعی۔ از گیان چند ص ۳۳۱-۳۵۷

۴. دیوان رضا۔ از امیر حسن عابدی۔ ص ۳۵۸-۳۶۹

۵. اشرف علی خاں فغاں از محمد انصار اللہ ص ۳۷۱-۳۷۶

۶. مکتوب از محمد ابراہیم ڈار ص ۳۷۷-۳۸۶

۷. میر کا مطالعہ۔ از عابد رضا بیدار ص ۳۸۰-۴۰۴

۸. سیر المنازل: تعارف اور تجزیہ از نعیم احمد ص ۴۰۵-۴۲۰

۹. اقبال اور فلسفۂ یونانی۔ از جگن ناتھ آزاد ص ۴۲۱-۴۴۰

۱۰. تلامذۂ مومن از ظہیر احمد صدیقی۔ ص ۴۴۱-۴۹۶

۱۱. بحث و نظر: قاضی عبدالودود، عبدالماجد دریابادی واکبر الدین صدیقی۔ ص ۴۹۷-۵۶۰

۱۲. رسالۂ تذکرات۔ از تنویر احمد علوی۔ ص ۵۱۱-۵۶۱

جلد ۲۔ ۱۹۶۸ء

شمارہ ۱۔

۱. ملاحظات از مالک رام۔ (ابتدائی صفحہ)

۲. اعلان الحق۔ از ابوالکلام آزاد - ص ۱-۲۰

۳. اسلامیات کا مطالعہ۔ از امتیاز علی خاں عرشی ص ۲۱-۳۴

۴. فارسی زبان میں الفاظ کی تصحیح کا مسئلہ۔ از نذیر احمد ص ۳۵-۷۴

۵. مولانا ابوالکلام آزاد از مالک رام ص ۷۵-۹۸

۶. مستشرقین کی بین الاقوامی کانگریس - از گوپی چند نارنگ۔ ص ۹۹-۱۱۶

۷. وفیات از مالک رام ص ۱۱۷-۱۲۴

(نذر سجاد حیدر، مہاشہ درشن، سراج لکھنوی، انوپ چند آفتاب پانی پتی، محمد عبدالباقی)

شمارہ ۲۔

۱. ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۱۲۶

۲. ابوالنصر غلام یٰسین آہ۔ از مالک رام ص ۱۲۷-۱۶۸

۳. اردو کا طویل ترین قصیدہ از علی جواد زیدی۔ ص ۱۶۹-۱۷۸

۴. کتبۂ ایمن درگاہ بیجاپور۔ از محمد اکبر الدین صدیقی۔ ص ۱۷۹-۱۹۴

۵ عہد ہمایوں واکبر کی ۲ دو اردو غزلیں
از امیر حسن عابدی۔ ص ۱۹۵۔ ۲۰۹

۶ ریختہ (غزل)۔ از بیرم خاں خانخاناں ص۔ ۲۱۰

۷ شاہ عبدالعزیز دہلوی (بعض غلط فہمیوں کا ازالہ) از سید اوصاف علی۔ ص۔ ۲۱۱۔ ۲۱۹

۸ در مدح دہلی (عربی نظم مع اردو ترجمہ) از شاہ عبدالعزیز۔ ص ۲۲۰۔

۹ ظفر خاں احسن: حیات اور شاعری از محمد اسلم خاں ص۔ ۲۲۱۔ ۲۳۲

۱۰ رضا کون تھا (بحث و نظر) از اکبر علی ترمذی ص۔ ۲۳۳۔ ۲۳۵

۱۱ وفیات۔ از مالک رام۔ ص۔ ۲۳۶۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴

(حافظ علی بہادر خاں، صولت ٹونکی، پریم شنکر فرحت دہلوی، پرویز شاہدی)

شمارہ ۳۔

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص۔ ۲۔

۲ تذکرہ مقالات الشعراء، از قیام الدین حیرت مرتبہ نثار احمد فاروقی۔ ص۔ ۳۔ ۱۰۲

۳ کلیاتِ تواریخ از رائے سُناتھ سنگھ بیدار (ایک تعارف)۔ از نور الحسن ہاشمی۔ ص۔ ۱۰۳۔ ۱۲۱

۴ وفیات۔ از شہاب الدین دسنوی و مالک رام۔ ص ۱۲۲۔ ۱۲۸ (نجیب اشرف ندوی، شفا گوالیاری)

شمارہ ۴۔

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲

۲ تذکرہ بہارِ بیخزاں مولفہ احمد حسین سحر مرتبہ نعیم احمد ص ۵۔ ۱۴۰

۳ بارہویں صدی ہجری کی ایک دکنی نظم۔ از ضیاء الدین ڈیسائی۔ ص ۱۴۱۔ ۱۴۸
(قاضی عبدالنبی بن عبدالرسول احمد نگری کی ایک نظم کا تعارف مع ضروری حواشی)

جلد ۳۔ ۱۹۶۹ء

شمارہ ۱۔ ۲

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲

۲ جامعہ والوں کے ذاکر صاحب: از صالحہ عابد حسین ص ۳۔ ۱۲

۳ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ از عابد رضا بیدار ص ۵۷۔ ۶۷

۴ راجا کندن لال اشکی از مسعود حسن رضوی ص ۱۵۔ ۴۷

۵ ایک نیا رسم الخط از مالک رام ص ۵۷۔ ۶۷

۶ رستم مرزا فدائی از امیر حسن عابدی ص ۷۷۔ ۹۰

۷ میر کی شاعری کا مزاج از صدیق الرحمٰن قدوائی ص ۹۱۔ ۱۰۶

۸ شعرائے اردو کے تذکرے از زاہدہ ابو الحسن ص ۱۰۷۔ ۱۱۸

شمارہ ۳-۴ (اکتوبر/دسمبر)۔

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۱۲۰-۱۲۲

۲ تاریخ ادب اردو کی تدوین، از علی جواد زیدی ص ۱۲۳-۱۵۴

۳ ہندوستانی علم و ادب، ازج زو عزاف، مترجمہ نعیم احمد۔ ص ۱۵۵-۱۷۵

۴ نسخۂ دلکشا از مالک رام ص ۱۷۷-۲۰۴

۵ شاہ صادق کا ایک نایاب دیوان۔ از محمد اکبر الدین صدیقی۔ ص ۲۰۵-۲۱۵

۶ وفیات از مالک رام۔ ص ۲۱۷-۲۴۶

(حکیم احمد شجاع، فقیر سید وحید الدین، ڈاکٹر ذاکر حسین، نریش کمار شاد، الم مظفر نگری، ناطق گلاوٹھی، مشیر احمد ناظر کاکوری، عندلیب شادانی، مخدوم محی الدین، راز چاند پوری، علی عباس حسینی آرتھر جان آربری، محمد اجمل خاں، واقف مرادآبادی)

جلد ۴۔ ۱۹۷۰ء

شمارہ ۱۔

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

۲ نسئی اور تقویم ہجری از محمد حمید اللہ، مترجم نعیم احمد۔ ص ۳-۷

۳ غالب صدی تقریبات کا جائزہ۔ از اسلوب احمد انصاری۔ ص ۲۹-۳۶

۴ اردو رسالوں کے غالب نمبر از عبداللطیف اعظمی ص ۳۷-۴۲

۵ قانون ابن سینا اور اس کی شرحیں۔ از حکیم ظل الرحمٰن۔ ص ۴۳-۱۱۰

۶ وفیات از مالک رام۔ ص ۱۱۱-۱۲۰

(رئیس احمد جعفری، مفتی انتظام اللہ شہابی، خورشید احمد جامی)

شمارہ ۲۔ (جگر بریلوی نمبر)۔

۱ مقدمہ از مالک رام ص ۵-۸

۲ میری تعلیم و تربیت۔ از جگر بریلوی۔ ص ۹-۴۰

۳ میری اہلیہ از جگر بریلوی۔ ص ۴۱-۸۶

۴ حضرت جگر بریلوی کی گھریلو زندگی از شوکمار دیونی ورما۔ ص ۸۷-۹۴

۵ جگر بریلوی از مالک رام۔ ص ۹۵-۱۰۰

۶ حضرت جگر بریلوی کا اجتہاد فکر و فن از منوہر سہائے انور۔ ص ۱۰۱-۱۰۲

۷ جگر بریلوی۔ فن اور ذہن از سیفی پریمی ص ۱۰۳-۱۱۸

۸ جگر بریلوی اور ان کا تغزل از ناشاد کانپوری ص ۱۱۹-۱۳۲

۹ جگر بریلوی کی وطنی شاعری۔ از ویریندر پرشاد سکسینہ۔ ص ۱۳۳ - ۱۴۸

۱۰ رباعیات جگر بریلوی۔ از بسمل شمس آبادی ص ۱۴۹ - ۱۶۲

۱۱ جگر بریلوی کی اصلاحیں۔ از بسمل شمس آبادی ص ۱۶۳ - ۱۶۸

۱۲ پیام ساونتری۔ از محمد اسمٰعیل بدایونی ص ۱۶۹ - ۱۸۵

۱۳ جگر بریلوی کے یہاں دو دن، از سیوتی پرساد صہبائی۔ ص ۱۸۶ - ۱۹۲

شمارہ ۳ -

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۴۔

۲ دیوان حافظ کا ایک نادر مخطوطہ۔ از نذیر احمد ص ۳ - ۲۰

۳ میر عبداللہ مسکین از علی جواد زیدی ص ۲۱ - ۴۲

۴ حاتم کی مثنوی حسن و دل۔ از گیان چند ص ۴۳ - ۵۸

۵ تاریخ ۱۸۵۷ء کا ایک صفحہ از محمد ایوب قادری ص ۵۹ - ۷۲

۶ احسان، غالب، ذکا کے قطعات از مالک رام ص ۷۳ - ۸۰

۷ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب از علی جواد زیدی۔ ص ۸۱ - ۸۸

۸ وفیات از مالک رام۔ ص ۸۹ - ۱۰۴

(پرنسپل عبدالشکور، امتیاز علی تاج، شکیل بدایونی، منور لکھنوی)

شمارہ ۴ -

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۴

۲ تذکرہ صدر الدین آزردہ مرتبہ مختار الدین احمد ص ۵ - ۱۲۲ -

۳ چمنستانِ جرأت از مالک رام۔ ص ۱۲۳ - ۱۲۶

۴ وفیات از مالک رام ص ۱۲۷ - ۱۴۴

(ضیاء القادری بدایونی، ماچس لکھنوی، سلیمان اریب، توفیق الحق حزیں، بیدل بیکانیری، تیغ الٰہ آبادی)

جلد ۵ - ۱۹۷۱ء

شمارہ ۱ -

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

۲ دیوان عبید اللہ خاں مبتلا از نعیم احمد ص ۵ - ۵۲

۳ اردو پر ترکی زبان کے اثرات۔ از اکمل ایوبی ص ۵۳ - ۶۴

۴ تذکرہ بہار بیخزاں (تحقیقی جائزہ) از اکبر حیدری ص ۶۵ - ۱۳۶

۵ وفیات۔ از مالک رام۔ ص ۱۳۷ - ۱۵۲۔

(اسرار احمد آزاد، ناشاد کانپوری، آغا خلش کانپوری، دیا بریلوی، شاغل عثمانی، عابد علی عابد، روش صدیقی)

جلد ۵۔ ۱۹۷۱ء

شمارہ ۲۔ اپریل/جون

(باسط اوجینی۔ عقیل جعفری۔ میاں بشیر احمد۔ عبدالقادر سروری۔ قیس بنارسی)

شمارہ ۳۔

(وکیل اختر۔ اختر علی تلہری۔ پروفیسر محمد حبیب۔ تسکین قریشی۔ شاغل قادری۔ خبر بہوروی)

شمارہ ۴۔ (غالب نمبر)

جلد ۶۔ ۱۹۷۲ء

شمارہ ۱۔

۴ غالب اور سفر ہرات۔ از اکبر علی ترمذی ص ۷۵-۶۰ ۵ وفیات۔ از مالک رام ص ۶۱ - ۱۰۸
(سید شریف الحسن راز بلگرامی۔ طالب کشمیری۔ عارف عباسی۔ منظر اکبر آبادی۔ مہادیو پرشاد سامی۔ انقر موہانی۔
سید عبداللطیف۔ غلام رسول مہر۔ خواجہ غلام السیدین)

شمارہ ۲۔

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲
۲ اردو ادب کا سماجی پس منظر۔ از محمد عمر ص ۳ - ۶
۳ پریم چند۔ ماضی اور حال کا ادیب از رضیہ سجاد ظہیر۔ ص ۷۹-۱۰۸۔
۴ وفیات از مالک رام۔ ص ۱۰۹ - ۱۱۸
(عادل رشید۔ بشیر النساء بیگم بشیر حیدر آبادی۔ یحییٰ اعظمی۔ ناصر کاظمی)

شمارہ ۳۔

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲۔
۲ مدار الافاضل کی ترتیب نو پر ایک نظر۔ از نذیر احمد ص ۳ - ۷۶
۳ ناگپور کے اخبار و رسائل۔ از سید محمد شرف الدین ساحل۔ ص ۷۷ - ۱۰۲
۴ نقد و نظر (ادب، فکر اور سماج، از راجندر ناتھ شیدا پر تبصرہ) عابد رضا بیدار۔ ص ۱۰۳ - ۱۰۶
۵ وفیات۔ از مالک رام۔ ص ۱۰۷ - ۱۱۷
(یوسف ظفر۔ محمد افضل باقی صدیقی۔ امیر احمد انجم خیر آبادی۔ علیم اختر مظفر نگری۔ سراج الدین ظفر)

شمارہ ۴۔ (جوش ملسیانی نمبر)

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲ - ۴
۲ ابوالفصاحت جوش ملسیانی۔ شخصیت اور شاعری از منور سہائے انور۔ ص ۵ - ۹۲
۳ کلام جوش ملسیانی۔ از اسلوب احمد انصاری ص ۹۳ - ۱۰۴
۴ میرے والد محترم۔ از عرش ملسیانی۔ ص ۱۰۵ - ۱۲۱
۵ جوش ملسیانی۔ از مالک رام۔ ص ۱۲۲ - ۱۳۷
۶ چند خطوط (ساحر ہوشیارپوری کے نام جوش ملسیانی کے ۱۵ خطوط)۔ ص ۱۳۸ - ۱۵۳
۷ میرے استاد۔ از رشی پٹیالوی۔ ص ۱۵۴ - ۱۵۹
۸ نوائے سروش (انتخاب کلام جوش ملسیانی) ص ۱۶۲ - ۱۹۲

جلد ۷۔ ۱۹۷۳ء

شمارہ ۱۔ جنوری/ مارچ

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲
۲ ہندوستان کا بھاشائی مسئلہ۔ از جافرسن ص ۳ - ۴۶
۳ عبدالرحمٰن بجنوری۔ از حامد حسین۔ ص ۴۷ - ۶۲
۴ مذہبی زندگی کا تنوع از سید وحید الدین ص ۶۳ - ۶۸

۵ سلطان رضیہ کا کتبہ از ضیاء الدین احمد ڈیسائی
ص ۶۹-۷۴

۶ سید رجب علی ارسطو جاہ کا مکتوب۔ از اکبر حیدری
ص ۷۵-۸۴

۷ وفیات از مالک رام۔ ص ۸۵-۱۱۱ (عبدالستار صدیقی۔ تاج قریشی۔ مختار صدیقی۔ شیخ اسماعیل پانی پتی۔ صالحہ بیگم۔ نخفی۔ سید سخی حسن نقوی۔ تمنا عمادی۔ پروفیسر احتشام حسین۔)

شمارہ ۲۔ اپریل/جون

(۱) ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

۲ نورالاسلام منتظر اوران کا غیر مطبوعہ کلیات از اکبر حیدری۔ ص ۳-۴۲

۳ انشاء کی تاریخ ولادت وفات۔ از مالک رام ص ۴۳-۴۸

۴ سنسکرت کتابوں کے فارسی تراجم۔ از سید محمد رضا جلالی نائینی۔ ص ۴۹-۷۲

۵ انیس نما۔ از عبدالقوی دسنوی۔ ص ۷۳-۱۱۱

۶ وفیات۔ از مالک رام۔ ص ۱۱۲-۱۲۰ (حفیظ ہوشیارپوری۔ فرقت کاکوروی۔ شیخ محمد اکرام۔ ممتاز شیریں۔ شوکت سبزواری)

شمارہ ۳۔ (سیدین نمبر)

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

۲ اقبال کے بعد عالم اسلام کا تنہا مفکر از ولفریڈ کینٹویل اسمتھ، مترجمہ عابد رضا بیدار۔ ص ۵-۱۲

۳ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک از خواجہ غلام السیدین ص ۱۳-۴۵

۴ قومی سیرت کی تشکیل۔ از خواجہ غلام السیدین ص ۴۷-۱۰۰

۵ روح تہذیب' از خواجہ غلام السیدین ص ۱۰۱-۱۴۷

۶ شہید وفا از خواجہ غلام السیدین ص ۱۴۹-۲۰۰

شمارہ ۴۔ اکتوبر/دسمبر ۱۹۷۳ء

۱ دہلی میں مرثیہ گوئی کا آخری دور۔ از مسعود حسن رضوی۔ ص ۲-۳۸

۲ انیس اور فن سپہگری از سخی حسن نقوی ص ۳۹-۷۸

۳ تذکرۂ نشتر عشق از اکبر حیدری ص ۷۹-۹۲

۴ دو قدیم ریختے۔ از نورالحسن ہاشمی ص ۹۳-۹۶

۵ عاقل دہلوی کا شہر آشوب۔ از عبدالغفار شکیل ص ۹۷-۱۰۱

جلد ۸ ـ ۱۹۷۴ء

شمارہ ـ ۱

۱ ملاحظات ۔ از مالک رام ۔ ص ۲

۲ غالب کے ایک قصیدہ پر واجد علی شاہ کا عطیہ از مسعود حسن رضوی ص ۳ ـ ۶

۳ غالب ۔ ایک غیر مطبوعہ معاصرانہ اندراج از مالک رام ص ۷ ـ ۱۰

۴ چراغ دیر ۔ ایک تجزیہ ۔ ص ۱۱ ـ ۱۸

۵ اردو ادب کا سماجی پس منظر ۔ از محمد عمر ص ۱۹ ـ ۸۰

۶ وفیات ۔ از مالک رام ۔ ص ۸۱ ـ ۱۲۷

(ذاکر حسین فاروقی ۔ حمید ناگوری ۔ گہر گورکھپوری ۔ حشر سیتاپوری ۔ جعفر حسن ۔ ضیاء احمد بدایونی سجاد ظہیر ۔ جذب عالم پوری ۔ بیگم اختر ۔ ابر احسنی گنوری ۔ سلام مچھلی شہری ۔ تاب حیدر آبادی ۔ راجا محمد امیر احمد خاں (والی محمود آباد)

شمارہ ۲ ۔ اپریل / جون (سید مسعود حسن رضوی ادیب نمبر)

۱ ملاحظات ۔ از مالک رام ۔ ص ۲

۲ مختصر آپ بیتی از مسعود حسن رضوی ادیب ص ۷ ـ ۱۷

۳ مسعود حسن رضوی از نیر مسعود ص ۱۸ ـ ۲۸

۴ پروفیسر مسعود حسن رضوی ۔ از نذیر احمد ص ۲۹ ـ ۳۷

۵ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب ۔ از مختار الدین احمد ص ۸۶ ـ ۹۸

۶ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب از مالک رام ص ۹۹ ـ ۱۲۰

۷ لکھنویات کا آخری مستند محقق ۔ از صفدر آہ ص ۱۲۱ ـ ۱۳۲

۸ سید مسعود حسن رضوی بحیثیت مرتب متن ۔ از گیان چند ص ۱۳۳ ـ ۱۵۸

۹ پروفیسر مسعود حسن رضوی اور مطالعہ انیس از نجم الدین نقوی ۔ ص ۱۵۹ ـ ۱۸۸

۱۰ ہماری شاعری پر ایک نظر ۔ از شمس الرحمٰن فاروقی ص ۱۸۹ ـ ۲۱۱

۱۱ مقدمہ شعر و شاعری اور ہماری شاعری ۔ از تنویر احمد علوی ۔ ص ۲۱۲ ـ ۲۲۹

۱۲ نقد و تبصرہ (مسعود حسن رضوی کی کتابوں پر تبصرے) از عبدالماجد دریابادی ۔ ص ۲۳۰ ـ ۲۳۸

شمارہ ۳ ۔ جولائی / ستمبر (ل. احمد اکبر آبادی نمبر)

۱ ملاحظات ۔ از مالک رام ۔ ص ۲

۲ مقدمہ از مالک رام ۔ ص ۷ ـ ۸

۳ میری سرگزشت۔ از ل احمد اکبر آبادی۔ ص ۱۱ - ۴۱

۴ ل۔ احمد کی شخصیت اور فن۔ از مخمور اکبر آبادی ص ۴۲ - ۷۶

۵ لطیف صاحب۔ از نورالرحمٰن۔ ص ۷۷ - ۸۲

۶ ل۔ احمد۔ ایک تاثر از گیان چند۔ ص ۸۳ - ۸۵

۷ ل۔ احمد میری نظر میں از اعجاز حسین ص ۸۶ - ۸۹

۸ نازش ہے ارض تاج کو ذاتِ لطیف پر۔ از میکش اکبر آبادی۔ ص ۹۰ - ۹۳

۹ ل۔ احمد کی ادبی خدمات از احتشام حسین۔ ص ۹۴ - ۱۰۰

۱۰ ل احمد اکبر آبادی سرسری جائزہ۔ از مالک رام ص ۱۰۱ - ۱۱۵

۱۱ ل۔ احمد کا قرض۔ از جمیل مظہری۔ ص ۱۱۶ - ۱۱۹

۱۲ ل۔ احمد کی افسانوی تخلیقات۔ از کوثر چاند پوری ص ۱۲۰ - ۱۳۳

۱۳ حضرت ل۔ احمد میری نظر میں، از شہاب سرمدی ص ۱۳۴ - ۱۴۵

۱۴ سلسلۂ سنگ و سر۔ از اطہر عزیز۔ ص ۱۴۶ - ۱۵۲

۱۵ لطیف صاحب: چند تاثرات، از شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ ص ۱۵۳ - ۱۵۹

۱۶ ل۔ احمد اکبر آبادی کلکتے میں از مسعود حسن۔ ص ۱۶۰ - ۱۶۵

شمارہ ۴۔ اکتوبر/دسمبر

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

خطبہ (یکم مارچ ۱۹۷۴ کو نذر عابد پیش کیے جانے کی تقریب میں کی گئی جوابی تقریر) از عابد حسین ص ۳ - ۸

۳ منشی بنسی دھر ہمت لکھنوی۔ از کالیداس گپتا رضا۔ ص ۹ - ۱۸

۴ عزیز لکھنوی کی بعض نایاب اور غیر مطبوعہ تحریریں از اکبر حیدری ص ۱۹ - ۲۵

۵ اردو ادب کا سماجی پس منظر از محمد عمر ص ۲۷ - ۵۶

۶ وفیات — از مالک رام۔ ص ۵۷ - ۱۱۱ (پنڈت رام پرتاپ اکمل جالندھری۔ امجد نجمی، منوہر سہائے انور۔ بلونت کمار ساگر نکودری۔ مہندر ناتھ، پروفیسر حمید احمد خاں۔ حامد اللہ افسر میرٹھی۔ اشر حیدر آبادی۔ خضر تمیمی، نثار اٹاوی۔ محمد حسین حسان۔ ساغر صدیقی
طفیل احمد جمالی۔ بہزاد لکھنوی۔)

جلد ۹ ـ ۱۹۷۵ء

شمارہ ۱۔ جنوری/مارچ

۱ ملاحظات ۔ از مالک رام۔ ص ۲

۲ مکاتیب تاج۔ از پروفیسر سید حسن۔ ص ۳ - ۱۶

۳ ہندوستان کے عہد اسلامی کے سکّے۔ از ضیاالدین احمد ڈیسائی۔ ص ۱۷ - ۶۰
۴ تذکرہ گلشن شتاق از شفق خواجہ۔ ص ۶۱ - ۸۸
۵ وفیات از مالک رام۔ ص ۸۹ - ۱۲۴

(ثاقب عظیم آبادی۔ منی لال جوان سندیلوی۔ نور محمد قیس کوٹوی۔ عزیز قریشی۔ عبدالقیوم مہجور شمسی۔ محمو احمد عباسی۔ محشر مرزاپوری۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں تاج (والی ٹونک)۔ ثمر چھپروی۔ انور کاملوی۔ شا معین الدین ندوی۔ شبیر محمد اختر گجراتی)

۶ الموڑہ کی جدید بولی میں ضمیر کا صرفی مطالعہ۔ از لطیف الدین ادیب۔ ص ۱۲۱ - ۱۲۶

شمارہ ۲۔ اپریل/جون۔

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲
۲ جدید پہیلیاں از راج کشور۔ ص ۳ - ۴۰
۳ بیان میرٹھی۔ از سید محمد شرف الدین ساحل۔ ص ۴۱ - ۷۲
۴ وفیات از مالک رام۔ ص ۷۳ - ۱۱۰

عبدالرحمٰن چغتائی۔ دیوان سنگھ مفتون۔ مسیح الزماں۔ حیرت بدایونی۔ اعجاز حسین۔ شمیم کرہانی)

شمارہ جولائی/ستمبر۔

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲
۲ شاعر آذربائیجان ازل۔ احمد اکبر آبادی۔ ص ۳ - ۱۴
۳ منشی گوبند رام۔ از کایداس گپتا رضا۔ ص ۱۵ - ۳۲
۴ اردو تذکرہ: تنقید اور نقاد۔ از محمد منصور عالم ص ۳۳ - ۴۰
۵ اقبال کی تاریخ ولادت از مالک رام۔ ص ۴۱ - ۴۵
۶ علامہ اقبال کی صحیح تاریخ ولادت از نظیر صوفی۔ ص ۴۶ - ۵۴
۷ تبصرے از مالک رام۔ ص ۵۵ - ۷۸

مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصرے:

۱ بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعرا از مشتاق احمد
۲ تذکرہ شعرا (حسرت موہانی) مرتبہ احمر لاری
۳ حسرت موہانی: حیات اور کارنامے از احمر لاری
۴ میر حسن: حیات اور ادبی خدمات از ڈاکٹر فضل الحق
۵ جگر بریلوی۔ ایک تعارف از لطیف حسین ادیب
۶ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے از حسینی شاہد
۷ مثنوی مولانا روم (جلد اول) مرتبہ قاضی سجاد حسین
۸ سلکِ کلک: مرتبہ محمد شرف عالم

۹ شعر اور شاعر (تذکرہ شعرائے معاصر) از ضیا فتح آبادی
۱۰ سازِ نوا مرتبہ حلقۂ تشنگان ادب نئی دلّی
۱۱ مصر الجدید از محمد ابراہیم
۱۲ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں از خواجہ غلام السیدین مع ذکرِ جمیل از صالحہ عابد حسین۔
۱۳ پدما بھوشن پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی اردو خدمات از صادق نوید
۱۴ اردو مصدر نامہ از حفیظ الرحمن واصف
۱۵ یہ تھی دلّی۔ از طالب دہلوی
۱۶ مسالک و منازل از ضیاء احمد بدایونی
۱۷ علی جواد زیدی (ضبط شدہ نظمیں) مرتبہ خلیق انجم و مجتبیٰ حسین۔
۱۸ وفیات از مالک رام۔ ص ۹۷ تا ۹۶ (شفقت کاظمی۔ بشیر خاں مانی ناگپوری (مضطر حیدرآبادی۔ ذوالفقار علی بخاری۔ نشتر جالندھری)

شمارہ ۴۔ اکتوبر / دسمبر (رشید احمد صدیقی نمبر)

۱ ملاحظات از مالک رام ص ۲
۲ پیش لفظ از مالک رام۔ ص ۷۔ ۱۶
۳ رشید و مرشد از عابد حسین ص ۱۷۔ ۲۸
۴ رشید احمد صدیقی از آل احمد سرور۔ ص ۲۹۔ ۵۰
۵ رشید احمد صدیقی از خلیق انجم ص ۵۱۔ ۷۲
۶ حیاتِ رشید از مالک رام ص ۷۳۔ ۹۰
۷ رشید احمد صدیقی، کرشمہ اور کارنامہ از محمد حسن ص ۹۱۔ ۱۰۶
۸ رشید احمد صدیقی۔ ایک مفکر از وزیر آغا ص ۱۰۷۔ ۱۱۲
۹ رشید احمد صدیقی بحیثیت مزاح نگار از اسلوب احمد انصاری۔ ص ۱۱۳۔ ۱۳۴
۱۰ رشید احمد صدیقی: نقاد اور نثر نگار از اسلوب احمد انصاری ص ۱۳۵۔ ۱۵۴
۱۱ رشید احمد صدیقی بحیثیت معلم اخلاق از گیان چند ص ۱۵۵۔ ۱۶۸
۱۲ رشید احمد صدیقی کی نثر نگاری۔ از سیدہ جعفر ص ۱۶۹۔ ۱۸۳
۱۳ مکاتیب رشید احمد صدیقی۔ ایک مطالعہ از سلیمان اطہر جاوید۔ ص ۱۸۴۔ ۲۰۴
۱۴ نگارشاتِ رشید میں اخلاقیات از گیان چند ص ۲۰۵۔ ۲۲۶
۱۵ لطائفِ رشید۔ (مختلف حضرات)۔ ص ۲۲۷۔ ۲۳۴

جلد ۱۰۔ ۱۹۷۶ء

شمارہ ۱۔ جنوری / مارچ

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲
۲ مرزا جعفر علی حسرت: حالات و آثار۔ از مشفق خواجہ

۳ یادوں کے چراغ از مختارالدین احمد ص ۶۵-۸۰ ص ۳-۲۴

۴ وفیات از مالک رام ۔ص ۸۱ – ۱۱۲ (شیش چند سکسینہ طالب ۔بسمل الہ آبادی ۔ چودھری برہم ناتھ دت قاصر)

شمارہ ۲۔

۱ ملاحظات ۔ از مالک رام ۔ ص ۲

۲ مکاتیب احتشام حسین: تعارف ۔ از اخلاق اثر

۳ مکاتیب احتشام (مختلف حضرات کے نام احتشام صاحب کے خطوط)۔ ص ۲۳-۸۶ ص ۳-۲۲

۴ وفیات از مالک رام ۔ص ۸۷ – ۱۰۸ (مسعود حسن رضوی ادیب ۔ مرزا محمود بیگ ۔ تمکین سرمست ۔ نجم آفندی)

شمارہ ۳۔ جون/جولائی ۱۹۷۶ء

۱ ملاحظات از مالک رام ۔ ص ۲

۲ معتزلہ از نصیر احمد ناصر ۔ص ۳ – ۸۸

۳ وفیات از مالک رام ۔ص ۸۹ – ۱۱۰ (سید محمد جعفری ۔ جوش ملسیانی ۔ کیف مرادآبادی ۔ شہاب مالیر کوٹلوی ۔ سالک لکھنوی)

شمارہ ۴۔ اکتوبر/دسمبر ۱۹۷۶ء

۱ ملاحظات از مالک رام ۔ص ۲، ۶۴

۲ ولی کا سال وفات از جمیل جالبی ۔ص ۳ – ۱۸

۳ تلامذہ دلگیر از کالیداس گپتا رضا ص ۱۹-۳۲

۴ متفرقات دبیر از کاظم علی خاں ۔ ص ۳۳ – ۴۶

۵ جبران خلیل جبران از فرزانہ فیروز حسیب ص ۴۷-۵۸

۶ پریم چند کی موت اور جوش کی پیش گوئی از اوم پرکاش بجاج ۔ص ۵۹-۶۴

۷ وفیات از مالک رام ۔ص ۶۵ – ۱۱۱ (جگر بریلوی ۔ مخمور اکبرآبادی ۔ محمد عثمان فارقلیط ۔ مبارزالدین رفعت ۔ ملک عبدالعزیز نصراللہ خاں ۔ کیف بارہ بنکوی ریونڈ سید شفاعت ہنیس ریحانی ۔ جان نثار اختر ۔ پروفیسر سید محمد ۔ پریم ناتھ در)

جلد ۱۱ - ۱۹۷۷ء

شمارہ ۱۔ جنوری/مارچ

۱ ملاحظات از مالک رام ۔ ص ۲

۲ للتا پرشاد لیئق ۔ از لطیف حسین ادیب ص ۳-۲۶

۳۔ اردو شعراء کے سنین وفات از محمد منصور عالم : ص ۷۳۔۷۶

۴۔ وفیات از مالک رام۔ ص ۷۷۔۱۱۸ (ملا واحدی۔ محشر عنایتی۔ مکین احسن کلیم۔ صوفی بانکوٹی۔ دامودر ٹھاکور ذکی۔ اختر لکھنوی۔ آغا حیدر حسن مرزا۔ ریاست علی ندوی۔ سید وقار عظیم۔ مرزا محمد عزیز معز لکھنوی۔ سید وصی احمد فانی بلگرامی)

شمارہ ۲۔ اپریل / جون۔

۱۔ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

۲۔ غالب اور بندیل کھنڈ از محمد مشتاق شارق ص ۳۔۸

۳۔ بدماوت اردو از شانتی رنجن بھٹاچاریہ ص ۱۹۔۳۸

۴۔ فخر الدولہ منشی الملوک راجہ رتن سنگھ بہادر ہشیار جنگ زخمی از کالیداس گپتا رضا۔ ص ۳۹۔۵۶

۵۔ وفیات۔ از مالک رام۔ ص ۷۵۔۱۰۲

(تحسین سروری۔ مولانا عبدالماجد دریابادی۔ رشید احمد صدیقی۔ کرشن چندر۔ اختر اورینوی۔ محمد صدرالدین فضا شمسی۔ محمد ظفر اشک سنبھلی)

شمارہ ۳۔ جولائی / ستمبر (ضیا فتح آبادی نمبر)

۱۔ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲

۲۔ مہرلال ضیا فتح آبادی۔ از جوش ملیح آبادی ص ۳۔۸

۳۔ ضیا فتح آبادی: مختصر سوانح حیات از مالک رام ص ۹۔۱۶

۴۔ ضیا فتح آبادی۔ از اوم پرکاش بجاج ص ۱۷۔۶۱

۵۔ ضیا فتح آبادی کی شاعری میں ترقی پسند عناصر از وید پرکاش شرما۔ ص ۶۲۔۷۶

۶۔ ضیا فتح آبادی بحیثیت نظم نگار۔ از اعجاز صدیقی۔ ص ۷۷۔۸۷

۷۔ ضیا فتح آبادی کی غزل سرائی از کوثر چاندپوری ص ۸۸۔۱۰۰

۸۔ ضیا فتح آبادی کا مذاق تغزل از جاوید وششٹ ص ۱۰۱۔۱۰۳

۹۔ کلام ضیا: ضیائے کلام۔ از ستیہ نند جاوا اشک ص ۱۰۴۔۱۰۹

۱۰۔ ضیا فتح آبادی سے ایک ملاقات از گربچن چندن ص ۱۱۰۔۱۲۲

۱۱۔ ضیا فتح آبادی اور احساس حسن از زرینہ ثانی ص ۱۳۳۔۱۳۸

۱۲۔ ضیا فتح آبادی، میرا دوست۔ از رادھا کرشن سہگل

ص ۱۳۹-۱۴۶

۱۳ تصویر کی تلاش از رفعت سروش۔ ص ۱۴۶-۵۸

۱۴ ضیا صاحب۔ ایک تاثر۔ از تنویر احمد علوی ص ۱۵۹-۱۶۹

۱۵ ضیا صاحب کی شاعری میں حب الوطنی۔ از سردار پیارا سنگھ۔ ص ۱۷۰-۱۸۳

۱۶ ضیا کے قطعات و رباعیات از سرتاج عالم زیدی۔ ص ۱۸۴-۱۹۰

۱۷ ضیا فتح آبادی میری نظر میں۔ از اندر موہن مہتہ ص ۱۹۱-۲۰۳

۱۸ ضیا فتح آبادی کی شاعری۔ از ریوتی سرن شرما ص ۲۰۴-۲۰۷

۱۸ ضیائے کلام: انتخاب کلام ضیا فتح آبادی ص ۲۰۸-۲۱۸

شمارہ ۴۔ اکتوبر/دسمبر۔ ۱۹۷۷ء

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲

۲ مکاتیب امتیاز علی خاں عرشی۔ از لطیف حسین ادیب ص ۳-۲۴

۳ استدراک۔ از ضیاء الدین احمد ڈیسائی ص ۲۵-۴۶

۴ عرفان انیس۔ از سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی ص ۴۷-۷۰

۵ مراسلات (محمد مشتاق شارق و لطیف حسین ادیب ص ۷۱-۷۲

۶ وفیات۔ از مالک رام۔ ص ۷۳-۹۱ (سخاوت مرزا۔ مختار ہاشمی۔ اسلم لکھنوی۔ لائق لکھنوی۔ سید جعفر علی شاہ طاہر۔ مسلم ضیائی۔ عبدالرزاق قریشی)

جلد ۲ ۱۹۷۸ء

شمارہ ۱۔ جنوری/مارچ

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲

۲ زریں کا فارسی چار درویش۔ از گیان چند ص ۳-۱۸

۳ برج کی میگھ ملہار۔ از جاوید وششٹ۔ ص ۱۹-۱۱۴

۴ وفیات از مالک رام۔ ص ۱۱۵-۱۴۳

(نرندر ناتھ تجی۔ عبداللطیف سیفر بجنوری۔ کرپال سنگھ بیدار۔ جے کرشن چودھری حبیب۔ شباب اورنگ آبادی۔ بسمل سعیدی ٹونکی۔ آصف بنارسی۔ ابراہیم جلیس۔ بسمل سندیلوی)

شمارہ ۲۔ اپریل/جون

۱ ملاحظات۔ از مالک رام۔ ص ۲

۲ پروانہ کے دو مخطوطات۔ از شفق خواجہ ص ۳-۱۲

۳ سمتر انندن پنت۔ از اوم پرکاش بجاج۔ص ۱۳۵-۱۴۰ ۴ ایک ادبی سفر نامہ۔ از کبیر احمد جائسی۔ص ۱۴۱-۱۸۰

۵ وفیات۔ از مالک رام۔ص ۸۱-۱۱۱ (ساحر سنامی۔ ابن انشا۔ محمد حسن عسکری۔ شفیع الدین نیر۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ اعجاز صدیقی۔ محمود احمد نیر)

شمارہ ۳۔ جولائی/ستمبر

۱ ملاحظات از مالک رام۔ ص ۲۔ ۲ میرا افسانہ۔ از ملّا واحدی۔ ص ۹-۱۴۶

شمارہ ۴۔ اکتوبر/دسمبر۔

۱ ملاحظات از مالک رام ۔ص ۲ ۔ ۴ ۲ حل المطالب (شرح دیوانِ غالب) از بیان یزدانی ص ۵-۴۶

۳ ادب کیا ہے از احمد الشائب: تلخیص و ترجمہ از غلام مرسلین۔ص ۴۷-۶۷ ۴ وفیات از مالک رام۔ص ۶۹-۱۲۸

(عبد العلی صدیقی۔ محمد اسلم سیفی۔ محمد احسن فاروقی۔ سید آل رضا۔ شایق لکھنوی۔ سحر عشق آبادی۔ تاج بھوپالی نیرّ ناگپوری۔ ماہر القادری۔ یوسف حیدر آبادی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ بسمل عظیم آبادی۔ سجاّد حسین شدید لکھنوی۔ وصی احمد اخگر)

سہ ماہی تحریر میں شایع شدہ مالک رام صاحب کے مضامین

نمبر شمار	عنوان	جلد نمبر	شمارہ	صفحات
۱	غبار خاطر	۱	۱	۶۱-۷۶
۲	ہفتہ وار کوہ نور لاہور۔	۱	۲	۲۲۵-۲۴۸
۳	مولانا ابوالکلام آزاد۔	۱	۱	۷۵-۹۸
۴	ابو النصر غلام یٰسین آہ۔	۲	۲	۱۲۷-۱۶۸
۵	ایک رسم الخط۔	۳	۱-۲	۷۵-۷۶
۶	نسخۂ دلکشا۔	۳	۳-۴	۱۷۷-۲۰۴
۷	جگر بریلوی۔	۴	۲	۹۵-۱۰۰
۸	احسان، غالب، ذکا کے قطعات۔	۴	۳	۷۳-۸۰
۹	چیستانِ جرأت۔	۴	۴	۱۲۳-۱۲۶
۱۰	انشائی سید گل۔	۵	۴	۱۵۷-۱۸۶
۱۱	غالب کی چھٹی مہر۔	۵	۴	۱۸۷-۱۸۹
۱۲	غالب کی ایک رباعی۔	۵	۴	۱۹۰-۱۹۲
۱۳	جوش ملسیانی۔	۶	۴	۱۲۲-۱۳۷
۱۴	انشار کی تاریخ ولادت و وفات۔	۷	۲	۴۳-۴۸
۱۵	غالب۔ ایک غیر مطبوعہ معاصرانہ اندراج۔	۸	۱	۷-۱۰
۱۶	پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب۔	۸	۲	۹۹-۱۲۰
۱۷	ل۔ احمد اکبر آبادی: ایک سرسری جائزہ۔	۸	۳	۱۰۱-۱۱۵
۱۸	حیاتِ رشید۔	۹	۴	۷۳-۹۰
۱۹	ضیا فتح آبادی۔ مختصر سوانح حیات۔	۱۱	۳	۹-۱۶
۲۰	تبصرے۔	۹	۳	۵۵-۷۸

مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصرے:

۱ بیسویں صدی میں مغربی بنگال کے اردو شعراء مؤلفہ مشتاق احمد
۲ تذکرہ شعراء: مؤلفہ حسرت موہانی۔ مرتبہ احمر لاری۔
۳ حسرت موہانی: حیات اور کارنامے از احمر لاری۔
۴ میر حسن: حیات اور ادبی خدمات، از ڈاکٹر فضل الحق
۵ جگر بریلوی۔ ایک تعارف از لطیف حسین ادیب
۶ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے از حسینی شاہد۔
۷ مثنوی مولانا روم (جلد اول) مترجمہ قاضی سجاد حسین
۸ سلک کلک: مرتبہ محمد شرف عالم۔
۹ شعر اور شاعر (تذکرہ شعرائے دور حاضرہ) از ضیاء فتح آبادی۔
۱۰ سازِ نوا: مرتبہ حلقۂ تشنگان ادب نئی دہلی۔
۱۱ مصر الجدید، از محمد ابراہیم۔
۱۲ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں از خواجہ غلام السیدین
۱۳ بدما بھوشن پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی اردو خدمات۔ از صادق نوید۔
۱۴ اردو مصدر نامہ از حفیظ الرحمٰن واصف۔
۱۵ یہ تھی دلّی از طالب دہلوی
۱۶ مسالک و منازل از ضیاء احمد بدایونی
۱۷ علی جواد زیدی (ضبط شدہ نظمیں) مرتبہ خلیق انجم و مجتبیٰ حسین

وفیات کے عنوان سے سہ ماہی تحریر میں مندرجہ ذیل مشاہیر کے سوانحی خاکے شایع ہوئے

نمبر	نام	حوالہ
۱	جعفر علی خاں اثر لکھنوی۔	جلد ۱۔ شمارہ ۲۔ ۱۹۶۷ء
۲	اخگر فیروز پوری۔	
۳	رفیق مارہروی۔	
۴	شاہد احمد دہلوی۔	
۵	لال چند فلک۔	
۶	نذر سجاد حیدر۔	جلد ۲۔ شمارہ ۱ ۱۹۶۸ء
۷	مہاشہ سُدرشن۔	
۸	سراج لکھنوی۔	
۹	انوپ چند آفتاب پانی پتی۔	
۱۰	محمد عبدالباقی۔	
۱۱	حافظ علی بہادر خاں	جلد ۲ شمارہ ۲ ۱۹۶۸ء
۱۲	صولت ٹونکی۔	
۱۳	پریم شنکر فرحت دہلوی۔	
۱۴	پرویز شاہدی۔	
۱۵	نجیب اشرف ندوی۔	جلد ۲۔ شمارہ ۳۔ ۱۹۶۸ء
۱۶	شفا گوالیاری۔	
۱۷	حکیم احمد شجاع۔	جلد ۳ شمارہ ۳ - ۴ ۱۹۶۹ء
۱۸	فقیر سید وحید الدین۔	
۱۹	ڈاکٹر ذاکر حسین۔	

۲۰	نریش کمار شاد ۔	جلد ۳
۲۱	الم مظفر نگری ۔	
۲۲	ناطق گلاؤٹھوی ۔	شمارہ ۳۔۴
۲۳	مشیر احمد ناظر کاکوروی ۔	
۲۴	عندلیب شادانی ۔	۱۹۶۹ء
۲۵	مخدوم محی الدین ۔	
۲۶	راز چاندپوری ۔	
۲۷	علی عباس حسینی ۔	
۲۸	آرتھر جان آربری ۔	
۲۹	محمد اجمل خاں ۔	
۳۰	واقف مرادآبادی ۔	
۳۱	رئیس احمد جعفری ۔	جلد ۲
۳۲	مفتی انتظام اللہ شہابی ۔	شمارہ ۱
۳۳	خورشید احمد جامی ۔	۱۹۷۰ء
۳۴	پرنسپل عبدالشکور ۔	
۳۵	امتیاز علی تاج ۔	جلد ۴
۳۶	شکیل بدایونی ۔	شمارہ ۳
۳۷	منور لکھنوی ۔	۱۹۷۰ء
۳۸	ضیاء القادری بدایونی ۔	
۳۹	ماچس لکھنوی	
۴۰	سلیمان اریب ۔	جلد ۴
۴۱	توفیق الحق حزیں ۔	شمارہ ۴
۴۲	بیدل بیکانیری ۔	۱۹۷۰ء
۴۳	تیغ الہ آبادی	

۴۴ اسرار احمد آزاد۔	
۴۵ ناشاد کانپوری۔	جلد ۵
۴۶ آغا خلش کانپوری۔	شمارہ ۱
۴۷ دیا بریلوی۔	
۴۸ احترام الدین شاغل عثمانی۔	۱۹۷۱ء
۴۹ عابد علی عابد۔	
۵۰ روشن صدیقی۔	
۵۱ باسط اوجینی۔	
۵۲ عقیل جعفری۔	جلد ۵
۵۳ میاں بشیر احمد۔	
۵۴ عبدالقادر سروری۔	شمارہ ۱
۵۵ قیس بنارسی۔	۱۹۷۱
۵۶ وکیل اختر۔	
۵۷ اختر علی تلہری۔	
۵۸ پروفیسر محمد حبیب۔	جلد ۵
۵۹ تسکین قریشی۔	شمارہ ۳
۶۰ شاغل قادری۔	۱۹۷۱ء
۶۱ خیر بہوروی۔	
۶۲ سید شریف الحسن راز بلگرامی۔	
۶۳ طالب کشمیری۔	جلد ۶
۶۴ عارف عباسی۔	شمارہ ۱
۶۵ منظر اکبر آبادی۔	۱۹۷۲ء

۶۶ مہادیو پرشاد سامی
۶۷ انقر موہانی
۶۸ سید عبداللطیف
۶۹ غلام رسول مہر
۷۰ خواجہ غلام السیدین

جلد ۶ شمارہ ۱ ۱۹۷۲ء

۷۱ عادل رشید
۷۲ بشیر النسا بیگم بشیر حیدر آبادی
۷۳ یحییٰ اعظمی
۷۴ ناصر کاظمی

جلد ۶ شمارہ ۲ ۱۹۷۲ء

۷۵ یوسف ظفر
۷۶ محمد افضل باقی صدیقی
۷۷ امیر احمد انیم خیرآبادی۔
۷۸ علیم اختر مظفر نگری
۷۹ سراج الدین ظفر

جلد ۶ شمارہ ۳ ۱۹۷۲ء

۸۰ عبدالستار صدیقی
۸۱ تاج قریشی
۸۲ مختار صدیقی
۸۳ شیخ اسماعیل پانی پتی
۸۴ صالحہ بیگم مخفی
۸۵ سید سخی حسن نقوی
۸۶ تمنا عمادی۔
۸۷ پروفیسر احتشام حسین

جلد ۷ شمارہ ۱ ۱۹۷۳ء

۸۸ حفیظ ہوشیارپوری

۸۹ فرقت کاکوروی

۹۰ شیخ محمد اکرام

۹۱ ممتاز شیریں

۹۲ شوکت سبزواری

۹۳ ذاکر حسین فاروقی

۹۴ حمید ناگوری

۹۵ گہر گورکھپوری

۹۶ حشر سیتاپوری

۹۷ جعفر حسن

۹۸ ضیا احمد بدایونی

۹۹ سجاد ظہیر

۱۰۰ جذب عالم پوری

۱۰۱ بیگم اختر

۱۰۲ ابر احسنی گنوری

۱۰۳ سلام مچھلی شہری

۱۰۴ تاب حیدرآبادی

۱۰۵ راجا محمد امیر احمد خاں (والی محمود آباد)

۱۰۶ پنڈت رام پرتاب اکل جالندھری

۱۰۷ امجد نجمی

۱۰۸ منور سہائے انور

۱۰۹ بلونت کمار ساگر نکودری

۱۱۰ مہندر ناتھ

۱۱۱ نثار اٹاوی

جلد ۷ شمارہ ۲ ۱۹۷۳ء

جلد ۸ شمارہ ۱ ۱۹۷۴ء

جلد ۸ شمارہ ۴ ۱۹۷۴ء

۱۱۲	پروفیسر حمید احمد خاں	جلد ۸
۱۱۳	حامد اللہ افسر میرٹھی	
۱۱۴	اشر حیدر آبادی	
۱۱۵	خضر تمیمی	شمارہ ۴
۱۱۶	محمد حسین حسان	
۱۱۷	ساغر صدیقی	
۱۱۸	طفیل احمد جمالی	۱۹۷۴ء
۱۱۹	بہزاد لکھنوی	
۱۲۰	ثاقب عظیم آبادی	
۱۲۱	منی لال جوان سندیلوی	جلد ۹
۱۲۲	نور محمد قیس کوٹوی	شمارہ ۱
۱۲۳	عزیز قریشی	۱۹۷۵ء
۱۲۴	عبدالقیوم مہجور شمسی	
۱۲۵	محمود احمد عباسی	
۱۲۶	محشر مرزا پوری	جلد ۹
۱۲۷	نواب محمد اسمٰعیل خاں تاج (والی ٹونک)	
۱۲۸	ثمر چھپروی	شمارہ ۱
۱۲۹	انور کامٹوی	
۱۳۰	شاہ معین الدین ندوی	۱۹۷۵ء
۱۳۱	شبیر محمد اختر گجراتی	
۱۳۲	عبدالرحمٰن چغتائی	
۱۳۳	دیوان سنگھ مفتوں	جلد ۹
۱۳۴	مسیح الزماں	شمارہ ۲ ۱۹۷۵ء

		جلد / شمارہ
۱۳۵	حیرت بدایونی۔	جلد ۹، شمارہ ۲، ۱۹۷۵ء
۱۳۶	اعجاز حسین۔	
۱۳۷	شمیم کرہانی۔	
۱۳۸	شفقت کاظمی۔	
۱۳۹	بشیر خاں مانی ناگپوری۔	جلد ۹، شمارہ ۳، ۱۹۷۵ء
۱۴۰	مضطر حیدرآبادی۔	
۱۴۱	ذوالفقار علی بخاری۔	
۱۴۲	نشتر جالندھری۔	
۱۴۳	شبش چند سکسینہ طالب۔	جلد ۱۰، شمارہ ۱، ۱۹۷۶ء
۱۴۴	بسمل الٰہ آبادی۔	
۱۴۵	چودھری برہم ناتھ دت قاصر۔	
۱۴۶	مسعود حسین رضوی ادیب۔	جلد ۱۰، شمارہ ۲، ۱۹۷۶ء
۱۴۷	میرزا محمود بیگ۔	
۱۴۸	تمکین سرمست۔	
۱۴۹	نجم آفندی۔	
۱۵۰	سیّد محمد جعفری۔	جلد ۱۰، شمارہ ۳، ۱۹۷۶ء
۱۵۱	جوش ملسیانی۔	
۱۵۲	کیف مرادآبادی۔	
۱۵۳	شہاب مالیر کوٹلوی۔	
۱۵۴	سالک لکھنوی۔	
۱۵۵	جگر بریلوی۔	جلد ۱۰، شمارہ ۴، ۱۹۷۶ء
۱۵۶	مخمور اکبرآبادی	
۱۵۷	محمد عثمان فارقلیط	

جلد ۱۰ — شمارہ ۴ — ۱۹۷۶ء

۱۵۸ مبارز الدین رفعت
۱۵۹ ملک عبدالعزیز نصر اللہ خاں
۱۶۰ کیف بارہ بنکوی
۱۶۱ ریورنڈ سید شفاعت حسین ریحانی
۱۶۲ جان نثار اختر
۱۶۳ پروفیسر سیّد محمد
۱۶۴ پریم ناتھ در

جلد ۱۱ — شمارہ ۱ — ۱۹۷۷ء

۱۶۵ ملا واحدی
۱۶۶ محشر عنایتی
۱۶۷ یمین احسن کلیم
۱۶۸ صوفی بانکوٹی۔
۱۶۹ دامودر ٹھاکور ذکی
۱۷۰ اختر لکھنوی
۱۷۱ آغا حیدر حسن مرزا
۱۷۲ ریاست علی ندوی
۱۷۳ سیّد وقار عظیم
۱۷۴ میرزا محمد عزیز معزز لکھنوی۔
۱۷۵ سیّد وصی احمد فانی بلگرامی۔
۱۷۶ تحسین سروری۔

جلد ۱۱ — شمارہ ۲ — ۱۹۷۷ء

۱۷۷ مولانا عبدالماجد دریابادی۔
۱۷۸ رشید احمد صدیقی۔
۱۷۹ کرشن چندر
۱۸۰ اختر اورینوی

۱۸۱ محمد صدرالدین فضا شمسی۔
۱۸۲ محمد ظفر اشک سنبھلی۔

جلد ۱۱
شمارہ ۲
۱۹۷۷ء

۱۸۳ سخاوت مرزا۔
۱۸۴ مختار ہاشمی۔
۱۸۵ اسلم لکھنوی۔

جلد ۱۱
شمارہ ۳
۱۹۷۷ء

۱۸۶ لایق لکھنوی۔
۱۸۷ سید جعفر علی شاہ طاہر۔
۱۸۸ مسلم ضیائی۔
۱۸۹ عبدالرزاق قریشی۔

جلد ۱۱
شمارہ ۴
۱۹۷۷ء

۱۹۰ نرندر ناتھ نجمی۔
۱۹۱ عبداللطیف سیفر بجنوری۔
۱۹۲ کرپال سنگھ بیدار۔
۱۹۳ جے کرشن چودھری حبیب۔
۱۹۴ شباب اورنگ آبادی۔
۱۹۵ بسمل سعیدی ٹونکی۔
۱۹۶ آصف بنارسی۔
۱۹۷ ابراہیم جلیس۔
۱۹۸ بسمل سندیلوی۔

جلد ۱۲
شمارہ ۱
۱۹۷۸ء

۱۹۹ ساحر شنامی۔
۲۰۰ ابن انشار۔
۲۰۱ محمد حسن عسکری۔
۲۰۲ شفیع الدین نیر۔
۲۰۳ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔

جلد ۱۲
شمارہ ۲
۱۹۷۸ء

۲۰۴ اعجاز صدیقی
۲۰۵ محمود احمد ہنر۔

جلد ۱۲
شمارہ ۲
۱۹۷۸ء

۲۰۶ عبدالعلی صدّیقی۔
۲۰۷ محمد اسلم سیفی۔
۲۰۸ محمد احسن فاروقی۔
۲۰۹ سید آل رضا۔
۲۱۰ شایق لکھنوی۔
۲۱۱ سحر عشق آبادی۔
۲۱۲ تاج بھوپالی۔
۲۱۳ نیرّ ناگپوری۔
۲۱۴ ماہر القادری۔
۲۱۵ یوسف حیدر آبادی۔
۲۱۶ خلیل الرحمٰن اعظمی۔

جلد ۱۲
شمارہ ۴
۱۹۷۸ء

۲۱۷ بسمل عظیم آبادی۔
۲۱۸ سجاد حسین شدید لکھنوی۔
۲۱۹ وصی احمد اخگر۔

جلد ۱۲
شمارہ ۴
۱۹۷۸ء

مالک رام کی تحریریں
اور خاکے

۱۔ میرزا غالب
۲۔ سائل دہلوی

میرزا غالب

میرزا غالب سے ان کی زندگی میں مجھے بارہا ملنے کا اتفاق ہوا۔ ہمارے خاندان کے ان سے بہت پرانے تعلقات تھے۔ بلکہ دور نزدیک سے کچھ عزیزداری بھی تھی۔ میرے والد ان کے ہمعمر اور ہمجولی تھے۔ وہ دونوں بچپن میں شیخ معظّم کے مکتب میں اکٹھے پڑھتے تھے۔ لیکن میری ملاقات ان سے بہت بعد کو ہوئی۔ میرزا صاحب میری پیدائش سے بہت پہلے ہی ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں آگرا چھوڑ کر دلّی چلے آئے تھے۔ پھر اگرچہ اس کے بعد بھی وہ دو ایک مرتبہ آگرے تشریف لے گئے، لیکن صغرسنی کے سبب میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا۔

ایک زمانے کے بعد جب کاروبار کے سلسلے میں پہلی بار میرا دلّی آنا ہوا، تو چلتے وقت والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ دیکھو، میرزا غالب کی خدمت میں ضرور حاضر ہونا اور ان سے میرا سلامِ شوق عرض کرنا۔ یہ غدر ۱۸۵۷ء سے چھ سات برس پہلے کا ذکر ہے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میرزا صاحب ان دنوں لال کنواں میں حضرت مولانا نصیرالدین عرف میاں کالے کی حویلی میں رہتے تھے۔ ۱۸۴۷ء میں ان پر جو آغانہ قائم کرنے کے جرم میں مقدمہ چلا تھا اس کے نتیجے میں وہ تین مہینے قید خانے میں رہے تھے۔ جب قید سے رہا ہوئے تو میاں کالے صاحب انھیں اپنے ہاں لوالے گئے۔ میرزا صاحب نے بہت کہا کہ حضرت! آپ میرے بزرگ اور مخدوم ہیں۔ میں آزاد منش آدمی ہوں، میرے یہاں رہنے سے آپ کو تکلیف اور پریشانی ہوگی، لیکن میاں کالے ایک نہیں مانے اور مجبوراً میرزا صاحب کو ان کے مکان پر قیام کرنا پڑا۔ یہیں وہ مشہور لطیفہ پیش آیا تھا کہ ایک دن ایک صاحب مزاج پرسی

کے لیے حاضر ہوئے اور مبارک باد دی کہ شکر ہے، خدا کے فضل سے آپ قید سے آزاد ہوئے! اس پر میرزا بولے "کون بھڑوا آزاد ہوا ہے! پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں"۔ میرزا غالب اس مکان میں ستمبر ۱۸۴۷ء سے لے کر مارچ ۱۸۵۲ء تک رہے تھے۔

یہاں دلی میں کام سے مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ جلد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ لیکن یہی فکر تھی کہ بن ملے واپس گیا، تو قبلہ والد صاحب ناراض ہوں گے۔ اس لیے جوں توں کر کے واپسی سے ایک دن پہلے مغرب کے قریب ان کے مکان پر گیا اور اطلاع کرائی۔ ملازم مجھے اندر لے گیا۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ ایک تخت بھی قریب میں پڑا تھا۔ میرزا غالب صاحب ایک مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ بعض اور احباب دوسرے مونڈھوں پر تشریف رکھتے تھے۔ میں ان میں سے کسی کو پہچانتا نہیں تھا بعد کو معلوم ہوا کہ ان میں صاحب خانہ حضرت میاں کالے تھے۔ احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خان تھے۔ نواب مصطفٰی خان شیفتہ، نواب ضیاء الدین احمد خان تھے۔ اور بھی دو تین صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے پہنچ کر آداب عرض کیا اور چپکے سے ایک طرف تخت کے سرے پر بیٹھ گیا۔ میرزا صاحب نے بے تکلفی کے لہجے میں فرمایا: آیئے، آیئے، تشریف رکھیے۔ فرمایئے، میں نے اپنا نام بتایا اور عرض کیا کہ میں اکبر آباد کا رہنے والا ہوں اور صرف سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ اس پر وہ مسکرا کر کچھ کہنے کو تھے کہ نہ معلوم حاضرین میں سے کس نے کوئی سوال کر دیا اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔

میرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا ہاڑ، ڈاڑھی صفاچٹ، نازک باریک مونچھیں جنھیں تاؤ دے رکھا تھا۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، جس میں چمپئی دمک تھی، سر پر لمبے لمبے پٹھے، قلموں پر لٹکتے ہوئے بال، سر پر ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدہ کا کام تھا، بدن پر تنزیب کا انگرکھا، اور نیچے ایک برکا سپید پاجامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان کی سٹک تھی اور کش لگا رہے تھے۔ نواب شیفتہ چالیس سے اوپر تھے۔ ان کے چہرے سے متانت اور سنجیدگی ٹپکتی تھی۔ بات بہت ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے۔ نواب ضیاء الدین خان ان دنوں جوان تھے۔ تیس کے لگ بھگ ہوں گے۔ بارعب کتابی چہرہ، بھری بھری ڈاڑھی، شربتی آنکھیں حکیم احسن اللہ خان اور مولانا نصیر الدین دونوں بزرگ بڑی نورانی شکلوں کے مالک تھے۔ حال آنکہ حاضرین میں سب وجیہہ اور باوقار لوگ موجود تھے۔ پھر بھی اس سارے مجمع میں میرزا صاحب کی شخصیت خاص طور پر نمایاں تھی۔

دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ کچھ شعر و شاعری، کچھ تصوف، کچھ قلعے کے لطیفے؛ غرض کہ دو گھڑی بڑے لطف کی صحبت رہی۔ اس کے بعد احباب رخصت ہونے لگے، میں اس انتظار میں رہا کہ ذرا فراغت اور یکسوئی ہوئے، تو اپنا تعارف کراؤں۔ چنانچہ جب سب صاحب رخصت ہو لیے، تو میں نے جرأت کر کے گزارش کی کہ میں خاص طور پر حاضرِ خدمت ہوا ہوں جب انھیں معلوم ہوا کہ میں کون ہوں، تو بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور آگرے کے دوسرے احباب کا حال پوچھتے رہے۔ پھر پوچھا کہ کہاں اُترے ہو، اور کب تک قیام ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک عزیز کے یہاں پہاڑ گنج میں ٹھہرا ہوا ہوں اور انشاء اللہ کل واپس جا رہا ہوں۔ فرمایا کیا معنی کہ وہ عزیز ہیں اور میں دشمن تھا۔ میاں تمھیں اپنے اور ہمارے خاندان کی آمیزش کا حال کیا معلوم! تمھارے والد تو میرے لنگوٹیے یار ہیں۔ ہم مکتب میں، کریما اور مقیماں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ دن بھر ایک ساتھ کھیلتے تھے اور ایک کو دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ تمھارے والد پڑھنے لکھنے اور آموختنے میں بہت ہوشیار تھے۔ آہ! کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ میں نے باقاعدہ طور پر مکتب جانا اور پڑھنا لکھنا، دس بارہ برس کی عمر سے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس پر بڑے خان صاحب (یعنی خواجہ غلام حسین کمیدان، میرزا صاحب کے نانا جان) بہت خفا ہوئے۔ والدہ بھی بہت ناراض ہوئیں۔ ماموں نے بھی سمجھایا۔ لیکن بیکار، معلوم نہیں۔ میرے سر پر آوارگی کا بھوت کچھ اس بری طرح سوار تھا کہ کچھ اثر نہ ہوا اور میں نے دوبارہ مکتب کی طرف منہ نہ کیا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگے، اب سوچتا ہوں کہ شاید کچھ ایسا بڑا نقصان بھی نہیں ہوا۔ بھلا وہ تعلیم جاری رہتی، تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ لوگ مجھے عالم اور مولوی کہنے لگتے۔ لیکن جتنا علم مجھے اب ہے، اس سے کیا فائدہ حاصل ہوا کہ مزید کی آرزو ہو۔ چالیس برس کی بک بک سے۔

کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

اسی طرح تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے، کچھ مجھ سے، کچھ اپنے آپ سے۔ جب میں نے اجازت چاہی، تو فرمایا: بھائی کو سلام شوق کے بعد کہنا کہ دل ان کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے اور یہ شعر سنانا:

مالذتِ دیدار، ز پیغام گرفتیم

مشتاق تو، دیدن ز شنیدن نشناسند

اور ہاں، دیکھو۔ اب کے جو دلّی آنا ہو، تو میرے ہی پاس ٹھہرنا۔ اس میں تکلّف کی کوئی بات نہیں۔ اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔

۲

دوسری بار میں نو دس مہینے بعد ۱۸۵۳ء کی گرمیوں میں دلّی آیا اور جرأت کر کے میرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع انھیں پہلے سے دے رکھی تھی۔ وہ ان دنوں بلّی ماران میں حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں کرایے پر رہتے تھے۔ یہ مکان بہت ہوادار اور مشرق سے کھلا تھا۔ اس لیے دریا کی طرف سے خوب ہوا آتی تھی۔ محلسرائے اور دیوان خانہ بھی الگ الگ تھا۔ لیکن اس میں ایک نقص تھا کہ کمرے بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔

میں پہنچا، تو میرزا صاحب بڑی گرمجوشی سے ملے اور فرمایا کہ میں بہت خوش ہوا کہ تم نے اسے اپنا گھر سمجھا۔ تمھارے والد میرے بھائی ہیں، اور تم میرے بھتیجے اور بیٹے ہو۔ پھر فرمایا: دیکھو، کوئی شرم اور تکلّف کی بات نہیں۔ کسی شے کی ضرورت ہو، تو بے جھجک مانگ لینا۔ اگر کھانے میں کوئی خاص چیز پکوانے کی خواہش ہو، تو داسے کہہ دو، پک جائے گی۔ اب آؤ، تمھیں تمھاری چچی کے پاس لے چلوں۔

اس کے بعد وہ مجھے اندر بیگم صاحب کے پاس لے گئے۔ وہ اس وقت زین العابدین خاں عارف مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، باقر علی خان اور حسین علی خان کو کھانا کھلا رہی تھیں۔ باقر علی خان اس وقت پانچ چھ برس کا تھا اور حسین علی خان ڈھائی تین کا۔ باقر علی خان مستقل طور پر رہتا تو اپنی دادی اماں کے پاس تھا، لیکن اس وقت یونہی کھیلتے کھیلتے ادھر آ نکلا تھا؛ حسین علی خان البتہ میرزا صاحب ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ میرزا صاحب نے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ میرے عزیز ہیں۔ اور رشتے میں بھتیجے ہوتے ہیں۔ کسی کام سے یہاں آئے ہیں۔ تمھارے پاس ٹھہریں گے، ذرا خیال رکھنا، انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں آداب بجا لایا۔ بیگم صاحب نے دعا دی اور فرمایا، "بیٹا، تکلّف کا خانہ خراب۔ اگر تمھیں کوئی چیز چاہیے، تو کسی نوکر سے کہہ دو، یا مجھے اندر کہلوا بھیجو۔ مہیا ہو جائے گی۔ اور اگر شرماتے رہے، تو تم جانو۔"

میں شام کے قریب پہنچا تھا اور سفر کی تکان کے سبب میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اشتہا

بھی نہیں تھی۔ میرزا صاحب نے کالے خان (عرف کلّو) داروغے سے کہا: دیکھو، آپ کا پلنگ باہر کے دالان میں لگا دو اور پانی کا لوٹا پاس رکھ دو، تاکہ صبح مانگنے کی ضرورت نہ رہے۔ میں تھکا ماندہ تو تھا ہی، بستر پر پڑتے ہی سو گیا۔

اگلی صبح اٹھا تو دیکھا کہ میرزا صاحب مجھ سے پہلے جاگ چکے ہیں، اور ابھی ابھی دیوان خانے میں آکر بیٹھے ہیں۔ میں بھی ہاتھ منہ دھو، آداب عرض کرکے، ان کے پاس جا بیٹھا۔ دیوان خانے میں سفید چاندنی کا فرش ہو رہا تھا۔ صدر میں قالین اور دو تین گاؤ تکئے لگے رکھے تھے۔ ایک طرف قرینے سے لگن میں پیچوان رکھا تھا۔ قالین کے کنارے، چاندی کا پاندان پڑا تھا۔ کمرے میں تین چار پیتل کے اگالدان تھے اور ایک کونے میں بڑی سی چلپچی دھری تھی۔ تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سرپوش ڈھکا ہوا ایک لوٹا اور دو خالی گلاس لائی، اور انھیں قالین کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا: کیوں بھائی، حصّہ کروگے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا ہے۔ کہنے لگے بادام اور مصری، کوئی حرام چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مجھے گرمی کی شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح چھلکا اتار کر انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ۔ جتنا بچے، گرمی ہو کہ جاڑا۔ روزانہ صبح نہار منہ، یہ ٹھنڈا پانی پیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہوں اس تبرید کے لیے مصری خاص طور سے بیکانیر سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور خشک اور مٹھاس میں خوب ہوتی ہے۔ یہاں جو مصری بازار میں ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔

ہم ابھی بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ ڈاکیا آیا اور تین چار خط دے گیا۔ میرزا صاحب حقّہ پینے اور خط پڑھنے لگے۔ ان میں ایک خط غالباً منشی ہرگوپال تفتہ کا تھا جنھیں وہ مرزا تفتہ کہتے تھے۔ دوسرا بریلی والے قاضی عبدالجمیل کا تھا۔ دو اور خط اب یاد نہیں رہا کہ کن کے بنائے تھے۔ جب خط پڑھ چکے تو کہنے لگے۔ لو صاحب، میں تو اب قلعے جاتا ہوں دس بجے تک واپسی ہوگی۔ تم چاہو، یہاں بیٹھو، چاہو گھومنے چلے جاؤ۔ قلعے سے واپسی پر کھانا کھائیں گے۔ اگر جاؤ، تو اس وقت تک گھر پر پہنچ جانا۔

میں سیر کے لیے باہر جانے ہی والا تھا کہ میرزا صاحب کے دو تین ملاقاتی آگئے۔ ایک تو میر افضل علی عرف میرن صاحب کے خسر بزرگوار جناب مولوی مظہر علی صاحب تھے۔ دوسرے پنڈت شیواجی رام

مونس میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان کے ساتھ ان کا نوجوان بیٹا بال مکند بھی تھا۔ مولوی مظہر علی تو اسی محلے میں میرزا قربان بیگ کے مکان میں رہتے تھے۔ میرزا صاحب کے مسکن اور ان کے گھر کے درمیان ایک میر خیرات علی کی حویلی تھی۔ پنڈت شیواجی رام کا مکان کچھ فاصلے پر کوچہ پنڈت میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد میر احمد حسین میکش آگئے۔ یہ بھی میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ ان اصحاب کو دیکھ کر، کلّو حقّہ تازہ کر کے لے آیا۔ سب نے کلّو سے کہا کہ بیگم صاحب کی خدمت میں ہمارا آداب کہلوا دو۔ کلّو نے آواز دے کر وفادار لونڈی کو بلوایا۔ معلوم ہوا کہ وہ باہر سودا سلف لینے گئی ہے۔ نیاز علی چھوکرے نے جھانک کے پوچھا: کیوں داروغہ جی، کیا چاہیے؟ کلّو نے جواب دیا، ابے، بیگم صاحب سے یہ کہو کہ مولوی مظہر علی صاحب اور میر احمد حسین اور پنڈت شیواجی رام آداب کہتے ہیں اور پنڈت جی کا صاحبزادہ بال مکند بندگی عرض کرتا ہے۔ جب اندر اطلاع ہوئی تو وفا گلوریوں کی تھالی لیے آئی اور کہا کہ بیگم صاحب سب کو آداب اور بال مکند کو دعا کہتی ہیں اور یہ کہا ہے: میرزا صاحب اب آئے جاتے ہیں۔ آپ بیٹھیے اور حقّہ پیجیے اور پان کھائیے۔ ہم سب بیٹھے گپ کر رہے تھے کہ دس بجے کے لگ بھگ میرزا صاحب قلعے سے لوٹے۔ سب نے کھڑے ہو کر آداب عرض کیا۔ وہ صدر میں مولوی مظہر علی کے پاس بیٹھ گئے اور لگے ایک ایک سے گھر بار کا حال پوچھنے۔ مولوی صاحب سے پوچھا کہ میرن صاحب کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ پنڈت شیواجی رام سے دریافت کیا کہ کہو، تمھارے محلّے میں اب موسمی بخار کا کیا حال ہے؟ بال مکند سے اس کی تعلیم سے متعلق سوال کیا۔ میکش سے اس کے گھر والوں کا پوچھا کہ شہر میں ہیں یا اپنے میکے بہرام پور گئے ہوئے ہیں۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ اندر سے نیاز علی نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوایا جائے اس پر دوستوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اور ہم دونوں بچوں کے ساتھ اندر گئے۔

اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے میں بھنا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بھرے کریلے تھے۔ بریانی پلاؤ تھا اور ایک ترکاری تھی۔ روے کا حلوہ تھا۔ دو تین قسم کا سرکے اور تیل کا اچار تھا۔ لیکن ایک بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت ترکاری سب میں چنے کی دال پڑی ہے دُلے میں کم اور گوشت ترکاری میں زیادہ میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا، دو ایک نوالے کریلے کے ساتھ کھائے؛ تھوڑے سے چاول بھی چکھے۔ البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار میں کھایا۔

جب کھانا کھا چکے تو اٹھے۔ دوا پانی کا لوٹا اور بیسن کی کٹوری لے آئی۔ آپ نے بیسن سے ہاتھ دھو لیے کہ ہاتھوں کی چکناہٹ چھوٹ جائے۔ باہر دیوانخانے میں آئے اور پلنگ پر دراز ہو گئے۔ فرمایا نیند نہیں آتی، لیکن لیٹنے کی عادت ہے۔ جب تک دو ایک گھنٹے آرام نہ کر لو، نہ کھانا ہی ہضم ہوتا ہے نہ کوئی کام ہی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ پلنگ پر لیٹے حقّے کے کش لگاتے رہے۔ میں فرش پر بیٹھا تھا پوچھنے لگے: کہو! کہیں سیر کو گئے تھے۔؟ میں نے عرض کیا کہ نکلنے ہی والا تھا کہ یہ دوست آ گئے اور ان کی خاطر سے رک گیا۔ فرمایا: واہ، اس کی کیا ضرورت تھی؟ وہ بیٹھتے تم اپنے کام پر چلے جاتے۔ میں ایک زمانے سے بالعموم ہر روز صبح کے وقت قلعے جاتا ہوں، بالخصوص جب سے حضرت ظلِّ سبحانی نے خاندان تمر کی تاریخ لکھنے پر مقرر کیا ہے۔ یہ بلا ناغہ کا دستور ہے۔ میری غیر حاضری میں بھی ہمیشہ دو ایک دوست یہاں موجود ہوتے ہیں۔ حقّہ پیا، پان کھایا، کبھی کوئی خاص ملنے والے ہوں تو، تمھاری چچی چاہیں، تو انھیں کھانے کو بھی بھیج دیتی ہیں۔ جب لوٹ کے آتا ہوں، تو ان سے دو گھڑی کی مجلس رہتی ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب حضرت جنّت مکانی بہادر شاہ ظفر بہت بیمار ہو گئے تھے اور ان کی جان تک کے لالے پڑ گئے تھے۔ اگرچہ اب بیماری کی وہ خطرناک صورت تو نہیں رہی تھی اور پہلے سے کچھ افاقت تھی، لیکن ابھی ان کی حالت تشویش سے خالی نہیں تھی۔ اس لیے میں نے پوچھا کہ حضرت بادشاہ سلامت کی صحت اب کیسی ہے؟ کہنے لگے: طبیب علاج معالجہ کر رہے ہیں اور حالت آگے سے بہتر بتائی جاتی ہے، لیکن خطرہ پوری طرح رفع نہیں ہوا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔ ان کا دم غنیمت ہے۔ آج بھی جب میں گیا ہوں، تو خوابگاہ ہی میں حاضری ہوئی۔ ولی عہد بہادر میرزا فخرو بھی وہاں بیٹھے تھے۔ میرزا سلیمان شکوہ کے پوتے میرزا نورالدین، لکھنؤ سے آئے ہوئے تھے، وہ بھی تھے۔ یہ رشتے میں اعلیٰ حضرت کے بھتیجے ہوتے ہیں اور اپنے والد میرزا کام بخش اور دادا کی طرح شیعیان اہلِ بیت میں سے ہیں، حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ دو ایک مصاحب بھی دست بستہ کھڑے تھے۔ میں نے اطلاع کرائی، تو اندر جانے کی اجازت ملی۔ میں نے مجرا عرض کیا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کمزوری کا کچھ نہ پوچھو۔ پہچانے نہیں جاتے۔ پہلے ہی کونسے سام و نریمان تھے۔ پھر عمر کا تقاضا۔ یوں سمجھو کہ اس اگلے شعبان میں اسّی برس کے ہو جائیں گے۔ رہی سہی کسر اس بیماری نے پوری کر دی۔ سوکھ کر کانٹا

ہو گئے ہیں۔ بہت رک رک کر دو ایک باتیں کیں۔ ارشاد فرمایا۔ آج ایک عجیب بات ہوئی فجر کی نماز کے بعد یونہی ذرا میری آنکھ جھپک گئی، تو میں نے دیکھا کہ حضرت عباس علمدار کی درگاہ پر علم چڑھا رہا ہوں۔ اس پر میرزا نورالدین نے عرض کیا کہ جہاں پناہ، یہ دریا صادقہ اور اشارۂ غیبی ہے۔ اس خواب کو ظاہر میں پورا کرنا چاہیے۔ فرمایا، بہت اچھا۔ خدا نے ہمیں صحت دی تو ہم حضرت کی درگاہ پر سونے کا علم چڑھائیں گے۔ سب حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا اور دعا کی کہ شافیِ مطلق جلد صحت بحال کرے اور حضور والا اپنی منّت پوری کریں۔

پھر فرمایا: ایک بات میری یاد رکھو۔ خدا ان پر فضل کرے گا اور اب یہ اچھے ہو جائیں گے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ جو شخص بھی اہلِ بیت سے محبّت کرے گا، خدا اس سے محبّت کرے گا۔ وہ دو ڈھائی بجے اٹھے۔ ہاتھ منہ دھویا اور تالین پر آن بیٹھے۔ پہلے تھوڑی دیر حقّہ پیتے رہے۔ پھر دوستوں کے خطوط کے جواب لکھے۔ لیکن گرمی اس بلا کی تھی کہ اس دوران میں انھوں نے تین چار بار پانی پیا ہوگا۔ ٹھنڈے پانی کی صراحی، جس پر صافی لپٹی ہوئی تھی، پاس رکھی تھی۔ اسے اٹھاتے اور تھوڑا سا آبخورے میں انڈیل کر پی لیتے۔ پانچ بجے کے قریب داروغہ جی کو بلایا اور حکم دیا کہ دیکھو، میاں کلّو، اب گرمی بہت ہوگئی ہے۔ دوپہر کو یہاں بیٹھنا مشکل ہے۔ کل سے ہماری اندر کی کوٹھری تیار کروا دو اور خس کی ٹٹّی کا بھی انتظام کر دو۔ ذرا خیال رکھنا، خس تازہ اور چھوٹی چھوٹی ہو۔ جس میں پانی دیر تک ٹھہر سکے اور خوشبو بھی ہو۔ اور اب برف کا ذخیرہ رکھنا چاہیے۔ میرزا صاحب اپنے حکم احکام ختم بھی نہیں کر چکے تھے کہ کلیان کہار نے آ کر اطلاع دی کہ ابھی ابھی باہر صدرالصدور جی پالکی سے اترے ہیں۔ یہ سنتے ہی میرزا صاحب جھٹ سے کھڑے ہو گئے اور صدر دروازے تک جا کر مفتی صدرالدین خاں آزردہ کی پذیرائی کی۔ باہر صحن میں مونڈھے بچھے تھے۔ پہلے مفتی صاحب کو ایک مونڈھے پر بٹھایا، پھر خود بیٹھے۔ میں بھی ایک تخت پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد یکے بعد دیگرے شیفتہ، صہبائی، نیّر رخشاں، داغ اور ظہیر بھی آ گئے۔ داغ اور ظہیر چونکہ عمر میں سب سے چھوٹے تھے، اس لیے مؤدّبانہ میرے پاس تخت پر آ بیٹھے۔ سب قادرالکلام تو تھے ہی اچھی خاصی مجلسِ مشاعرہ گرم ہو گئی۔ حضرت مفتی صاحب نے فرمایش کی کہ کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو سنائیے۔ میرزا صاحب نے پہلے تو عذر کیا۔ لیکن جب مفتی صاحب کے ساتھ صہبائی بھی اصرار کرنے لگے تو فرمایا کہ شعر کام دل و دماغ کا ہے۔ دنیاداری کے جھمیلوں ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ قلعے کی حاضری

اور دوست احباب کی خدمت سے فرصت ملے، تو انسان کچھ فکر بھی کرے اس پر آج کل آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ گرمی کے مارے حواس ٹھکانے نہیں۔ ایک غزل تھوڑے دن ہوئے کہی تھی۔ اس کے چند شعر عرض کرتا ہوں:

چاک از جیبم بہ داماں می رود — تاچہ بر چاک از گریباں می رود

جوہر طبعم درخشاں ست، لیک — روزم اندر ابر، پنہاں می رود

گر بود مشکل، مرنج اے دل، کہ کار — چوں رود از دست، آساں می رود

جز سخن، کفرے و ایمانے کجاست — خود سخن در کفر و ایماں می رود

آید و از ذوق نشناسم کہ کیست — تا ود، پنداشتی، جاں می رود

می برد، اما نہ یک جا می رود — می رود، اما پریشاں می رود

اوّلِ ماہ است و از شرمِ تو ماہ — آخرِ شب، از شبستاں می رود

کیست تا گوید، بداں ایوان نشیں

آنچہ بر غالبؔ، ز درباں می رود

حکیم مومن خان کے انتقال کو مشکل سے سال بھر ہوا تھا۔ معلوم نہیں۔ کیسے ان کا ذکر چل پڑا۔ اس پر میرزا صاحب فرمانے لگے "صاحب، بڑی آن بان کا آدمی تھا۔ ایسا رنگین مزاج اور زندہ دل اور خود دار شخص بھی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، بلکہ غزل میں ایک نئی روش کا مخترع تھا جب تک اس کا شعر ایک خاص لب و لہجہ سے نہ پڑھا جائے، اس کا پورا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مجھے تو اس کا یہ شعر نہیں بھولتا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

نفسِ مضمون، لطفِ زبان، اسلوب بیان، غرض اس کی کس کس بات کی تعریف کی جائے۔ جب تک کسی شخص نے عشق بازی کی نہ ہو، اور کسی کے فراق کا مزہ چکھا نہ ہو، اسے یہ مضمون سوجھ ہی نہیں سکتا۔ زبان کا کیا کہنا اور "گویا" میں جو پہلو ہے، وہ تو کہنے کی بات ہی نہیں سب پر طرّہ یہ کہ سہلِ ممتنع یہ "ماورائے شاعری" کچھ اور چیز ہے اور محض خدا کی دین۔ ریختہ۔ بس اس پایے کے شعر بہت کم ہیں۔

میں نے تو مرحوم سے ایک بار کہا تھا کہ بھائی، میرا سارا دیوان لے لے اور یہ شعر مجھے دے دے۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگے۔ صاحب، مومن کے مرجانے سے زندگی کا لطف آدھا رہ گیا۔ قافلہ خالی ہوتا جاتا ہے۔ مرحوم میرا یار اور ہمعصر تھا۔ میں جب آگرے سے یہاں آیا ہوں، تو یہی پندرہ سولہ برس کی میری عمر تھی۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال چھوٹا ہو۔ لیکن ذہن کا شروع سے بہت تیز تھا۔ اس نے ابتدا میں چند غزلیں نصیر کو دکھائی تھیں۔ لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نصیر کی قادرالکلامی میں شک نہیں، مگر ان کے استعارے اور تشبیہیں ایسی ہی ہیں جیسے پیاز کہ چھلکے ہی چھلکے ہیں، گودے کا نام نہیں۔ اس کے برخلاف مومن نے طبیعت معنی آفریں پائی تھی۔ بھلا کیسے نبھتی۔ بس جلد ہی یہ گھبرا کر ان کے جال سے نکل بھاگے؛ اور پھر کسی کو اپنا کلام نہیں دکھایا؛ اور میرا خیال ہے کہ یہ اچھا ہی ہوا۔ ہم دونوں کی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ اس چالیس بیالیس برس کے عرصے میں کبھی کوئی رنج وملال ہمارے درمیان نہیں آیا۔ حضرت، اتنی لمبی مدّت کا تو دشمن بھی میّسر نہیں آتا۔ دوست کہاں سے ہاتھ آتا ہے! میں نے اس کے مرنے پر ایک رباعی کہی تھی۔

شرطست کہ روے دل خراشم، ہمہ عمر	خونابہ برُخ زدیدہ پاشم، ہمہ عمر
کافر باشم، اگر بہ مرگِ مومن	چوں کعبہ، سیہ پوش نہ باشم، ہمہ عمر

باتوں اور شعر خوانی میں کسی کو وقت کا خیال نہ آیا۔ آخر مفتی آزردہ مرحوم چونکے اور کہا کہ معاف فرمایئے گا۔ آپ کی پُر لطف باتوں اور کلام میں وقت کا اندازہ نہ رہا۔ اب اجازت دیجیے۔ اگلے جمعہ کے دن غریب خانے پر مشاعرہ ہے۔ چند دوست جمع ہو رہے ہیں۔ آپ بھی ضرور قدم رنجہ فرمایئے گا۔ نواب محمد مصطفٰی خان اور نواب ضیاءالدین خان آنے کا وعدہ کر چکے ہیں، طرح، گریبانم نمی آید، واما نم نمی آید، طے ہوئی ہے۔ لیکن اس کی قید نہیں، آپ جو چاہیں، پڑھیں۔ میرزا صاحب نے جواب دیا کہ میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا۔ نیر رخشاں برابر سے بولے، تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ جمعے کو انھیں ساتھ لیتا آؤں گا۔

تھوڑی دیر میں سب صاحب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ جب میدان صاف ہو گیا تو کلو

نے آن کر پوچھا کہ آپ اسی جگہ کھانا کھائیں گے، یا اندر چل کر۔ بولے، میرے لیے تو یہیں لے آؤ۔ یہ چاہیں تو بیشک اندر جائیں۔ میں نے کہا۔ نہیں میں بھی یہیں کھالوں گا۔ چنانچہ کلّو اور ایاز دونوں، ہمارا کھانا وہیں مردانے میں لے آئے۔ میرزا صاحب نے صرف تین چار شامی کباب، کھٹی میٹھی چٹنی کے ساتھ، نوش جان فرمائے اور اس کے بعد مٹی کے آبخورے سے شراب پینے لگے۔ معلوم ہوا کہ گرمیوں کا معمول ہے کہ سرِ شام کلّو شراب بوتل سے آبخورے میں ڈال دیتا ہے۔ اگر برف موجود ہوئی تو آبخورہ اس میں رکھ دیا، تاکہ شراب ٹھنڈی رہے، ورنہ لال قند کی صافی، پانی میں تر کرکے آبخورے پر لپیٹ دی جائیں گی اور آبخورہ اُدھر ہوا میں لٹکتے ہوئے چھینکے پر رکھ دیا جائے گا۔ تاکہ ہوا لگنے سے صافی خشک ہو تو اس سے آبخورہ ٹھنڈا ہو جائے۔

شراب کے ساتھ گھی میں تلے ہوئے نمکین بادام، گزک کے طور پر کھاتے رہے۔ دس بارہ بادام کھائے ہوں گے۔ شراب میں برابر کا عرق گلاب ملاتے گئے۔ فرمانے لگے: اس سے شراب کی حدّت کم ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے یا شام کے قریب، جب چاہا دو تین گلاس پی لیے۔ بارش کا دن ہوا تو اور زیادہ۔ پھر رات کی معمولی شراب اس کے علاوہ کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، مزاج پہلے ہی سے سوداوی تھا، ان بے اعتدالیوں نے اسے اور آگ کا پتلا بنا دیا۔ اب یہ حالت ہے کہ صافی شراب گھونٹ بھر بھی نہیں پی سکتا۔ اس کے پینے سے سینہ جلنے لگتا ہے اور حلق میں کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ اس لیے اسے گوارا بنانے کو اس میں عرق گلاب ملاتا ہوں اور مقدار تو تم دیکھ ہی رہے ہو کہ برائے نام رہ گئی ہے۔ میں نے ایک مقطع میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

آسودہ باد خاطرِ غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

میں نے جرأت کرکے کہا کہ اتنے پینے سے چھوڑ دینا اچھا۔ ایسے گناہ بے لذّت سے حاصل؟

بولے: بھائی ٹھیک کہتے ہو، لیکن میاں ذوقؔ نے کیا سچ کہا ہے:

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

۳۵۔ ۴۰ برس کی عادت، اب چھٹے تو کیونکر، بہرحال شرمسار ہوں۔ اسے حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں، لیکن اس کی رحمت سے کیا بعید ہے کہ حضرت احمد مصطفٰے اور امام علی مرتضٰی کے صدقے میں

بخش دے۔ اس کے بعد موضوع بدل گیا۔ دیر تک چہکتے رہے اور آدھی رات کے قریب سونے کے لیے پلنگ پر گیے۔

اگلے دن دوپہر کا کھانا کھا کے میرزا صاحب اندر کی کوٹھری میں چلے گیے۔ مجھ سے فرمایا! یہاں گرمی میں اکیلے بیٹھے کیا کروگے۔ چاہو، تو تم بھی اندر آجاؤ۔ چنانچہ، ہم دونوں کے لیے کلّو نے چارپائیاں بچھوادیں، اور ہم ان پر دراز ہو گیے۔ فرش پر پانی کا خوب چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا کوٹھڑی کی شرقی سمت گلی میں ایک بڑی سی کھڑکی کھلتی تھی، اس پر خس کی ٹٹی لگی ہوئی تھی۔ کلّو نے ایاز چھوکرے کو مقرر کر دیا کہ وہ ہر آدھ پون گھنٹے کے بعد اس پر پانی ڈالتا رہے۔ میرزا صاحب نے بدن کے سارے کپڑے اتار دیئے، صرف ایک پاجامہ رہ گیا۔ پلنگ پر لیٹ گیے اور حقہ پیتے رہے۔ کمرے میں پانی کی صراحی اور برف رکھی تھی۔ پیاس محسوس ہوتی، تو اٹھ کر پی لیتے۔

جب عصر کا وقت ہوا اور سایے لمبے ہونے لگے، تو کوٹھڑی سے نکلے۔

آج فرمایا دیکھو میاں، دہلی کی خصوصیات میں سے ایک مسجد جامع کا شام کا بازار بھی ہے چلو، آج تمھیں تماشا دکھالائیں۔ چنانچہ کلّو کو حکم ہوا کہ پالکی کا انتظام کر دیا جائے۔ کلیان ہمارے ساتھ جائے گا۔ اگر ہماری غیر حاضری میں کوئی صاحب تشریف لائیں، تو انھیں بٹھایا جائے مغرب کے بعد مکان پر پہنچ جائیں گے۔

میرزا صاحب نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے پالکی واپس کر دی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازیگر اپنے کرتب دکھا رہا ہے؛ یار لوگ اس کے گرد بیڑا باندھے کھڑے ہیں۔ کہیں بھان متی کا تماشہ ہو رہا ہے؛ اور یہاں بھی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف، خوانچہ والے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں۔ چلتے چلتے میرزا صاحب ایک جگہ رُک گیے، اور کلیان سے کہا، جاؤ کلّن کی دکان سے رات کے لیے چار آنے کے سیخ کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوالایا۔ میں نے راستے میں ایک جگہ سے دو تین کتابیں خریدیں اور میرزا صاحب نے بچوّں کے لیے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔ واپسی میں چاندنی چوک کے راستے سے ٹہلتے ہوئے آئے۔ سعادت خان کی نہر سڑک کے بیچوں بیچ تھی۔ دورویہ درختوں کی قطاریں اور دکانوں کی روشنی کا پانی میں عکس

عجیب پر لطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت جتنی گھبرائی ہوئی تھی، اتنی ہی اس وقت شام کی سہانی فضا میں محفوظ ہوئی۔ سیکڑوں آدمی نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے میں بھی اگر اکیلا ہوتا تو شاید وہیں کسی جگہ بیٹھ جاتا۔ لیکن میرزا صاحب کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی کہ نہ معلوم، کون کون صاحب انتظار کر رہے ہوں گے۔ اس لیے ان کے ساتھ واپس آ گیا۔

جمعے کے دن شام کے کھانے کے بعد نواب ضیاءالدین خاں کہ قریب ہی قاسم جان کی گلی میں رہتے تھے۔ اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر آ گئے۔ اور کہا کہ چلیے حضور، صدرالصدور کے مشاعرے میں چنانچہ ہم دونوں بھی سوار ہو گئے۔ راہ میں سے نواب شیفتہ کو کوچہ چیلان سے ساتھ لیا اور یوں لدے پھندے ہم سب مفتی صاحب کے مسکن محلہ چتلی قبر میں پہنچے۔ دیکھا کہ وہاں خاصا مجمع ہو چکا ہے۔ قلعے سے بعض شہزادے بھی آئے ہوئے ہیں۔ جن میں سے میرزا خضر سلطان، میرزا بختاور شاہ ثنائی، میرزا قویش واقف، میرزا نورالدین شاہی اور میرزا عالی بخت عالی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک عجیب بات دیکھی کہ سب شہزادوں کا ایک سا حلیہ اور ایک سی وضع اور ہر ایک کے ہاتھ میں بیڑ تھی۔ ان میں سے بیشتر "حافظ جیو" عبدالرحمٰن احسان مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے خود استاد ذوق بھی موجود تھے۔ داغ اور ظہیر اور محمد حسین آزاد تھے۔ صہبائی اپنے شاگردوں کے ساتھ آئے تھے۔ میرزا غالب کے شاگردوں میں سے قربان علی بیگ خاں سالک، جواہر سنگھ جوہر، غلام حسن خان محو، یوسف علی خان عزیز اور بعض دوسرے اصحاب موجود تھے۔ ایک ولایت آمدہ شاعر سحابی بھی شریکِ مجلس تھے۔

مشاعرہ دس ساڑھے دس بجے کے قریب شروع ہوا۔ پہلے اردو کے شاعروں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ ان میں سے بعض کا کلام واقعی بہت پختہ اور دل نشین تھا۔ اساتذہ نے بھی بخل سے کام نہ لیا اور ان کا دل بڑھانے کو خوب داد دی۔ خصوصاً داغ اور سالک اور ظہیر کی غزلوں کی بہت تعریف ہوئی۔ اخیر میں اساتذہ کی باری آئی۔ اب نوجوان اور نو آموز طبقہ خموشی سے سنبھل کر بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے آزردہ نے کہ میزبان اور صاحبِ خانہ تھے، اپنی غزل سنائی۔ غالب اور صہبائی اور ذوق سب نے بہت تعریف کی اور آزردہ نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے بعد نیر رخشاں، شیفتہ صہبائی وغیرہ نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں شمع میرزا غالب کے سامنے آئی۔ انھوں نے پہلے ایک غیر

طرحی غزل سنائی۔ اس کے تین چار شعروں کی بہت تعریف ہوئی تھی:

هرچه فلک نخواستست، هیچ کس از فلک نخواست

ظرفِ فقیه مے بجُست، بادۂ مالگزک نخواست

جاه زعلم بےخبر، علم زجاه بے نیاز

هم محکِ تو زر ندید، هم زرِ من محک نخواست

زهد هزار شیوه را، طاعتِ حق گراں نه بود

لیک صنم بسجده در، ناصیه مشترک نخواست

آخری شعر پر آزردہ تڑپ اٹھے۔ اس کی خاص طور پر داد دی اور اسے دو تین بار پڑھوایا۔ اس کے بعد میرزا صاحب نے طرحی غزل سنائی، جس کے چند شعر میرے حافظے میں محفوظ رہ گیے ہیں:

چه عیش از وعده، چوں باورز عنوانم نمی آید	بنوعے گفت: می آیم، که می دانم، نمی آید
گزشتم زاں که برزخم دلِ صدپاره خوں گم شد	خود آوراخنده برچاکِ گریبانم، نمی آید
روش نگسسته و در سایۂ دیوار نشسته	بگویش، رشک بر مهرِ درخشانم، نمی آید
دعائے خیر شد، در حقِ من نفریں بجاں کردن	زنفریں بس که می رنجد به لب جانم، نمی آید
دلش خواهد، که تنها سوے من روے آورد لیکن	فریبِ همرهاں، دانم، زنادانم، نمی آید
دبیرم، شاعرم، رندم، ندیمم، شیوه ها دارم	گرفتم رحم بر فریاد و افغانم، نمی آید

ندارم باده غالب گر سحرگاهش سر راهے

به بینی مست، دانی، کز شبستانم نمی آید

سب شعروں کی خوب خوب داد ملی۔ پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ انھوں نے ساری غزل ہلکے ترنم سے پڑھی۔ پہلی بار مصرع اولی ایک بارگی پڑھ جاتے پھر اسے آہستہ آہستہ دہراتے اور ایک لمحہ کے توقف کے بعد اسی لہجے بس دوسرا مصرع سناتے۔ جب کوئی صاحب داد دیتے، یا مصرع اٹھاتے، تو میرزا صاحب کا داہنا ہاتھ بے اعتنایانہ تھوڑا تھوڑا سا اٹھ جاتا اور بس، ورنہ یوں وہ نہایت دلجمی سے اپنی جگہ پر بیٹھے رہے اور پہلو تک نہیں بدلے۔

میرزا غالب کی غزل کے ساتھ مشاعرہ ختم ہوا اور اس کے بعد حاضرین ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ آزردہ نے سب صاحبوں کا شکریہ ادا کیا۔ ہم بھی چار ساڑھے چار بجے کے قریب واپس مکان پر آئے۔

یہ آٹھ دس دن جو میں میرزا صاحب کے مکان پر رہا مجھے کبھی نہیں بھولیں گے۔ چوں کہ میں جس کام سے آیا تھا وہ ختم ہو چکا تھا اس لیے میرزا صاحب سے اجازت لے کر آگرے چلا گیا۔

۳

اس کے بعد میں لگ بھگ دو برس تک دلی نہ آسکا۔ اب کے میرا ۱۸۵۵ء میں آنا ہوا۔ میرزا صاحب ابھی تک اسی بلی ماروں والے مکان میں رہتے تھے۔ میں شام کے قریب پہنچا تھا۔ وہ بہت لطف اور مہربانی سے ملے۔ ان سے مل کر میں اندر گیا۔ جناب بیگم صاحب کی خدمت میں بندگی عرض کی۔ انھوں نے دعا دی سفر کا پوچھتی رہیں کہ کہو، راہ میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں باہر آیا۔ میرزا صاحب دیر تک حضرت والد صاحب قبلہ اور اپنے دوسرے ملنے والے کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پوچھا، سناؤ، کاروبار کا کیا حال ہے۔؟ میں نے کہا کہ مندا تو ہے لیکن شکر ہے' بھلی بری گزران ہوتی جاتی ہے۔ کسی کا کچھ دینا نہیں، یہی غنیمت ہے،

اس تین چار برس میں میرزا صاحب کی ظاہری شکل و صورت میں بہت فرق آگیا تھا۔ پہلی بار جب ملے ہیں' تو ڈاڑھی گھٹی ہوئی تھی۔ اب چھوڑ رکھی تھی۔ لیکن اس کے بالعکس سر منڈا ہوا تھا۔ سامنے کے دو دانت ندارد' اس لیے آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ کمر میں بھی خفیف سا خم آگیا تھا۔ غرض میں نے انھیں جسمانی لحاظ سے بہت کمزور پایا۔ البتہ طبیعت میں وہی پہلی سی چستی اور گفتگو میں شوخی موجود تھی۔

ان دنوں موسم کچھ عجیب طرح کا تھا۔ اگرچہ یوں گرمیوں کا زمانہ ختم ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی دن کو سخت گرمی پڑتی تھی۔ البتہ رات کو اچھی خاصی سردی ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ حسب معمول دوپہر کے بعد اندر کی کوٹھڑی میں گزارتے تھے۔ ایک دن کا واقعہ ہے' یہی کوئی تین کا عمل ہو گا۔ ہم ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے لطف لے رہے تھے کہ باہر دروازے پر کچھ شور ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کھٹ سے دروازہ کھلا۔ آگے حسین علی خان اور اس کے پیچھے باقر علی خان اور ان دونوں کے پیچھے مغلانی

حسین خان بھاگا چلا آرہا ہے اور ساتھ ساتھ چیختا بھی جاتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی لکڑی کا کھلونا تھا۔ معلوم ہوا کہ باقر علی خان چاہتا ہے کہ حسین علی خان اسے یہ کھلونا دے دے اور وہ دینا نہیں چاہتا۔ بس اس پر کٹا چھنی ہوگئی۔ بیگم صاحب گھر پر نہیں تھیں، اس لیے حسین علی خان، پناہ مانگنے کو دادا جان کے پاس دوڑا آیا تھا۔ ہمارے پلنگ کچھ ایسے اونچے نہیں تھے۔ حسین علی خان دوڑا دوڑا آیا اور میرزا صاحب کے پلنگ پر چڑھ گیا۔ وہ باہر مٹی اور گرد غبار میں کھیلتا آیا تھا کمرے میں پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا۔ اس سے اس کے پاؤں گیلے ہوگیے۔ اس کے اوپر چڑھنے سے سفید چادر پر جو گلکاری ہوئی، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میرزا صاحب نے جو ڈانٹا، تو بڑا لڑکا باقر علی خان تو غائب ہوگیا۔ لیکن حسین علی خان وہیں پلنگ پر بیٹھا مچلنے اور بسورنے لگا۔ چونکہ جو ہونا تھا، وہ تو ہو ہی چکا تھا، اس لیے میرزا صاحب نے خیال کیا کہ اب خفا ہونے کی کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ انھوں نے بچے کو چمکارا اور پیار کیا۔ پھر مغلانی کو آواز دی اور اسے اس کے حوالے کیا۔ کلوؔ سے بستر کی چادر بدلوائی اور دوبارہ لیٹ گیے۔

چند لمحے بعد کہنے لگے: تم سے ایک دل کی بات کہوں۔ میں اس خانہ داری سے کبھی خوش نہیں رہا۔ جب میری شادی ہوئی ہے تو مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ شادی کہتے کسے ہیں اور اس کے جھنجھٹ اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ خیر، اس کا کیا غم، کیونکہ اگر معلوم بھی ہوتا، تو میں کیا کرسکتا تھا ہمارے بزرگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اولاد کا اپنی شادی بیاہ کے بارے میں بولنا پرلے سرے کی بے حیائی ہے۔ میں ٹھہرا قلندرانہ وضع کا آدمی۔ میری یہ آرزو کہ ایک شطرنجی اور لوٹا کندھے پر ڈالوں۔ لکڑی ہاتھ میں لوں اور پیادہ پا چل نکلوں۔ آج یہاں، کل وہاں، ملکِ خدا تنگ نیست، پائے گدا لنگ نیست۔ اور یہ قبیلہ داری کے تمام اصولوں کے خلاف۔ خدا نے اولاد دی اور لے لی غم کسے نہیں ہوگا کہ وہ قدرتی امر ہے، لیکن دم مارنے کی مجال نہیں تھی، میں نے اس پر صبر شکر کیا کہ یوں بھی تنہائی میری آزاد طبیعت کے منافی نہیں تھی۔ غرض شتم پشتم گزرتی جا رہی تھی۔ لیکن قدرت بڑی ستم ظریف ہے۔ اس نے کہا۔ ذرا ٹھہر تو جا، تو کیا سمجھے بیٹھا ہے۔ تین برس ہوئے۔ پہلے زین العابدین خان کی بیوی مری۔ اور پھر وہ آپ بھی چل بسا۔ حسین علی خان کو میری بیوی یہاں لے آئی۔ بڑا بھائی اپنی دادی کے پاس جا رہا۔ چند مہینے ہوئے، وہ نیک بخت بھی جنت سدھاری

اور باقر علی خان بھی یہاں آگیا۔ اسے کہتے ہیں، غم نداری بُز بخر۔ کہو بے مروتی کر کے کس سے کہوں کہ توان بچّوں کو لے لے، میں اس بوجھ کا متحمل نہیں ہوسکتا، حالانکہ یہ حقیقت ہے۔ بس چپ چاپ قضا و قدر کی شعبدہ بازی کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ غرض اس طرح دلسوزی کی باتیں کرتے کرتے چپ ہوگیے۔ میں نے غور کر کے سُنا تو زیرِلب یہ شعر گنگنا رہے تھے:

نہ شامِ ما را سحر نویدے، نہ صبحِ ما را دمِ سپیدے

چو حاصلِ ماست نا امیدی، غبارِ دنیاں بفرقِ عقبٰے

اگلے دن صبح کے وقت بریلی سے قاضی عبدالجلیل جنوںؔ کے بھیجے ہوئے آموں کے دو ٹوکرے پہنچے میرزا صاحب نے قاضی صاحب کے ملازم کو جو ٹوکرے لایا تھا، انعام دیا اور ٹوکرے اپنے سامنے کھلوائے۔ کچھ آم راستے میں خراب ہوگیے تھے وہ پھکوا دیے۔ دس دس آم دو جگہ نواب مصطفٰے خان اور نواب ضیاء الدین خان کے ہاں بھجوائے۔ اور باقی کو ٹھنڈے پانی کی ناند میں رکھوا دیا۔ تیسرے پہر، گھر کے سب لوگ آم کھانے کے لیے جمع ہوگیے۔ سب نے خوب سیر ہوکر کھائے۔ میرزا صاحب نے جلد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا: حضرت، یہ کیا؟ کہنے لگے: سچ کہوں، نیت نہیں بھری مگر بھائی کیا کروں۔ معدے میں ہضم کی وہ پہلی سی طاقت نہیں رہی۔ ہائے کیا دن تھے! جوانی کے عالم میں کہ طبیعت میں جوش تھا اور صحت برقرار تھی۔ عصر کے قریب آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اتنے آم کھاتا تھا کہ پیٹ اپھر جاتا تھا۔ اور دم پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ اب آم کھانے کا کیا مزا۔ نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت۔ کھاؤں، تو ہضم کیسے کروں۔ جوانی کیا گئی کہ زندگی کا لطف جاتا رہا۔

ایک دن بڑا دلچسپ لطیفہ ہوا۔ جب ہم دونوں دیوان خانے میں جا کے بیٹھے، تو میں نے دیکھا کہ ان کے کمربند میں نو دس گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ میں حیران کہ الٰہی، یہ کیا ماجرا ہے۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ شاید رات، بے خبری کے عالم میں، انھوں نے یہ گرہیں لگائی ہوں، کیونکہ بعض لوگوں کو ایک قسم کی بیماری ہوتی ہے کہ وہ سوتے میں کوئی کام کرتے ہیں اور انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ لیکن مجھے مذاق کی سوجھی۔ میں نے ان سے کہا، قبلہ کیا رات کو تسبیح پھیرتے رہے ہیں؟ کہنے لگے: نہیں تو لیکن کاغذ قلم لو اور لکھتے جاؤ۔ میں نے حکم کی تعمیل کی اور انھوں نے کمربند

کی پہلی گرہ ٹٹولنی شروع کی۔ پھر فرمایا، لکھو مطلع:

اے ذوقِ نوا سنجی، بازم بخروش آور
غوغائے شبیخونے، بر بنگہ ہوش آور

اور اس کے بعد گرہ کھول دی۔ اس طرح انھوں نے مجھے پوری غزل لکھوائی۔ ہر ایک شعر کے بعد وہ ایک گرہ کھول دیتے۔ حتیٰ کہ نو کی نو گرہیں کھل گئیں اور غزل مکمّل ہو گئی۔ خیر غزل تو میں نے لکھ لی، لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی کہ یہ کیا طلسم ہے وہ بھی میری کیفیت کو بھانپ گئے۔ پہلے تو ہنستے اور میری بد حواسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ پھر بولے: بات اصل میں یہ ہے کہ رات جب بستر پر جاتا ہوں تو کبھی کبھی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہو جاتی ہے۔ اب تو ایک مدّت سے یہ شوق ہی چھوٹ گیا ہے، ورنہ ایک زمانہ تھا کہ میں دن میں شعر کہتا ہی نہیں تھا۔ عام طور پر رات کو سرخوشی کے عالم میں فکر کیا کرتا تھا۔ اب بھلا اس وقت کون اٹھ کر روشنی کا انتظام کرے اور لکھنے کا سامان ڈھونڈے۔ میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب شعر ہو جاتا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتا۔ اس طرح دس دس، بارہ بارہ گرہیں تک لگا کے سو رہتا۔ صبح کو اٹھتا اور ٹٹول ٹٹول کر حافظے سے نکال کے شعر قلمبند کر لیتا۔ اب تو مہینوں اور برسوں گزر جاتے ہیں، کوئی تازہ فکر ہوتی ہی نہیں۔ رات یونہی یہ زمین خیال میں آ گئی۔ طبیعت نے راہ دی اور میں نے غزل پوری کر لی۔ پرانی عادت کے مطابق کمر بند کا سہارا لیا۔ اگرچہ مجھے اندیشہ تو تھا کہ کہیں یہ نسیان کی نذر نہ ہو جائے، لیکن اور کر بھی کیا سکتا تھا! تاہم تم نے دیکھا کہ پورے نو کے نو شعر یاد آ گئے اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ جوانی کے دنوں میں کیا کیفیت تھی۔ اچھا اب قلم دوات اور کاغذ میری طرف بڑھاؤ۔ نواب انوار الدولہ بہادر اور منشی نبی بخش کو خط لکھوں اور یہ غزل ان کی خدمت میں تحفہ بھیجوں۔ آج ان دونوں صاحبوں سے زیادہ کوئی اور اس کلام کا مستحق نہیں۔

وائے بر جانِ سخن، گر بہ سخن داں نرسد!

خاص طور پر منشی نبی بخش کہ سخن فہمی اس بزرگوار کا حق ہے۔ سچ کہتا ہوں کہ جب تک میں نے انھیں نہیں دیکھا، مجھے ٹھیک طور پر یہ معلوم ہی نہیں ہوا کہ شعر گوئی اور شعر فہمی میں کتنا بعید فرق ہے۔ جب تک یہ غزل ان دونوں صاحبوں کے پاس نہیں پہنچ جاتی مجھے چین نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے خط لکھے اور لفافوں پر پتے لکھ کر رکھ دیئے۔ تھوڑی دیر میں کلّو آیا۔ اس نے خط لفافوں میں ڈالے، بند کر کے ٹکٹ لگایے اور ڈاکخانہ چلا گیا۔

شیخ ابراہیم ذوقؔ، نومبر ۱۸۵۴ء میں خدا کو پیارے ہوئے۔ حضرت ظلِ سبحانی ۴۶-۴۷ برس ان سے اصلاح لیتے رہے تھے۔ اتنی لمبی مدّت کی دوستی اور محبت۔ صدمہ ہونا ہی چاہیے۔ انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ لیکن نبھ نہ سکی۔ شاہی خاندان میں شعر و شاعری اور علم و ادب کا مذاق شروع سے تھا، لیکن اوّل اوّل یہ ذوق کچھ دبا دبا سا رہا۔ وہ لوگ تلوار کے بھی دھنی تھے، نری باتیں ہی بنانا نہیں جانتے تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، تلوار کو نیام میں زنگ لگنے لگا، اور اس کی جگہ قلم ہی قلم رہ گیا اور تلوار اٹھا کے طاق پر رکھ دی گئی۔ ظفر کی بھی یہی حالت تھی۔ شاعری تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ملک ہندوستان کی پادشاہی تو برائے نام رہ گئی تھی، لیکن ملکِ سخن کی تاجوری بیشک ان کے حصّے میں آئی۔ اتنے زمانے کا شوق، ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ دن خاموش رہ سکتے۔ چنانچہ انھوں نے پھر شعر گوئی شروع کر دی اور اب کے اصلاح کا فرض میرزا غالبؔ کے سپرد ہوا۔ میرزا صاحب کا دستور یہ تھا کہ قیلولے کے بعد عصر کے وقت، جہاں پناہ کی غزلیں بناتے تھے۔ ایک دن جب کام سے فارغ ہو چکے، تو میں نے کہا: قبلہ، میں نے آج تک حضرت ظل اللہ کو قریب سے نہیں دیکھا، دیکھنے کی بڑی متمنّا ہے۔ کہنے لگے، یہ کیا مشکل ہے۔ میں نے پوچھا، وہ کیسے ؟ فرمایا: آج کل روزانہ شام کو نور گڑھ کے پاس جمنا کی ریتی میں، پتنگ بازی ہوتی ہے۔ ایک طرف قلعۂ معلیٰ کے بادشاہی پتنگ باز ہوتے ہیں، دوسری طرف ناظر حسین مرزا کے ساتھی۔ آج جہاں پناہ نے حکم دیا تھا کہ تم بھی وہاں آیا کرو۔ اب کہو، حکمِ حاکم، جانا ہی پڑے گا۔ لیکن آج تو نہیں، البتہ کل سے جاؤں گا۔ تم بھی چلنا، میرے ساتھ ساتھ رہنا، اور جی بھر کے دیکھ لینا۔

اگلے دن سہ پہر کو میرزا صاحب سو کر اٹھے۔ منہ ہاتھ دھویا اور پالکی میں سوار ہو گئے۔ میں پیدل ساتھ ہو لیا۔ نور گڑھ کچھ دور تو تھا ہی نہیں، تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ گئے۔ دیکھا تو بلا مبالغہ سیکڑوں پتنگ باز جمع ہو رہے ہیں اور ہزاروں تماشائی لیے کھیلے وہاں ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ جہاں مجمع ہو، وہاں بھلا خوانچے، پھیری والے کیسے نہ پہنچیں اور پھر منگتوں کو کون روک سکتا ہے۔ خمرے اور خمریاں، چھوٹے چھوٹے بچوں کو انگلی سے لگائے، ہر آیندو روند سے بھیک مانگتے پھرتے تھے۔ غرض

کہ یہاں ایک نئی دنیا آباد ہو گئی تھی۔ قسم قسم اور رنگ برنگ کے پتنگ اور تکل آسمان میں ایسے معلوم ہوتے تھے، جیسے کوئی بہت بڑا رنگین اور پھولدار قالین ہواؤں میں اِدھر سے ادھر اڑ رہا ہو۔

اعلیٰ حضرت کو میں نے پہلی بار اتنی نزدیک سے دیکھا۔ لمبوترا چہرہ، پتلی ستواں ناک، چوڑی پیشانی، چھوٹی بھویں، نہایت تیز اور بڑی بڑی بھوری آنکھیں، چوڑا دہانہ، نیچے کا ہونٹ نسبتہً نمایاں اور اس پر پان کا لاکھا جما ہوا۔ کلّے صاف اور ٹھوڑی پر دوڈھائی انگل کی سفید براق ڈاڑھی شرعی خشخاشی لبیں قد میانہ اور سینہ چوڑا تھا۔ لیکن شانے تنگ اور ڈھلوان تھے۔ رنگ خاصا سانولا تھا۔ حال آنکہ سنِ مبارک اس وقت اسّی سے اوپر تھا، اس کے باوجود چہرے مہرے سے چستی کا اظہار ہوتا تھا۔ انھیں دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی زمانے میں کسرت کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ ان کی جوانی میں مشہور تھا کہ ہندستان بھر میں ڈھائی شہسوار ہیں۔ ایک یہ، ایک ان کے چھوٹے بھائی میرزا جہانگیر اور آدھے کوئی اور بزرگوار۔ لباس میں نیچے قبا تھی اور اس کے اوپر چار تب سر پر دستار اور دستار کے اوپر گوشوارہ، جیغہ، سرپیچ اور تاج شاہی۔ اس پر تین طرّے، گلے میں موتیوں کا کنٹھا اور ایک سوا ایک موتی کا مالا بازوؤں پر بھجبند اور نورتن۔ ہاتھ میں موتیوں کی سُمرن زرنگار چوکی پر آلتی پالتی مارے تشریف فرما تھے۔ اس وقار اور متانت کی مورت دیکھنے سے مجھ پر جو دہشت طاری ہوئی تھی، اب میں اس کا بیان نہیں کر سکتا۔

آگے پیچھے شہزادوں اور سلاطینوں اور امیروں وزیروں کا جمگھٹا تھا۔ چند سر برآوردہ حضرات بیٹھے تھے۔ باقی سب مرتبے سے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تھے۔ بعض شہزادے بھی پتنگ اڑا رہے تھے اور حضور والا سیر دیکھ رہے تھے۔ میرزا سلطان بھی انھی لوگوں میں تھے، جو پتنگ اڑا رہے تھے۔ اتنے میں ان کا پتنگ کسی سے پیچ لڑ گیا۔ وہ گھبرا کر کھینچ کرنے لگے۔ میرزا صاحب نے ان سے کہا: صاحب عالم! یہ موقعہ کھینچ کا نہیں بلکہ ڈھیل کا ہے۔ اس پر انھوں نے ڈھیل چلائی۔ جب دیکھا کہ ڈوبتے ڈوبتے پتنگ بہت دور نکل گئے ہیں، تو میرزا صاحب نے ان سے کہا کہ دو چار ٹھمکیاں دے کر دیکھیے تو کہ مخالف کا کیا ارادہ ہے۔ انھوں نے ایک آدھ ہی ٹھمکی دی ہو گی کہ دوسرا پتنگ چکرانے لگا۔ میرزا صاحب نے شہزادے سے کہا کہ اب اگر آپ پھرتی سے جھٹکا دیں تو مخالف سنبھل نہیں سکے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ انھوں نے ایک ہی جھٹکا دیا تھا کہ دوسرا پتنگ کٹ گیا۔

اعلیٰ حضرت اس پر بہت مسرور ہوئے۔ لطف سے فرمایا: اماں، میرزا صاحب! ہم نہیں جانتے تھے کہ آپ اس فن میں بھی طاق ہیں۔ یہ ادب سے بولے: پیر و مرشد خود ستائی ہوتی ہے۔ ورنہ کہوں کہ یہ خانہ زاد کیا نہیں جانتا! مجھے بھی کسی زمانے میں پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا، بلکہ میں نے نہایت ابتدائی زمانے میں پتنگ کے تلازمے سے مثنوی کے طور پر چند شعر بھی کہے تھے۔ حضور والا بولے: اچھا، اچھا، ہمیں بھی سنایئے تو میرزا غالب صاحب نے گزارش کی۔ عالم پناہ، جان کی امان پاؤں صرف چند شعر ہیں اور وہ بھی نہایت ابتدائی مشق، سننے سنانے کے لائق نہیں۔ حضور نے مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا کچھ پروا نہیں، ہم سنیں گے۔ اس پر میرزا صاحب کہنے لگے۔ الامر فوق الادب بنظرِ اصلاح ملاحظہ ہوں۔ پھر یہ چند شعر تحت اللفظ سنائے۔

ایک دن مثلِ پتنگ کاغذی	لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا	اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل، ہوائے دلبراں	بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں
پیچ میں ان کے نہ آنا زینہار	یہ نہیں ہیں گے، کسو کے یار غار
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر	کھینچ لیتے ہیں یہ، ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائیں گی تیری ان سے سانٹھ	لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سلجھانا تجھے	قہر ہے، دل ان سے الجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے	بھول مت اس پر، اڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب	غوطے میں جا کر دیا کٹ کر جواب
رشتۂ در گردنم افگندہ دوست	می برد، ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اعلیٰ حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ پتنگ کے لیے اس شعر کی تضمین بھی کسی کو نہیں سوجھی ہو گی۔ میرزا صاحب نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔ چونکہ دیر ہو چلی تھی اور شام کی ہوا میں خنکی ہوتی جا رہی تھی۔ اس لیے حضرت بادشاہ سلامت، واپسی کے لیے مغرب کے قریب تختِ رواں پر سوار ہو گئے اور سب کو واپس جانے کی اجازت دی۔ ہم بھی چراغ جلے مکان پر پہنچے۔ میرزا صاحب بہت تھک گئے

تھے۔ گھر پہنچتے ہی انھوں نے تین چار شامی کباب نوش فرمائے، شراب پی اور پڑ رہے۔
اس کے دو دن بعد میں آگرے چلا گیا۔

۴

اس کے دو برس کے بعد غدر کا ہنگامہ ہوا۔ کچھ معلوم نہ ہوا کہ دلّی اور دلّی کے احباب پر کیا گزری۔ جب فساد کی آگ فرو ہوگئی۔ تو والد صاحب قبلہ نے مجھ سے کہا کہ بیٹا، جاؤ اور میرزا صاحب کی خیر و عافیت کی خبر لے آؤ۔ چنانچہ میں دلّی آیا۔ یہ ۱۸۵۸ء کے شروع کا ذکر ہے۔ ابھی تک شہر میں پورا امن نہیں ہوا تھا۔ گرفتاریوں کا سلسلہ جاری تھا۔ آئے دن کسی نہ کسی ہندستانی امیر کی گرفتاری یا نظر بندی، ضبطی جائداد یا پھانسی کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ شہر میں باہر سے آنے جانے پر بھی پابندیاں تھیں اور باہر سے آنے والوں کو شہر کے فوجی حکام سے خاص ٹکٹ لینا پڑتا تھا میں نے بھی دو دن ٹھہرنے کا ٹکٹ لیا۔ سہ پہر کو دلی پہنچا اور سیدھا بلّیماران میں میرزا صاحب کے مکان پر چلا گیا۔ شام کو مرزا یوسف علی خاں عزیز اور منشی ہیرا سنگھ درد اور پنڈت شیو اجی لام آن پہنچے۔ مرزا یوسف علی خاں اپنے والد میرزا نجف علی خاں کی وفات کے بعد مستقل طور پر دلّی آ رہے تھے اور ان دنوں اسی محلّے میں میرزا صاحب کے مکان کے قریب ہی ایک ہندو امیر کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے۔ وہیں محلّے کے کچھ اور بچّے بھی ان سے تعلیم پاتے تھے۔ اس طرح گویا مکتب کا سا طور ہو گیا تھا منشی ہیرا سنگھ درد میرزا صاحب کے پرانے دوست اور مہربان، رائے بجھج مل کے چھوٹے بیٹے تھے۔ حوض قاضی کے پاس گندی گلی میں رہتے تھے۔ یہ اور ان کے بڑے بھائی منشی جواہر سنگھ جوہر (تحصیلدار) صاحب دونوں میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔

اسی زمانے میں آگرے سے میرزا حاتم علی مہر نے اپنی مثنوی، شعاعِ مہر، میرزا صاحب کی خدمت میں بھیجی تھی۔ عزیز اسے بلند آواز سے پڑھتے رہے اور ہم سب سنتے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ غرض رات گئے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔

اگلے دن شام کے قریب ہم دیوان خانے میں بیٹھے تھے کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک رجسٹری خط لایا۔ میرزا صاحب نے کھولا تو معلوم ہوا کہ میرزا تفتہ نے سو روپے کی ہنڈوی اپنے استاد کی خدمت میں بھیجی ہے۔ میرزا صاحب نے ہنڈوی صحیح کر کے کلیان کے حوالے کی اور اسے نیل کے کٹڑے میں کسی مہاجن

کے ہاں بھیجا۔ جانے آنے کی دیر ہوئی وہ جا کے روپیہ لے آیا۔ انھوں نے پچاس روپے اندر محل میں بھیج دیے۔ کلو داروغہ نے پچیس روپے کے لگ بھگ، دست گردان ادھار لیا تھا، وہ اسے دیے اور باقی رقم اپنے بکس میں رکھ لی۔ فرمانے لگے: رات تم نے دیکھا، منشی ہیرا سنگھ اور پنڈت شیواجی رام آئے ہوئے تھے۔ اب جب سے میرزا یوسف علی خاں یہاں آگیے ہیں، یہ بھی دن رات کا اکثر حصہ یہیں گزارتے ہیں، ورنہ صرف یہ دونوں صاحب باقاعدہ آتے رہتے ہیں کتنا کثیر الاحباب شخص تھا، کوئی وقت نہیں جاتا تھا جب دو چار دوست میرے پاس موجود نہ ہوں بلکہ اکثر میری غیر حاضری میں بھی دیوان خانہ خالی نہیں ہوتا تھا۔ یا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ اس ہنگامے میں اگر یہ دو تین صاحب بھی یہاں نہ ہوتے، تو میں گویا شہر میں نہیں، کسی ویرانے میں رہتا تھا۔ شہر میرے ملنے والوں سے خالی ہو گیا، نہ کوئی میرے پاس آنے والا یہاں موجود نہ، میں کسی کے پاس جا سکوں۔ زندہ ہوں، مگر زندگی دو بھر ہو گئی۔ نو دس مہینے سے پنشن بند ہے، کہو، یہ سارا زمانہ کیسے گزرا ہو گا۔ خدا جیتا رکھے، برخوردار تفتہ کو، اس نے یہ سو روپے بھیج کر جلا لیا ہے ابھی نہیں معلوم، اور کیا کچھ دیکھنا نصیبوں میں لکھا ہے۔ خیر یہ بھی جوں توں کٹ جائے گی۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب!

خدا سے کیا ستم و جورِ نا خدا کہیے

اس زمانے میں ان کی سرکاری پنشن بند تھی۔ قلعے کی تنخواہ تو بند ہونا ہی چاہیئے تھی۔ اس لیے بہت تنگی ترشی سے گزارا ہوتا تھا۔ حضرت والد صاحب قبلہ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ موقع دیکھ کے انھیں آگرے آنے کی دعوت دینا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بہتر موقع نہیں ملنے کا۔ اس لیے میں نے عرض کیا کہ ابھی یہاں کی حالت خطرے سے خالی نہیں۔ آپ چند دن کے لیے آگرے تشریف لے چلیے۔ وہاں خدا کے فضل سے آپ کا اپنا گھر ہے۔ عزیز و اقارب، دوست احباب موجود ہیں۔ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی۔ پھر جب امن و امان ہو گیا، تو واپس چلے آیئے۔ فرمانے لگے: یہ ٹھیک ہے کہ حالت یہاں کی تشویشناک ہے۔ لیکن مجھے اپنی بیگناہی ہی پر بھروسہ ہے۔ میں فراری یا روپوش نہیں۔ میرے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ کسی نے میری مخبری نہیں کی۔ انگریزی حکام میری شہر میں موجودگی سے واقف ہیں۔ اکتوبر سالِ گزشتہ کرنیل براؤن صاحب کے

سامنے حاضر ہوا تھا اور انھیں کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں۔ اس لیے اگر خطرے کی بات ہوتی تو اب تک معلوم ہو گیا ہوتا۔ بیشک قلعے کے ملازموں پر شدت ہے، لیکن خاص طور پر انہی لوگوں پر، جو اس ہنگامے کے دوران میں نئے نئے وابستہ ہوئے تھے۔ میں تو آٹھ دس برس سے تاریخ لکھنے پر مقرر تھا اور تین چار برس سے شعروں کی اصلاح کی خدمت بھی بجالاتا رہا یہ ٹھیک ہے کہ میں نے ان دنوں میں قلعے سے اپنے تعلقات بالکل قطع نہیں کر لیے۔ لیکن بھائی سوچو تو، یہ کر بھی کیسے سکتا تھا! اگر تلنگوں کو میرے بارے میں کسی قسم کا شبہہ بھی ہو جاتا، تو میری اور میرے اہل و عیال کی تکا بوٹی کر ڈالتے۔ اس لیے وہاں جاتا بھی رہا اور اصلاح کا کام بھی بدستور کرتا رہا۔ لیکن یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی، بلکہ خیال کرو تو یہ مزدوری تھی، پیٹ پالنے کے لیے اور حیلہ تھا جان بچانے کے لیے۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے انگریزی کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی، لیکن میرا مقدور ہی کیا تھا کہ میں کچھ کر سکتا۔ پس خاموش بیٹھا انتظار کر رہا ہوں دیکھیے، غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ نظر اپنی بیگناہی پر، خیال کرتا ہوں کہ اب شاید امن ہونے کے ساتھ ہی پنشن بحال ہو جائے۔ رہا یہاں سے کسی دوسری جگہ جانا، تو یہ کیسے ممکن ہو! اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ مجھے باز پرس اور دار و گیر کا خوف ہے اور میں قصور وار ہوں۔ اس صورت میں اگر پنشن کھلنے کا کوئی امکان ہے تو وہ بھی جاتا رہے گا۔ نا صاحب، اس وقت یہاں سے نکلنا مصلحت کے خلاف ہے۔ بھائی سے کہنا، گھبرائیں نہیں، وہ بھی ہمارے ہی بزرگ تھے جنھوں نے بھوکے پیاسے خدا کی راہ میں جان دے دی دن ہمیشہ ایک سے نہیں رہتے یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ اگر حالات موافق ہوئے تو میں پھر کسی وقت آگرے کا چکر لگاؤں گا۔

۵

۱۸۶۰ء میں والد مرحوم نے مجھ سے فرمایا کہ تمھاری تجارت کے لیے بہتر ہو گا کہ تم مستقل طور پر دلی میں سکونت اختیار کر لو۔ وہاں یوں بھی کاروبار زیادہ ہے، پھر اس پر بڑا شہر اور حکومت کا مرکز ہونے کے باعث وہاں ترقی کی زیادہ گنجایش ہے۔ میں نے بعض مقامی دوستوں سے مشورہ کیا۔ میرزا صاحب سے بھی خط کے ذریعے پوچھا۔ سب نے اس رائے پر صاد کیا۔ اس پر میں خدا کا نام لے کر ۱۸۶۱ء کے شروع میں یہاں دلی آگیا۔

میرزا صاحب نے حکیم محمد حسن خان والا مکان جولائی ۱۸۶۰ء میں چھوڑ دیا تھا اور اب اسی بلیماران میں ایک دوسرے مکان میں رہتے تھے یہ اگرچہ پہلے مکان سے وسیع تھا، لیکن اس میں تکلیف یہ تھی کہ محلسرائے اور دیوانخانہ ایک جگہ نہیں تھے، زنانہ حصّہ ایک جگہ تھا، اور مردانہ اس سے کچھ فاصلے پر تھا، اگرچہ تھا اسی گلی میں۔ یہ مکان وہ ہے جو بلیماران سے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے الٹے ہاتھ کو پڑتا ہے۔ اس کے برابر نکڑ پر ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ اسی مکان سے متعلق میرزا صاحب نے کہا تھا۔

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے

اک بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

میں نے پوچھا: قبلہ، وہ پہلا مکان کیوں چھوڑ دیا۔ اچھا خاصا آرام دِہ مکان تھا۔ فرمانے لگے۔ اس میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ بہت تنگ تھا۔ بھائی، سچ ماننا، میرا اس میں دم گھٹتا تھا۔ لیکن چونکہ کوئی اور ڈھنگ کا مکان ملتا نہیں تھا، اس لیے آٹھ برس تک اس میں پڑا رہا۔ مئی ۱۸۵۷ء تک جب فساد شروع ہوا ہے، برابر چار روپے مہینا اس کا کرایہ دیتا رہا۔ جب فساد ہوا، تو حالات سے مجبور ہو کر میں کرایہ نہ دے سکا۔ تین برس تک پنشن بند رہی کھانے کو روٹی اور پینے کو شراب تک میسّر نہیں تھی، چار روپے مہینا کرایہ کہاں سے دیتا نتیجہ یہ ہوا کہ تین برس کا کرایہ، کم و بیش ڈیڑھ سو روپیہ چڑھ گیا۔ بارے خدا خدا کر کے مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن جاری ہوئی اور پچھلا بقایا بھی وصول ہوا تو میں نے تین سال کا کرایہ یکمشت ادا کر دیا لیکن اب ایک اور مصیبت پیش آئی۔ اگلے ہی مہینے جون کے آخر میں مالک مکان نے اسے حکیم غلام اللہ خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے مکان خالی کر دینے کو کہا، وہ اس میں ردّو بدل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس کے بعض حصّوں کو نئے سرے سے بنوانا چاہتے تھے، تم نے اسے دیکھا ہی ہے، تھا بھی بہت پرانا۔ بڑی مشکل سے یہ جگہ ملی۔ اگرچہ اس میں محلسرا اور دیوانخانہ الگ الگ ہونے کی تکلیف تو ہے، لیکن اس سے کہیں کھلا ہے۔ بہر حال اب پایانِ عمر ان باتوں کی شکایت کیا۔ اب باقی ہی کتنی رہ گئی ہے کہ ان باتوں کی فکر ہو۔ آہ۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب!
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس زمانے میں روزانہ عصر کے وقت ان کے عزیزوں میں سے بعض لڑکے ان کے دیوانخانے میں جمع ہو کر فارسی پڑھتے تھے۔ باقر علی خان اور حسین علی خان تو گھر ہی پر تھے۔ ان کے علاوہ نواب ضیاء الدین احمد خان کے چھوٹے صاحبزادے سعید الدین احمد خان اور عارف کے بھتیجے (یعنی میرزا حیدر حسن خان کے چھوٹے بیٹے) محمد حسن خان (عرف خضر میرزا) زیادہ حاضر باش تھے۔ کبھی کبھی میرزا علی بخش خان کے صاحبزادے غلام فخرالدین بھی آنکلتے تھے۔ پڑھانے والے معلّم کا بھلا سا نام تھا مجھے ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا۔ میرزا صاحب پاس بیٹھے سنتے رہتے۔ کبھی کبھی خود بھی تشریح و توضیح کرنے لگتے۔ ساتھ ساتھ لطیفے بھی ہوتے جاتے۔ چلتے وقت بچّوں کو مٹھائی یا کوئی اور چیز کھانے کو ضرور دیتے۔ یوں بچّوں کی نگرانی کے ساتھ ان کی گھڑی بھر کی تفریح ہوجاتی مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سب بچے "گلستاں کا سبق لیتے تھے۔ جب میرزا تفتہ کی مثنوی "سنبلستان" چھپ کر آئی تو میرزا صاحب نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو تفتہ کے بھیجے ہوئے دونوں نسخے دے دیئے۔ اور معلّم کو ہدایت کی کہ آیندہ انھیں یہ کتاب پڑھائی جائے۔

باقر علی خان بہت متین اور خاموش طبع تھا۔ اس کے بر خلاف حسین علی خاں حد درجہ شوخ اور کھلنڈرا۔ پڑھنے کے نام سے بھاگتا تھا۔ میرزا صاحب بلاتے 'ارے حسین علی، سبق پڑھ لیا وہ ایک دفعہ تو کہتا، آیا، دادا جان۔ اور پھر غائب غلّہ، کسی طرف کھسک جاتا۔ کھیل کود کا اسے لپکا تھا۔ زبان کا بھی چٹورا تھا۔ میرزا صاحب کہتے تھے۔ لڑکے بادشاہ ہیں، جب اپنے سر پر پڑے گی۔ تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔

۱۸۶۳ء کے برس انھوں نے بڑی مصیبت دیکھی۔ انھیں تھوڑی بہت چوک دھانس تو ہمیشہ ہی رہتی تھی۔ اور کچھ نہ ہوا تو سلسل بول اور قبض کے دونوں مرض تو موجود ہی تھے کہ جان کے ساتھ لگے تھے۔ لیکن اس سال مزید یہ ہوا کہ جنوری کے مہینے میں ان کو پھوڑوں کی تکلیف شروع ہوئی۔ اول ایک معمولی سی پھنسی دہنے ہاتھ پر نکلی۔ ان کی بے احتیاطی سے یہ بڑھ کر پھوڑا بن گئی۔ اس کے بعد بائیں پاؤں میں ورم ہوا اور ساتھ ہی پاؤں اور ایڑی سے ہوتا ہوا پنڈلی تک آماس

ہو گیا۔ پھر دوسرا ہاتھ اور پاؤں پکڑے گیے۔ اور آخر میں جسم کا یہ حال ہو گیا جیسے سرو چراغاں ہو۔ سارے بدن پر چھوٹے بڑے درجن بھر پھوڑے اور ہر ایک پھوڑا اچھا خاصا گہرا۔ حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خان دونوں صاحبوں نے تشخیص کی کہ احتراقِ خون کا شدید حملہ ہوا ہے، جو عمر بھر کی شراب نوشی اور بے اعتدالیوں کا نتیجہ ہے۔ آخر باہمی مشورے سے یہ ٹھہری کہ سب سے پہلے پاؤں کے پھوڑے کو پکا کر گندا مادہ خارج کیا جائے تاکہ اس کا زہر کہیں سارے جسم میں سرایت نہ کر جائے۔ چنانچہ دو تین دن نیم کے پتوں کا بھرتا بندھتا رہا جب ورم پک گیا اور اس کا منہ بن گیا، تو نشتر سے سوراخ دے کر گندہ مادہ نکالا گیا۔ حکیم صاحب نے پھوڑوں پر لگانے کے لیے ایک مرہم کا نسخہ لکھ دیا۔

ان کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی تھی۔ حکیم محمود خاں ہی کا آدمی روزانہ صبح کے وقت آتا، وہ زخموں کو صاف کر کے مرہم لگاتا اور پھایے رکھ کر باندھ دیتا تھا۔ جب وہ سلائی سے زخم صاف کرتا اور پیپ نکالتا تو ہم دیکھنے والے کانپ کانپ اٹھتے تھے، لیکن آفرین ہے ان پر، ماتھے پر بل تک نہیں لاتے تھے۔ اور یہ تکلیف چند دن یا چند ہفتے نہیں، بلکہ مسلسل کئی مہینے تک رہی۔ وہ روزانہ نہایت اطمینان اور تحمل سے مرہم پٹی کرواتے رہے، بلکہ اس دیکھنے والوں کو حوصلہ دیتے رہے۔

ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا محال تھا۔ چنانچہ دن رات بستر پر پڑے رہتے بھوک پیاس بالکل زائل ہو گئی تھی، کھانا گھر سے آتا، تو وہ لیٹے لیٹے ہاتھ دھو کر، دو چار لقمے حلق سے اتار لیتے۔ رات کو نیند بھی کم آتی تھی، بلکہ اسے نیند کہنا ہی نہیں چاہیے، ایک غفلت کی سی کیفیت ہوتی تھی۔ اگر کہیں خوش قسمت سے پل بھر کے لیے آنکھ لگ گئی، تو کسی پھوڑے میں ٹیس اٹھتی اور وہ بلبلا کے جاگ اٹھتے۔ اسی طرح سوتے جاگتے رات گزر جاتی۔ اٹھ نہیں سکتے تھے۔ کھڑے ہونے سے پنڈلیاں لرزنے لگتی تھیں۔ وہیں پلنگ کے پاس اوٹ میں حاجتی دھری تھی۔ ضرورت ہوئی، تو کھسک پڑے اور اسی طرح کھسکتے کھسکتے واپس پلنگ پر آ کر پڑ گئے۔ مصیبت بالائے مصیبت، اسی دوران میں انھیں فتق کی شکایت بھی ہو گئی۔

اس تکلیف کے باوجود اس زمانے میں بھی، احباب کی فرمائشیں بدستور جاری تھیں۔ شاگرد اصلاح کے لیے کلام بھیجتے۔ دوست اور ملنے والے شوقیہ خطوط لکھتے۔ وہ کسی کی دل شکنی نہ کرتے سب کو لیٹے لیٹے جواب لکھتے۔ ایک دن فرمانے لگے۔ حیران ہوں، لوگ مجھے ابھی تک زندہ سمجھتے ہیں،

حالانکہ میں مردے سے بدتر ہوں۔ بہرحال یہ دونوں باتیں آدھی سچ ہیں اور آدھی جھوٹ۔ موت کی صورت میں نیم مردہ ہوں' اور زندگی کی حالت میں نیم زندہ ہوں۔

آہ جی جاؤں' نکل جائے اگر جان کہیں

نومبر کے آخر میں تندرستی اتنی عود کر آئی تھی کہ مرہم پٹی موقوف ہوگئی تھی۔ لیکن اس لمبی بیماری کا یہ نشان رہ گیا کہ دونوں پاؤں کی دو دو انگلیاں مستقل طور پر اینٹھ کے موٹی اور ٹیڑھی ہوکر رہ گئیں۔ جوتا پہننے میں تکلیف ہوتی تھی' اور زیادہ چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ کمزوری کا تو ذکر ہی کیا! خود کہتے تھے کہ جسم میں جتنا خون تھا وہ پیپ بن کر نکل گیا۔ اب تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے' وہ کھا کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی اسے کھاتا ہوں' کبھی پیتا ہوں۔

میں ۱۸۶۴ء کے نوروز کے دن سہ پہر کے وقت مزاج پرسی کو گیا۔ اندر صحن میں ایک دالان تھا، جہاں شام تک دھوپ رہتی تھی۔ یہیں پلنگ پر لیٹے تھے۔ اب جاڑوں کی موسم میں ان کا یہ عام معمول ہوگیا تھا کہ کھانا کھا کے دھوپ میں لیٹ جاتے اور جب تک ہوا میں خنکی نہ محسوس ہونے لگتی' وہیں پڑے رہتے۔ میں آداب عرض کرکے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

معلوم ہوا کہ ان کے برادر نسبتی میرزا علی بخش خان فوت ہوگئے ہیں۔ وہ کتنے برس سے سلطان جی کے قریب کی بستی عرب سرائے میں رہتے تھے۔ مدت سے صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ وہیں پچھلی رات کو فجر کی نماز سے تھوڑی دیر پہلے جنت سدھارے۔ فرمانے لگے: مرحوم میرا بہت ہمدرد اور دلی یار تھا۔ مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں چلنے پھرنے سے معذور ہوں ورنہ جنازے کے ساتھ جاتا۔ بھائی ضیاءالدین خان گیے ہیں۔ کفن دفن کا سارا انتظام وہی کرینگے۔

اسی سلسلے میں ایک اور بات یاد آگئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب علاءالدین احمد خاں اور میرزا علی بخش خاں میں آپس میں کچھ کشیدگی تھی۔ اگرچہ نواب صاحب نے مرحوم کی وفات پر دو تین تاریخ کے مادے نکالے تھے' لیکن نہ خود انھیں نظم میں لکھا، نہ کسی دوسرے ہی کو یہ کام کرنے کی اجازت دی۔ بلکہ انھوں نے کسی مجلس میں مرحوم کے خلاف بعض ایسے کلمات کہے' جن سے ان کی دلی رنجش کا اظہار ہوتا تھا۔ اس پر میرزا صاحب نے انھیں لکھا کہ میت کو نیکی سے یاد کرنا چاہیے اب تمھارا اپنی ناراضی کا اظہار کرنا نامناسب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دوسرے عزیزوں کے

دل ملول ہوں گے۔ بتاؤ! اس سے بھلا تمھیں کیا حاصل ہوگا! پس اب خاموشی بہتر ہے۔

اسی سال (۱۸۶۴ء) عارف کے بڑے صاحبزادے باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خان کی اکلوتی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف مگاّ بیگم سے ہوئی۔ دولھا ۱۶ برس کے تھے اور دلھن ۱۲/۱۳ برس کی۔ دونوں میرزا کے ہاتھوں میں پلے تھے اور انھیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھے۔ ایک دن کا لطیفہ مجھے آج تک یاد ہے۔

میں اس دن صبح سویرے کسی کام سے میرزا صاحب کے پاس گیا تھا وہاں باتوں میں دیر ہوگئی۔ اتنے میں گھر سے عنایت اللہ ملازم نے آکے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکالا جائے۔ میرزا صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آؤ کھانا یہیں ہمارے ساتھ کھالو، کہاں اتنی دور جاؤ گے میں ان کی محبت کے پیشِ نظر انکار نہ کرسکا۔ چنانچہ انھوں نے عنایت سے کہا کہ بیگم صاحب سے کہو کہ کھانا نکلوائیں، ہم دونوں آرہے ہیں۔ اِدھر ملازم گیا، اُدھر ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ حد درجہ کمزور ہوگیے تھے۔ لکڑی کے سہارے بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے۔ حالانکہ محلسرا دور نہ تھی، پچاس قدم کا فاصلہ نہیں ہوگا، لیکن وہاں تک پہنچتے پہنچتے ان کی سانس پھول گئی۔ بہرحال، جب تھوڑا آرام کرلیا، تو دسترخوان پر بیٹھے۔ نوکر نے ان کے سامنے شوربے کا پیالہ رکھا۔ میں نے دیکھا کہ خلافِ معمول کسی چیز میں بھی چنے کی دال نہیں۔ میرزا صاحب کو بھی اس پر بہت تعجب ہوا۔ پوچھا، کیوں بھئی، دال گھر میں نہیں تھی، تو بازار سے منگوا لی ہوتی، یا مجھ سے کہا ہوتا، میں منگوا دیتا۔ بیگم صاحبہ دوسرے دالان میں بیٹھی تھیں، وہیں سے جواب دیا۔ نہیں، دال تو گھر میں موجود ہے لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتی، اس لیے کسی چیز میں نہیں ڈالی۔ خدا دے ایسا موقع میرزا صاحب کو۔ جھٹ سے بولے۔ واہ، پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئی۔ ارے، چنا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خود اللہ میاں کی رال ٹپک پڑی تھی۔ اب بہو چنے کی دال نہیں کھاتیں، تو یہ گویا خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ سب ہنسنے لگے۔ بیگم صاحب خفگی سے بولیں۔ بس انھیں تو باتیں بنانا آتی ہیں۔ بچاری بچی ہے۔ ہوا کیا، اگر وہ ایک چیز پسند نہیں کرتی، تو اس کی مرضی۔ ٹھیکہ تھوڑی ہے کہ جی چاہے نہ چاہے ضرور کھایئے۔

زندگی کے آخری تین چار برس میں اس کی تندرستی بہت خراب ہوگئی تھی۔ دن دن بھر

پڑے رہتے تھے۔ کوئی تکلف کا ملنے والا آجاتا تو کر بیٹھ جاتے، ورنہ سارا وقت چارپائی پر لیٹے رہتے۔ گرمیوں میں دن بھر کوٹھری میں گزر جاتا، رات کو دو آدمی اٹھا کر صحن میں لے آتے جاڑوں میں دن کے وقت دھوپ میں لیٹے رہتے۔ رات کو سونے کا کمرہ انگیٹھی سے خوب گرم کروا لیتے تھے۔ خوراک نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ صبح کی تبرید بدستور تھی۔ دوپہر کو صرف ایک پیالہ بھر گوشت کا پانی۔ بوٹی، روٹی، چاول، سب کچھ بالکل مفقود۔ سرِ شام تولہ دو تولہ بھر شراب اسی قدر گلاب میں ملا کر پیتے تھے اور بس دوستوں کے خط آتے تھے۔ ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں دن کٹ جاتا۔ خود زیادہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ لکھتے تو انگلیاں اکڑ جاتیں، اور درد کرنے لگتیں کوئی دوست ملاقاتی آجاتا، تو اس سے خطوط کے جواب لکھوا لیتے تھے۔ آپ بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتا جاتا تھا۔

جاننے والے جانتے تھے کہ اب یہ چراغِ سحری ہیں۔ ۱۴/فروری ۱۸۶۹ء کو وہ حسبِ معمول لیٹے ہوئے تھے۔ اگرچہ کوئی خاص تکلیف نہیں تھی، لیکن ایک نیم غشی کی کیفیت ضرور تھی۔ ہوش میں آئے تو کلّو نے پوچھا کہ حضور کھانا لاؤں۔ بولے، آج ہم کھانا میرزا جیون بیگ کے ساتھ کھائیں گے۔ جاؤ، اسے بلا لاؤ۔ (اس سے اشارہ باقر علی خان کامل کی سب سے بڑی صاحبزادی محمد سلطان کی طرف تھا۔ انھیں میرزا پیار سے مرزا جیون بیگ یا جبینا بیگم کہا کرتے تھے۔ وہ اس وقت چار برس کی تھی) کلّو انھیں بلانے محل سرائے میں گیا۔ وہ سو رہی تھیں۔ بگا بیگم، ان کی والدہ نے کہا: ابھی کھیلتے کھیلتے سو گئی ہے۔ جو نہی جاگتی ہے، بھیجتی ہوں۔ کلّو نے آ کے کہا کہ حضور، وہ آرام کر رہی ہے۔ بیگم صاحبہ جگنے پر بھیج دیں گی۔ یہ سن کر بولے، اچھا، تو جب وہ آئے گی ہم اسی وقت کھانا کھائیں گے۔ اتنا کہہ کر تکیے پر سر رکھا اور لیٹ گئے۔ لیٹنے کے ساتھ ہی بیہوش ہو گیے۔ فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع کی گئی۔ دونوں صاحبوں نے رائے دی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ یہ خبر سارے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ جس جس نے سنا، دوڑا آیا۔ عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندہ گیا۔ آٹھ پہر اسی بیہوشی میں گزرے، نہ کی پیش گئی، نہ کسی اور کی۔ نہ دوا کارگر ہوئی، نہ دعا اور ہوتی بھی کیسے؟ ان کا وقت آن لگا تھا۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵/فروری کو دوپہر ڈھلے جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔

حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا

سائل دہلوی

نواب سراج الدین احمد خاں سائل ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو شنبہ کے دن اللہ کو پیارے ہوئے تھے۔ چونکہ سالِ ولادت ۱۸۶۷ء تھا، اس طرح عمرِ عزیز ۸۷ برس کی ہوئی۔ اللہ کریم انھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے! مرحوم مجھ پر بہت مہربانی فرماتے تھے۔ بہت دن سے خیال کر رہا تھا کہ اپنے تاثرات قلم بند کر دوں، لیکن ہائے مکروہات۔

تجھ کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

میں تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین برس تک روزگار کے لیے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ لیکن اسے میری نالائقی سمجھیے، یا بد قسمتی کہ کسی جگہ قدم نہ جم سکے۔ ان ایام میں یہاں دلّی میں میرے ایک مہربان تھے جنھیں اس بات کی فکر تھی کہ کسی جگہ میرے لیے مستقل ٹھکانا ہو جایے۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء کی گرمیوں میں مجھے لکھا کہ تم یہاں آجاؤ، تو شاید ریڈیو کے محکمے میں تمھارا انتظام ہو جائے۔ چنانچہ اس بلاوے پر میں یہاں آگیا۔ یہ دلّی میں میری پہلی آمد تھی۔ میں اس سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ اپنے رجحانات کے باعث، مجھے اس عروس البلاد سے جو دلچسپی ہو سکتی تھی، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں پہنچ کے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔

اس زمانے میں یہاں میرے ایک ہم وطن دوست جگت سنگھ رہتے تھے۔ ساتھ کے کھیلے ہوئے،

ساتھ کے پڑھے ہوئے، یوں سمجھیے' دانت کاٹی روٹی والا معاملہ تھا۔ وہ آج کی طرح جب بھی ایک اسکول
میں مدرّس تھے۔ میں انہی کے ہاں اترا۔ دو تین دن بعد ایک صبح وہ مجھ سے کہنے لگے۔ تمھیں اُردو لکھنے
پڑھنے کا شوق ہے، کسی دن فرصت ملے' تو لال کنواں میں ایک بوڑھے نواب صاحب رہتے ہیں
سراج الدین خاں نام ہے۔ ان سے جا کر ضرور ملو۔ میں نے پوچھا، کون نواب سراج الدین احمد خاں! وہی تو
نہیں، جو سائل تخلص کرتے ہیں؟ کہا، ہاں، وہی' دیوانہ را ہوئے بس است! اگلے دن اتوار تھا میں۔
ناشتے کے بعد لال کنویں کی راہ لی:

بوقت صبح چو مردم بکار و بار روند
بلاکشان محبت بکوئے یار روند

جگت سنگھ کو سائل صاحب کے مکان کا ٹھیک علم نہیں تھا۔ وہ بس اتنا ہی جانتے تھے کہ
کہیں لال کنویں کے محلّے میں رہتے ہیں۔ البتہ مجھے معلوم تھا، کہ ان کا لوہارو خاندان سے تعلق ہے۔
اس لیے میرے دل میں اطمینان تھا کہ ایسی معروف ہستی کا مکان تلاش کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں
آسکتی۔ چنانچہ میں پوچھتا پاچھتا گلی قاسم جان میں جا پہنچا، جہاں اس خاندان کے مکانات تھے، یہاں
میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ میں نواب میرزا سراج الدین احمد خاں کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ میں اس
وقت نواب ضمیر الدین احمد خان عرف ضمیر مرزا (خلف نواب علاء الدین احمد خان علائی) کے مکان کے سامنے
تھا۔ اس شخص نے جواب دیا کہ یہاں سے دریافت فرمایے۔ میں نے مڑکر دیکھا تو میرے سامنے ضمیر مرزا
کا ملازم کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سوال اس سے دہرایا، اس نے کہا، جناب وہ اس گلی میں نہیں رہتے۔ ان کا
مکان لال دروازے میں ہے۔ مجھے شبہہ ہوا کہ شاید اسے نام سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ اس لیے میں
نے دوبارہ تاکید سے کہا کہ میں نواب سراج الدین احمد خاں صاحب کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ جی ہاں' میں
سمجھ گیا، وہی نا، جو شاعر ہیں اور جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ وہ لال دروازے میں رہتے ہیں آیئے
میں آپ کو پہنچائے آتا ہوں۔" چنانچہ ہم دونوں گلی قاسم جان سے نکل کے لال کنویں میں آگئے۔ لال دروازہ
کچھ دور تو ہے نہیں، یہی چند قدم کا فاصلہ ہے۔ اس کے اندر تھوڑی دور چل کے سیدھے ہاتھ پر ایک اونچی
کرسی کے مکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ لیجیے حضور، یہ ہے نواب صاحب کا مکان' اس کے بعد اس نے ملازم
کو آواز دی۔ اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔' آپ نواب صاحب سے ملنا چاہتے ہیں اور

مجھے اس کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔

میں ملازم کے پیچھے سیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی یقیناً ملازم کے لیے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رُخ پر ایک دروازہ تھا، جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا: مکان لاڈلی بیگم۔ اسے دیکھ کر مجھے معاً "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" والا لطیفہ یاد آ گیا۔

الٹے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لیے دو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھا کے خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا، اس کے اوپر نصف کمرے میں لگ بھگ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے گاؤ تکیے لگے رکھے تھے۔ نشست کے قریب چاندی کا پاندان، پیچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سگرٹ کی راکھ جھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں۔ اور جہاں چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی۔ میں یہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستر برس کا سن، کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیف سا خم۔ میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، لمبوترا کتابی چہرہ کشادہ پیشانی، اونچی کاٹھی کی لمبی عقابی قسم کی نوکدار ناک، گلّے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی۔ سڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید داڑھی، جو یک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے شرعی لبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی، لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں۔ سر پر ہلکی سی پلے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے کھچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج پٹی گریبان اور کھلی آستینوں کا ململ کا کرتہ، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا آڑا پاجامہ۔ پاؤں میں خوردنوک کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں سگرٹ کا بکس اور دیا سلائی کی ڈبیا۔

یہ تھے نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب بن نواب ضیاء الدین خان بہادر نیر رخشاں بن فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر (والی فیروز پور جھرکہ و لوہارو) بن مرزا عارف جان بخارائی۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہا ہے:

سائل کو تم نہ چشمِ حقارت سے دیکھنا
نواب پانچ پشت سے اس کا خطاب ہے

میں اٹھ کے آداب بجا لایا۔ بہت لطف سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ پہلے مجھے بٹھایا، پھر خود دوسری کرسی پر تشریف فرما ہوئے۔ نام پوچھا، مقام پوچھا۔ تعلیم اور روزگار کا حال پوچھا۔ چونکہ خود شاعر تھے۔ خیال کیا ہوگا کہ جو ملنے کے لیے آیا ہے، تو ضرور شعر بھی کہتا ہوگا۔ پوچھنے پر میں نے عرض کی کہ عمر بھر شعر کہنے کا اتفاق نہیں ہوا، تو پہلے کچھ تعجب کا اظہار کیا۔ پھر فرمایا۔ لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ یہ ہے بیکاری کا مشغلہ، ہم جس کمرے میں بیٹھے تھے، یہ گلی کے رخ پر تھا اور یہاں کی تینوں کھڑکیاں کھلی تھیں۔ نیچے گلی میں ایک ٹھٹھیرا برتنوں کی مرمّت کر رہا تھا۔ قدرتاً شور ہونا ہی چاہیے۔ اس متواتر بے ہنگم آواز سے میں بہت پریشان تھا، یہاں تک کہ بعض اوقات ہمیں ایک دوسرے کی بات سننے میں بھی تکلف ہوتا تھا۔ لیکن کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ سائل صاحب بھی اس کھٹا کھٹ سے منغض ہوئے گھبرا کے آواز دی: ارے کوئی ہے؟ دروازے پر سے ملازم نے جواب دیا۔ حضور حاضر ہوں۔ میاں جاؤ، اس نیک بخت سے کہو، کہ یہ شور بند کرے اور اگر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، تو اس سے کہہ دو کہ یہ محلّہ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ یہ کیا مصیبت نازل ہو گئی ہے! ملازم نے جا کے سمجھا دیا ہوگا۔ بہرحال آواز بند ہو گئی اور ہم اطمینان سے بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی فرمایا: جب طبیعت چاہے، چلے آؤ، امیں دوپہر تک بالعموم مکان ہی پر رہتا ہوں، سرِ شام کبھی کبھی گھومنے نکلتا ہوں۔ یہ تھی جناب سائل صاحب سے میری پہلی ملاقات۔

اتفاق سے میری ریڈیو سے بھی نہ نبھ سکی۔ اس زمانے میں جو حضرات اس محکمے کے کرتا دھرتا تھے، میں انھیں خوش نہ کر سکا۔ چنانچہ مہینا بھر یہاں رہ کے واپس لاہور چلا گیا۔

اگلے برس مجھے پھر انہی مہربان کے ذریعے ایک اور دفتر میں جگہ مل گئی۔ میں شملے گیا اور عارضی طور پر ملازم ہو گیا۔ مشاہرہ قلیل تھا۔ لیکن کام بھی کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔ حکومت کے دفاتر کے ساتھ

یہ لوگ بھی گرمیوں میں شملے اور سردیوں میں دلی آتے جاتے رہتے تھے۔ چنانچہ جب ستمبر میں دفتر دلی آئے، تو میں بھی یہاں پہنچ گیا، یہاں آنے کے بعد میں پہلی فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور ۱۹۳۶۔۱۹۳۷ء کے دونوں جاڑوں میں متواتر ان کے ہاں آتا جاتا رہا۔ دراصل یہی وہ زمانہ ہے، جب مجھے انھیں بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔

اب تفصیل میں کیا جاؤں کہ کیسے کیسے ہمارے تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی گئی۔ بہر حال نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ حکم ہوا کہ جب تک دلی میں رہو، یوں جب جی چاہے، یا ضرورت ہو آسکتے ہو، لیکن اتوار کے دن کہ تمھیں دفتر سے چھٹی ہوتی ہے، لازماً صبح کا ناشتہ میرے ساتھ کرو۔ میں نے اقرار کرلیا۔ جو لوگ دلی کی سردیوں کو جانتے ہیں، انھیں خوب معلوم ہے کہ مجھے اس وعدے کے ایفا میں کیا کیا مشکل پیش آئی ہو گی۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ آندھی ہو یا طوفان بارش ہو کہ کڑکڑاتی سردی، میں تعمیل حکم میں ان دونوں جاڑوں میں بلا ناغہ ہر اتوار کو حاضر ہوتا رہا اور اس دن عام طور پر دوپہر تک ان کے ساتھ رہتا۔

کھانے پینے میں مزاج بہت نفاست پسند تھا۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کرتے کہ سالن ترکاری ہاتھ سے نہ کھائیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ چکناہٹ یا سالن کی زردی انگلیوں پر رہ جائے۔ اس لیے بے دریغ چمچے اور کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ انھیں دہی کا پنیر بہت پسند تھا۔ یعنی دہی، پتلے ململ کے ٹکڑے میں ڈال کر لٹکا دیا جاتا تھا۔ جب تمام پانی رس کے نکل جاتا، تو بقیہ پنیر دو پتھروں یا کسی اور بھاری اور سخت چیز کے درمیان رکھ کے ہموار کر لیتے۔ پھر جیسے چاہتے اس کے تکونے، لمبوترے، چوکور ٹکڑے کاٹ لیتے۔ ناشتے میں یہ پنیر ضرور ہوتا تھا اور وہ اسے ہمیشہ کانٹے سے کھاتے تھے۔

کھانے میں مچھلی بہت پسند تھی، لیکن کانٹے سے بہت ڈرتے تھے۔ اخیر عمر میں بینائی میں بھی فرق آگیا تھا چھوٹا کانٹا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے عام طور پر بیگم صاحب ان کے لیے علیحدہ پہلے سے کانٹا نکال کے دسترخوان پر رکھ دیا کرتی تھیں۔ خوراک بہت کم تھی۔

ایک دن ناشتے پر فرمایا، خوب پیٹ بھر کر کھالو، ممکن ہے کہ ہم لوگوں کو دوپہر کا کھانا نہ ملے۔ آج ہمیں سیر کے لیے باہر جانا ہے۔ اب میرا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب وہ مجھ سے کچھ کرنے کو کہتے، تو میں

کوئی حیل حجت نہیں کرتا تھا۔ وہ میری عادتوں سے خوب واقف تھے اور انھیں معلوم تھا کہ مجھے کونسی چیز پسند ہے اور کونسی ناپسند۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے کوئی ایسا کام کرنے کو نہیں کہیں گے، جو میرے خلافِ طبع ہو۔ اس دن بھی یہی ہوا۔ میں نے نہیں پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے۔ صرف اتنا کہہ دیا کہ، بہت اچھا۔ انھوں نے کسی دوست سے گاڑی مانگ رکھی تھی۔ ملازم کو حکم ہوا کہ گاڑی لے آؤ۔ ہم نیچے اترے اور نئی دلّی کے راستے حضرت نظام الدینؒ کے مزار پر پہونچ گیے۔

نواب سائل مرحوم کے خاندان کو بزرگانِ دین سے بہت عقیدت رہی ہے، بلکہ خود ان کے اجداد میں بھی اولیا اللہ کی کمی نہیں۔ قریبی زمانے میں بھی ان کے پر دادا نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خان جتنے شاعری میں معروف ہیں، تصوّف اور اہل باطن کے حلقوں میں اس سے شاید ہی کچھ کم مشہور ہوں، وہ حضرت مولانا فخرالدینؒ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ خود نواب احمد بخش خان اگرچہ شروع میں کچھ باغی سے رہے، لیکن اخیر میں اپنے چھوٹے بھائی کے ذریعے سے انھوں نے بھی مولانا فخرالدینؒ سے بیعت کر لی تھی۔ یہ اسی ارادت اور خوش عقیدگی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کا نام حضرت خواجہ ضیاءالدینؒ اجمیری کے نام کی رعایت سے غلام ضیاءالدین رکھا۔ جو آسمانِ علم و ادب پر ضیاءالدین احمد خان نیرّ رخشاں بن کر چمکا۔ سائل صاحب بھی حضرت مولانا شاہ دلدار علی بدایونی کے ہاتھ پر بیعت تھے یہ بزرگوار شاعر بھی تھے، مذاق تخلص تھا اور اس فن میں ذوقؔ کے شاگرد تھے۔ دیوان مطبوعہ موجود ہے۔

میرا سلطان جی میں یہ پہلا پھیرا تھا۔ سب سے پہلے ہم نے حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار مقدس پر حاضری دی۔ یہاں فاتحہ پڑھ کے ہم باہر صحن میں پڑی ہوئی لکڑی کی چوکیوں پر آکر بیٹھ گئے۔ چند مجاور بھی ہمارے پاس آن بیٹھے۔ وہ نواب صاحب کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ بھی ایک ایک سے اس کے گھر بار کا حال پوچھتے رہے۔ ایک مجاور اندر مزار پر سے سبز کپڑے کے دو ٹھیٹے لے آیا۔ ایک ایک ہماری ٹوپیوں کے گرد لپیٹ دیا گیا سائل صاحب نے اس سے کچھ سلوک کیا۔ پھر مجھ سے فرمانے لگے۔ بزرگانِ دین کے مزاروں پر اکثر آتے رہنا چاہیے۔ اس سے برکت حاصل ہوتی ہے۔ اور دل میں انابت الی اللہ پیدا ہوتی ہے۔ افسوس، اب ان مقامات پر اکثر مجاور ایسے ہیں، جنھوں نے محض دکانداری بنا رکھی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انہی میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دل

صاحبِ مزار کے انوار سے منّور ہیں۔ اور اگر تم واقعی یہاں کی برکات حاصل کرنا چاہو، تو لازم ہے کہ انھیں واسطہ بناؤ۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ان سے کٹھ حجتی کر بیٹھوں لیکن موقع بے ڈھب تھا؛ ہمارے ارد گرد بہت لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے میں نے طرح دے جانے اور خموشی ہی میں عافیت دیکھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسے پوری نہیں، تو نیم رضا تو ضرور ہی سمجھے ہوں گے۔

میادا اس سے کچھ غلط فہمی ہو جائے، اس لیے میں ایک اور واقعہ بھی لکھ دیتا ہوں جس سے ان کے مذہب اور اصحابِ مذہب سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔

میں اس زمانے میں قرول باغ میں رہتا تھا۔ ان دنوں جامعۂ ملّیہ کے صدر دفاتر بھی یہیں تھے۔ "مسجد کے زیرِ سایہ خرابات" کا تلازمہ پورا کرنے کو میں نے یہاں کے اکابر کے پڑوس میں مکان لے رکھا تھا۔ اور ان اصحاب کے ہاں اکثر آتا جاتا رہتا تھا ایک شام میں مکتبہ جامعہ کے مہتمم جناب حامد علی خان مرحوم سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں اچھا خاصا مجمع ہو رہا ہے، بیشتر مقامی حضرات کے علاوہ باہر کے ایک بہت بڑے عالم اور مصنّف بھی موجود تھے۔ میں نے انھیں ذاتی طور پر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ان کی دو ایک جوانی کی تصویریں دیکھی تھیں۔ میں نے انھیں پہلی نظر میں پہچان لیا کہ جس کی وہ جوانی تھی، یہ اس کا بڑھاپا ہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ تقریب انھی کے اعزاز میں ہوئی ہے اور یہ لوگ ابھی شام کا کھانا ختم کر کے بیٹھے ہیں۔ میرے قریب جو صاحب تشریف فرما تھے، ان سے معلوم ہوا کہ مشارٌ الیہ بزرگوار ایک مقدمے کے سلسلے میں یہاں تشریف لائے ہیں۔ قصّہ سنیے: موصوف ایک ادارے کے مدیرِ اعلیٰ اور بہت بڑے عالمِ دین ہونے کے علاوہ، ایک مشہور علمی و ادبی مجلّے کے ایڈیٹر بھی تھے۔ کچھ مدّت پہلے دلّی کے ایک من چلے اور جوشیلے نوجوان نے ان کی ایک مایۂ ناز کتاب پر مخالفانہ تنقید لکھ کے ایک مختصر رسالے کی صورت میں شائع کی تھی۔ اس میں وہ ان کی غلطیاں دکھا کے ان کی علمی حیثیت معرضِ بحث میں لے آئے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بعض مقامات پر وہ جوانی کی ترنگ میں جادۂ اعتدال سے تجاوز کر گئے تھے۔ لیکن اگر معاملہ یہیں تک رہتا، تو کوئی بات نہیں تھی۔ غلطی کس سے نہیں ہو جاتی۔ پھر تحقیق و تصنیف کا میدان تو بہت وسیع ہے، خصوصاً جہاں تعلق استنباط اور استنتاج سے ہو، وہاں تو اختلاف کا بہت زیادہ امکان ہے۔ اگر ہمارے ممدوح معاملے کو اسی نظر سے دیکھتے، تو کوئی قباحت نہیں تھی۔ لیکن خدا معلوم، انھیں کیسے شبہہ ہوا کہ اس رسالے کی تصنیف میں ان کے ایک مخالف عالمِ دین کا ہاتھ

ہے، جو یہیں دلّی میں رہتے تھے۔ بقول امام شمس الدین ذہبی، دو صاحبِ علم شخصیتوں کے لیے ہمعصری بہت بڑی ابتلا ہے۔ وہ نہ صرف ایک دوسرے کی صحیح قدر و قیمت شناخت نہیں کرسکتے، بلکہ بسا اوقات رشک و حسد کے باعث ان میں چشمک بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے مخالف بن جاتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ یہ دونوں صاحب ہمارے چوٹی کے عالموں اور مصنّفوں میں سے تھے، لیکن نقطۂ نظر کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے اشد مخالف۔ چنانچہ جب یہ رسالہ موصوف کے پاس تبصرے کی غرض سے پہنچا، تو انھوں نے اپنے مجلّے میں اس پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھ دیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون معشوق ہے اور کس نے یہ کتاب لکھی ہے اور کیوں چھپوائی ہے۔ یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ رسالے کے مصنّف کا نام جعلی ہے۔

جونہی یہ پرچہ دلّی پہنچا۔ جس میں یہ تنقید چھپی تھی، اس نوجوان مصنّف نے آؤ دیکھا نہ تاؤ عدالت میں ہتکِ عزّت کا اور ازالہ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا کہ فلاں مجلّے کے ایڈیٹر نے میری تصنیفی قابلیت پر حملہ کر کے میری ہتک کی ہے۔ نیز یہ شبہہ کر کے کہ میں نے یہ کتاب کسی اور سے لکھوا کے اپنے نام سے چھاپ دی ہے، میری شہرت اور عزّت پر حملہ کیا ہے۔ ٹھیک طور پر یاد نہیں رہا، ہرجانہ غالباً دس ہزار روپیہ طلب کیا گیا تھا۔

جو حضرات قانون سے واقف ہیں، وہ جان سکتے ہیں کہ معاملہ کس قدر سنگین تھا۔ قرائن ایسے تھے کہ جرم ثابت ہو جائے گا اور موصوف کو سزا ہو جائے گی اور ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔ اس لیے قدرتی طور پر سب لوگ تشویش کا اظہار کر رہے تھے۔ اگلے دن اسی مقدمے کی پیشی تھی، اور وہ اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے۔

اتفاق کی بات کہ میں اس نوجوان مصنف سے چند دن پہلے نواب سائل صاحب کے مکان پر مل چکا تھا اور ان کا یہ رسالہ بھی دیکھ چکا تھا۔ نواب صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے، ان کی تعریف کی تھی، اور ان کے والد مرحوم سے اپنے قدیم دوستانہ تعلّقات کا ذکر کیا تھا۔ یہ نوجوان بھی، ان سے اسی طرح مؤدّبانہ ملے تھے، جیسے ایک خرد، اپنے بزرگ سے ملتا ہے۔ میں نے جب اس مقدمے کی رُوداد سنی، تو معاً میرے ذہن میں خیال گزرا کہ اگر نواب صاحب کوشش کریں، تو شاید ان کی وساطت سے کچھ سمجھوتا ہو جائے۔ چونکہ مقدمے کی پیشی اگلے دن تھی اور وقت تنگ تھا اس لیے میں نے

اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ابھی جا کے ان سے ملنا چاہیئے، تاکہ اگلی صبح عدالت کے وقت سے پہلے اس نوجوان سے بات چیت کی جا سکے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار وہاں دوستوں سے کیا، تو انھوں نے بھی میری اس تجویز پر صاد کیا، اور زور دیا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو، تو اس سے دریغ نہیں کرنا چاہتے۔ غرض کہ میں باہر نکلا اور بائیسکل پر سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں جب سائل صاحب کے ہاں پہنچا ہوں۔ تو ساڑھے دس سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود جونہی انھیں میرے آنے کی اطلاع ہوئی فوراً نیچے اتر آئے اور چھوٹتے ہی پوچھا، کیوں خیر تو ہے؟ میں نے کہا نہیں تو، کوئی ایسی بات نہیں۔ کہنے لگے۔ اب میں یہ تو ماننے سے رہا۔ اس سردی کے وقت، اتنی رات گئے، قرول باغ سے تمھارا آنا، بے سبب تو ہو نہیں سکتا۔ القصہ میں نے بے آرامی کی معافی چاہتے ہوئے۔ سارا قصہ بیان کیا۔ تو انھوں نے جو کچھ جواب میں کہا، وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا۔ بیٹا! تم بہت بھولے ہو، تم ان مولویوں کو نہیں جانتے۔ انھیں اپنے علم کا غرور ہے، انھیں اپنی نمازوں کا غرور ہے، اپنے روزوں کا غرور ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے علم اور عبادت کی وجہ سے لوگ ان کے آگے سجدہ کریں اور ان کے ہاتھ چومیں۔ ان کی ہر بات پر آمنّا اور صدّقنا کہیں اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو لڑکا اپنے سگے باپ کی اندھا دھند ماننے کو تیار نہیں اور کہہ دیتا ہے، ابا جان! یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ بھلا یہ کل اعوذی ملّا کیسے توقع رکھتے ہیں کہ دنیا ان کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کر لیگی! تم اس نوجوان سے مل چکے ہو۔ وہ گھر کا اچھا کھاتا پیتا ہے۔ اس کے دادا میرے اچھے دوست تھے۔ یہ ان کا اکلوتا لڑکا ہے اور وہ اس کے لیے اچھی خاصی پونجی چھوڑ مرے ہیں۔ اس کی عربی اور مذہبی علوم کی باقاعدہ تعلیم ہوئی ہے، اور وہ بودا نہیں مجھے اس مقدمے کا علم نہیں تھا۔ لیکن اگر انھوں نے اس کے خلاف کچھ لکھا ہے، تو اسے بجا طور پر رنج ہونا ہی چاہیئے اور اگر انھوں نے اس دوسرے عالم کی مخالفت کے جوش میں کوئی ایسی بات لکھ دی ہے، جس پر قانونی گرفت ہو سکتی ہے، تو انھیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہی چاہیئے۔ جو آگ کھائے گا، انگارے ہگیگا۔ اگر کوئی اور مجھ سے اس معاملے میں دخل دینے کو کہتا، تو میں کبھی نہیں مانتا۔ لیکن تمھاری خاطر سے میں اپنی سی کوشش کرونگا۔ آگے جو خدا چاہے۔ کل علی الصّباح دفتر جانے سے پہلے آجانا، میں تمھارے ساتھ خود اس کے پاس چلوں گا۔

میں نے یہ لمبی داستان صرف اس لیے بیان کی ہے کہ اس سے سائل صاحب کے علمائے دین سے متعلق خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ خود کوئی بڑے عالم نہیں تھے۔ اپنے جدِّ بزرگوار کے بعد انھوں نے شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے کچھ عربی پڑھی تھی۔ حدیث کی چند کتابیں مشہور عالم مولوی سید نذیر حسین محدّث دہلوی سے پڑھیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم کسی طرح یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھیں عربی علوم یا مذہب سے کچھ ایسی بڑی وابستگی تھی کہ انھیں مولویوں کا مدِّ مقابل خیال کیا جائے۔ بلکہ اپنی خاندان روایات کے مطابق وہ بہت خوش عقیدہ تھے اور سب علماء اور اصحابِ فضل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہہ نہیں کہ جہاں وہ حقیقی بزرگی اور علم کے قدرشناس اور پرستار تھے۔ وہیں بناوٹ اور ملمع کے سخت دشمن بھی تھے۔ کسی بڑے سے بڑے نام کی شوکت اور شہرت انھیں مرعوب نہیں کرسکتی اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔ دیکھئے، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی میں ذکر کر رہا تھا حضرتِ محبوبِ الٰہی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مقدّس کا۔ تو زیارت سے مشرف ہو کر باہر نکلے اور پھرتے پھراتے خواجہ حسن نظامی مرحوم کے دولتکدے پر پہنچ گیے۔ سائل صاحب اور خواجہ صاحب میں پرانی ملت تھی۔ مجھے ٹھیک سا یاد نہیں، لیکن غالباً یہ بھی فرمایا تھا کہ میری کنیت ابوالمعظم جناب خواجہ صاحب کی دی ہوئی ہے۔ خواجہ صاحب موجود نہیں تھے۔ ان کے بڑے صاحبزادے حسین نظامی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہاں تھوڑی دیر ان سے بات چیت ہوتی رہی اور چائے پانی سے کچھ تواضع بھی ہوئی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب موصوف فاسفورس کے نیل اور سویابین کا بہت اشتہار دے رہے تھے۔ جانے کیسے، ان چیزوں کا ذکر چل پڑا۔ حسین نظامی صاحب نے ان دونوں چیزوں کا ایک ایک نمونہ ہمیں پیش کیا اور ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے رخصت ہوئے۔

باہر نکلے تو میں نے کہا کہ اب آئے ہیں تو چلیے آپ کے دادا جان کے مزار پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔ چنانچہ ہم گھومتے گھامتے چونسٹھ کھمبا کے پاس اس احاطے میں پہنچ گیے، جہاں غالب ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہاں فاتحہ کے بعد مختلف قبروں کی نشاندہی کرتے رہے۔ چنانچہ بتایا تھا کہ غالب کے پاس والی قبر معروف کی ہے۔ اس کے بعد معروف کی بیوی ہیں۔ ان کے بعد ان

کے صاحبزادے علی بخش خان کی قبر ہے۔ معروف کی پائنتی ان کے ایک مرید محمد حیات خاں ولد احمد یار خاں (رامپوری) ہیں اور ان کے برابر میں ان ہی کے صاحبزادے خان بہادر محمد نظام الدین خاں ہیں۔ دلّی کی ایک ایک اینٹ کے نیچے ایک تاریخ ایک داستان دفن ہے۔ ہم یہ اینٹیں الٹتے پلٹتے، باتیں کرتے اور مختلف بزرگوں اور بادشاہوں کی آرام گاہوں سے درس عبرت لیتے ہوئے وہاں پہنچے، جہاں گاڑی ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اب جو چلے، تو ڈیڑھ ایک بجے کے لگ بھگ قطب میں بھول بھلیوں پر آ کر دم لیا۔ یہاں کے انتظام دیکھ کر میں کچھ متعجب سا ہوا۔ شمالی برآمدے میں دریاں بچھی ہوئی تھیں، ایک طرف چولھا گرم ہو رہا تھا۔ ایک ملازم چائے کا سامان، ایک چھوٹے سے تخت پر قرینے سے لگا رہا تھا۔ جب ہم داخل ہوئے تو نواب صاحب نے ملازم سے پوچھا: کہو میاں، بھائی کے آنے میں کتنی دیر ہے۔ حضور، وہ اب آنے ہی والے ہیں۔ آپ تشریف رکھیے۔ حکم ہو تو چائے تیار کروں۔ نہیں میاں ہم بھائی کے آنے سے پہلے کیسے پی لیں، یہ تو ٹھیک نہیں۔ حضرت اتنے تکلّف کی کیا ضرورت ہے، وہ آئینگے، تو دوسرا دور ہو جائیگا بس چٹکی میں تیار کیے دیتا ہوں۔ پانی تو آگ پر رکھا ہی تھا، اس نے پل مارتے میں چائے کی دو پیالیاں بنا کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ نواب صاحب کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن میں اس دو تین گھنٹے کی کھنڈر گردی سے خاصی بھوک سی محسوس کرنے لگا تھا۔ ہم ابھی چائے ختم بھی نہیں کر چکے تھے، کہ نیچے سڑک پر ایک گاڑی آ کے رُکی اور اس میں سے ایک بزرگ برآمد ہوئے۔ ۵۵ - ۶۰ برس کا سن، سانولا رنگ، لانبا قد، اکہرا جسم، کھچڑی ڈاڑھی، ٹھوڑی پر زیادہ کلّوں پر کم، جسم پر بند گلے کا شیروانی نما لمبا گرم کوٹ، اور نیچے گرم پاجامہ، سر پر بادامی رنگ کی ٹوپی وہ آئے اور آداب عرض کر کے، نواب صاحب کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ جب ایک دوسرے کا حال احوال پوچھ چکے، تو نواب صاحب نے کہا: بھائی! میں تم سے اس عزیز کا تعارف کرانا چاہتا ہوں پھر میرے متعلق چند کلمے کہ کر مجھ سے فرمایا۔ آپ خان بہادر حکیم امجد علی خان صاحب ہیں، میرے بچپن کے لنگوٹیے: بھائی نہیں، مگر بھائی سے عزیز تر۔

جن اصحاب نے ذوقؔ کا تذکرہ پڑھا ہے، ممکن نہیں کہ وہ حافظ غلام رسول ویران کا نام نہ جانتے ہوں۔ ویران ذوق کے شاگرد تھے۔ شاگرد ہی نہیں، عاشق تھے۔ کیا مجال جو ان کی

موجودگی میں کوئی استاد کے خلاف کچھ کہہ جائے، زبان ہی تک نہیں لاٹھی سے بھی اس کی خبر لینے سے نہیں چوکتے تھے۔ قدرت بڑی منصب مزاج ہے۔ اگر کہیں ایک طرف سے کمی رہ جاتی ہے، تو اس کی کسر کہیں اور سے پورا کر دیتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ویران نابینا تھے مگر بلا کے ذہین، اور حافظے کا کیا کہنا۔ قرآن حفظ تھا، ہزاروں شعر نوکِ زبان تھے۔ کسی نے کوئی اعتراض کیا اور انھوں نے تڑ سے سند میں کسی استاد کا شعر پڑھا، جیسے اعتراض کے انتظار ہی میں تو بیٹھے تھے۔

ذوقؔ ۱۸۵۴ء میں فوت ہوئے۔ وفات سے پہلے وہ اپنا دیوان جمع نہیں کر سکے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے اکلوتے صاحبزادے خلیفہ محمد اسمٰعیل اور مولانا محمد حسین آزادؔ نے یہ کام ہاتھ میں لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خلیفہ محمد اسمٰعیل بھی جنت سدھارے بھرے گھر میں جھاڑو پھر گئی اور اس کے ساتھ ہی ذوقؔ کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ جو بچا کھچا تھا اسے مولانا آزاد لے کر نکل بھاگے۔ ذوقؔ کے شاگردوں کو قدرتی طور پر فکر ہوئی کہ اگر کلام جلد شائع ہوا تو کل کو کوئی استاد کا نام لینے والا بھی نہیں ملے گا۔ ظہیر اور انور دونوں بھائیوں نے باہم مشورہ کیا اور حافظ ویران کے پاس پہنچے کہ یہ استاد کے سب سے زیادہ حاضر باش شاگرد تھے، اور ان کا کلام بھی سب سے زیادہ ان ہی کو یاد تھا۔ چنانچہ وہ بولتے گیے اور ظہیر اور انور لکھتے گئے اور اس طرح ان تینوں صاحبوں کی کوشش سے ۱۸۶۰ء میں دیوان ذوقؔ کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس کے ایک مدت بعد مولانا آزادؔ نے بہت کچھ کتر بیونت کرکے، بلکہ اپنی طرف سے اضافے کرکے ایک اور دیوان شائع کیا، جو اب متداول ہے۔

حافظ ویران استاد کی زندگی بھر قلعۂ معلیٰ میں رہے۔ ان کی وفات کے بعد محلہ کشن گنج (دلی) میں رہنے لگے۔ ۱۳۰۵ھ میں فوت ہوئے "خاک سدہ خواجہ" تاریخ وفات ہے جو انھوں نے خود ہی اپنی وفات سے دو برس پہلے نکالی تھی۔ حضرت خواجہ باقی باللہؒ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ بیرونی احاطے کے دروازے سے ملی ہوئی ان کی قبر ہے۔ لوحِ مزار پر یہ شعر کندہ ہے:

فاتحہ مرقدِ ویراں پہ بھی پڑھتے جانا
ان سے کہہ دو، جو ہیں اس رہ سے گزرنے والے

اولاد میں صرف ایک صاحبزادی چھوڑی۔ یہ حکیم صاحب موصوف ویران کے نواسے ہیں تو مجھے ایک پرانا مسئلہ یاد آ گیا۔

میرے دلّی آنے سے کچھ دن پہلے لاہور کے ایک نوجوان ادیب نے "خاقانی ہند" کے نام سے ذوق کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے اور الّم غلّم باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھ دیا کہ ذوق مذہبًا شیعی تھے۔ میرے نزدیک یہ بات درست نہیں تھی اس پر میں نے اس کی تغلیط میں ایک مختصر تحریر نگار میں شائع کی تھی۔ میں نے استدلال خود ذوق کے کلام سے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کچھ ایسا قابلِ اطمینان ذریعۂ تحقیق نہیں۔ اب یہ سن کر کہ حکیم صاحب ایک ایسے شخص کے عزیز ہیں، جو ذوق کا دن رات کا مصاحب تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ سے کبھی اپنے نانا جان سے ذوق کے معتقدات سے متعلق بھی کوئی بات چیت ہوئی تھی؟ فرمایا پہلے تو میں ان کی وفات کے وقت بہت چھوٹا تھا، اس لیے مجھے ایسی باتوں سے کچھ دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اگر ہوتی تو بھی میرا سر پھرا تھا کہ میں ان سے کوئی بحث ذوق سے متعلق کرتا۔ اگر انھیں کہیں ہلکا سا شبہہ بھی ہو جاتا کہ میرے سوال سے استاد کی تنقیص یا اعتراض کا پہلو نکلتا ہے، تو وہ میری کھوپڑی نہ ادھیڑ ڈالتے۔ لیکن اس کا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ذوق شیعی نہیں تھے، بلکہ اہلِ سنت والجماعت میں سے تھے۔

معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کا معمول ہے کہ اکتوبر سے لے کر مارچ تک، جاڑوں کے چھ مہینے، ہر اتوار دوپہر کو یہاں بھول بھلیاں پر آجاتے ہیں۔ سردی ہو، پانی برسے، آندھی ہو یا طوفان آئے، ان کے اس معمول میں فرق نہیں آسکتا۔ اگر آپ کسی اتوار کو حکیم صاحب کو یہاں موجود نہ پائیں، تو سمجھ لیجیے کہ یا تو وہ دلّی میں نہیں، یا اتنے بیمار ہیں کہ بستر پر سے ہلنے کی تاب نہیں۔ دلّی میں ہوتے ہوئے اور صحت کی حالت میں، ناممکن ہے کہ وہ یہاں نہ آئیں۔

کوئی گھنٹے بھر میں دوست احباب جمع ہونے شروع ہو گئے۔ بیشتر شاعر حضرات تھے۔ ان میں دو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو خضر میرزا مرحوم تھے، دوسرے ظہیر دہلوی کے نواسے سیّد اشتیاق حسین شوقؔ۔ خضر میرزا میرزا زین العابدین خان عارفؔ کے بھتیجے اور جناب سائلؔ صاحب کے قریبی عزیزوں میں سے تھے، بلکہ رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ سائل نواب احمد بخش خاں

کے پرپوتے تھے، اور خضر میرزا ان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے نواسے کے بیٹے، گویا چار پیڑھی اوپر دونوں کا جدِّ اعلیٰ ایک تھا۔ خضر میرزا انگریزی حکومت کے زمانے میں مختلف معزز عہدوں پر فائز رہے۔ نوکری سے پنشن پانے کے بعد اب یہیں مہرولی میں اپنے خاندانی مکان میں رہتے اور سارا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود جسم نہایت چاق و چوبند، طبیعت حد درجہ حاضر اور حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھا۔ انھوں نے بیسیوں ایسے ایسے لطیفے سنائے کہ ہنستے ہنستے ہمارے آنسو نکل آئے۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ باوجود پیرانہ سالی اور تدیّن کے انھیں غیر ثقہ بلکہ عریاں لطیفے تک کہنے میں باک نہیں تھا۔ ان میں سے ایک لطیفہ نقل کرتا ہوں، جو نسبتاً کم عریاں ہے:

ایک مولوی صاحب تھے، نماز کا وقت آیا تو مسجد میں تشریف لائے مسواک کی، پھر لوٹا ہاتھ میں لیے جائے ضرور میں گئے اور واپس آکے وضو کرنے لگے۔ ابھی وضو ختم نہیں کر پائے تھے کہ ان کی ہوا خارج ہو گئی اور وہ بھی آواز سے۔ اس پر جو صاحب ان کے قریب حوض پر بیٹھے وضو کر رہے تھے، بولے کہ "یہ بآوازِ بلند احتجاج کر رہی ہے کہ آپ نے منہ میں مسواک کی، لیکن مجھ غریب کو پوچھا تک نہیں۔" (اب بھی میں نے بعض لفظ حذف کر دیے ہیں اور بعض بدل ڈالے ہیں) معلوم ہوا کہ جوانی کے عالم میں شعر بھی کہتے اور خضر تخلص کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے۔

خضر! یہ بھی خدا کی قدرت ہے
ہم تمھیں راستہ بتاتے ہیں

اس کے ساتھ انھوں نے مومن کا یہ شعر پڑھا تھا:

کل جو مسجد میں جا پھنسا مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

سید اشتیاق حسین کا نام اس لیے یاد رہ گیا کہ اس دن انھوں نے مختلف شاعروں کے پڑھنے کی ایسی ہو بہو نقل اتاری تھی کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں دورِ حاضر کے اکثر مشہور شاعروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں اور میں نے ان کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے۔ اس لیے میں نے ان سے فرمائش کر کے بعض شاعروں کی نقل اتارنے کو کہا اور وہ ہر مرتبہ امتحان میں

میں پورے اترے۔ سائل صاحب اپنا کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ داغ کے آخری زمانے میں، جب یہ حیدرآباد میں مقیم تھے۔ مشاعروں میں اکثر حضور نظام اور استاد داغ کی غزلیں یہ پڑھا کرتے تھے۔ آج کل تو مشاعروں کا حال تباہ ہو گیا ہے۔ جو شاعر گلے بازی سے قاصر ہے لوگ اسے سننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن سائل صاحب کے پڑھنے میں اور ہمارے موجودہ شاعروں کے پڑھنے میں بہت فرق تھا۔ وہ گاتے نہیں تھے (رینانے کا تو کیا ذکر) اس کے باوجود ان کے پڑھنے میں ایک خاص لذت اور دلکشی تھی، جو بس سننے سے تعلق رکھتی تھی۔ افسوس یہ انداز انہی پر ختم ہو گیا۔ جب شوق صاحب بیشتر شاعروں کی نقل اتار چکے، تو میں نے ان سے کہا کہ اب سائل صاحب کی نقل فرمائیے۔ کہنے لگے، یہاں میری ترکی تمام ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے صرف ایک مصرع دہرایا۔ اگرچہ انیس بیس کا فرق تھا، تاہم بڑی حد تک وہ سائل صاحب کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ سائل صاحب نے سن کر صرف اتنا کہا: تم بڑے شریر ہو۔

اس کے بعد کتنی ہی مرتبہ مجھے ان ہفتہ واری جلسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اور ہر بار میں ان اصحاب کی مہربانی اور خلوص محبت اور وضعداری سے نیا اثر لے کر واپس آیا۔ ہماری آخری دور کی تہذیب میں وضعداری کو بہت دخل تھا۔ اس کی گرفت ملکی قانون اور مذہبی احکام سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ کیا مجال جو آپ بزرگوں کو اس ڈگر سے ادھر ادھر ہٹا سکیں، جو انھوں نے پہلے دن اپنے لیے پسند کر لی تھی۔ حکیم صاحب کی وضعداری کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

ان کے ہاں رمضان کے مہینے میں ہر جمعے کو افطاری کی تقریب ہوتی تھی۔ اس میں وہ اپنے خاص احباب کو تو مدعو کرتے ہی تھے، لیکن اس کے علاوہ بھی صلائے عام تھی۔ ان کے ہاں پہنچ جائے اور روزہ افطار کرے۔ ہر ایک کی مناسب آؤ بھگت ہوتی۔ کھانے کو مٹھائی اور پینے کو موسم کے مطابق چائے، شربت وغیرہ سے تواضع کی جاتی۔ میں نے صرف ایک جمعے کو حاضری دی تھی۔ بلا مبالغہ سو سوا سو آدمی سے کم نہیں ہو گا۔ افطاری کے بعد بے تکلف احباب ٹھہر جاتے۔ کچھ دیر تفریح رہتی۔ شعر و شاعری ہوتی۔

حکیم صاحب موصوف نے ۲۳/ ستمبر ۱۹۳۸ء کو لو اسیر کے مرض سے وفات پائی اور اپنے نانا و بیران مرحوم کی طرح درگاہ باقی باللہؒ میں دفن ہوئے۔ سائل صاحب نے اپنے دیرینہ دوست

کی تاریخِ وفات کہی جو لوحِ قبر پر کندہ ہے:

بود مردِ از نسلِ افغاں چارہ سازِ بیکساں — حاجی بیت الحرام و زائرُ دارالنّبیٰ
کرد رحلت از جہاں وداہ رنج بیکراں — از فراقِ جاودانی وز وداعِ دائمی

سالِ تاریخِ وفاتش سائلِ دہلی نوشت
"فردِ عالم، خان صاحب حاجی امجد علی"
(۱۳۵۷)

ان کے بعد وہ قطب صاحب کے ہفتہ واری اجتماع بھی ختم ہو گئے۔

وہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک
سچ ہے، ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

سائل صاحب کی پہلی بیوی نواب ممتاز حسین خان والی پٹودی کی ہمشیر تھیں، لیکن میاں بیوی میں نبھ نہ سکی اور علاحدگی ہو گئی۔ اس بیوی سے ان کے ایک بیٹا ہوا تھا جو صغرسنی میں فوت ہو گیا۔ اس کا نام معظم مرزا تھا۔ یہی لڑکا ان کی کنیّت۔ ابوالمعظم کا باعث ہوا۔ اس کے بعد ان کا دوسرا نکاح استاد داغ کی منہ بولی بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوا، جو ان کے چھوٹے بھائی میرزا ممتاز الدین احمد خان کی بیوہ تھیں۔ داغ کی اپنی صلبی اولاد صرف ایک بیٹا احمد تھا، جو انھیں کم عمری میں داغ دے گیا۔ انھوں نے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

احمد کے غم میں، دیدہ و دل کیوں نہ ہوں تباہ
آنکھوں کا نور تھا، مرے دل کا سرور تھا

اس کے بعد داغ نے لاڈلی بیگم کو گود لے لیا، جو ان کی سالی اولیا بیگم کی نواسی تھیں۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں ضمیر مرزا مرحوم کے ملازم نے مجھ سے کہا تھا کہ وہی نواب سراج الدین احمد خان، جن کے گھر میں باہر کی بیگم ہیں۔ نیز میں نے جو شروع میں ذکر کیا ہے کہ ڈیوڑھی کے اندر صدر دالان کے دروازے کے اوپر ایک تختی پر لکھا تھا "مکان لاڈلی بیگم" تو اس کا کیا مطلب تھا۔

لاڈلی بیگم صاحب عمر میں سائل صاحب سے کوئی بیس برس چھوٹی تھیں۔ یعنی جب سائل صاحب سے ان کا نکاح ہوا ہے، تو وہ کوئی ۱۸، ۱۹ برس کی تھیں اور یہ ۳۸، ۳۹ برس کے۔ ایک تو اس وجہ سے اور دوسرے یہ کہ وہ استاد زادی تھیں، نواب صاحب بہت حد تک ان سے دبتے تھے

ان کے خلافِ طبع بات نہیں کرتے تھے اور یہ ان سے نرم گرم بات کر لیتی تھیں۔ مثلاً ۱۹۳۷ء کے جاڑوں میں سائل صاحب حیدر آباد گئے، وہاں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا، جس سے ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ بہت معذور ہو گئے اور بیساکھیوں کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ بیشک اس عمر میں ایسی سخت چوٹ مشکل ہی سے بالکل ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن اگر مناسب علاج ہوتا اور نواب صاحب احتیاط کرتے، تو ممکن تھا کہ وہ تھوڑا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے۔ لیکن ان کے مزاج میں ایک طرح کا چھیلا پن اور سہل انگاری تھی۔ انھوں نے نہ صرف خود اس طرف مناسب توجہ نہ کی، بلکہ اس معاملے میں وہ کسی اور کی بھی نہیں سنتے تھے مجھے خوب یاد ہے کہ بعض اوقات بیگم صاحب بہت خفا ہوتیں۔ — اور زِچ ہو کے کہا کرتی تھیں: یہ تو مرض کو پال رہے ہیں۔ بھلا جب تک اس کا مناسب علاج نہیں ہو گا، یہ کیسے تندرست ہو جائیں گے۔

سائل صاحب اپنے استاد کا بہت ادب کرتے تھے۔ دن میں کسی نہ کسی سلسلے میں دسیوں ہی مرتبہ ان کا ذکر آجاتا، داغؔ صاحب کی یہ بات، داغ صاحب کی وہ بات۔ اپنے استاد بھائیوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ احسنؔ مارہروی، نوحؔ ناروی، بیخودؔ دہلوی، ان حضرات سے میری پہلی ملاقات سائل صاحب ہی کے ہاں ہوئی۔ استاد داغؔ کے خاندان کی کتنی باتیں مجھے سائل صاحب سے معلوم ہوئی تھیں، جن میں سے بعض گفتنی ہیں، بعض ناگفتنی۔

ایک دن ان سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، میں نے کہا: آپ کے خاندان نے انھیں نواب شمس الدین احمد خاں کا بیٹا تسلیم نہیں کیا۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ یاد نہیں ہمارے قریب کونسی کتاب رکھی تھی، اس میں داغؔ کی تصویر بھی تھی۔ اسے کھول کے یہ تصویر مجھے دکھاتے ہوئے بولے: تم نے ہمارے خاندان کے کئی آدمیوں کو دیکھا ہے اور ہمارے بزرگوں میں سے بعض کی تصویریں بھی دیکھی ہیں۔ اب یہ تصویر دیکھو اور خود فیصلہ کر لو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ داغ اور لوہارو خاندان کے افراد میں حیرت انگیز مشابہت ہے، وہی وضع قطع، وہی نقشا، وہی خد و خال، اگر قیافہ کوئی چیز ہے تو اسے مدّ نظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس خاندان میں سے نہیں تھے۔

میں نے جب اس رائے کا اظہار کیا، تو فرمایا، بلاشبہہ جو کچھ تم نے کہا، بالکل سچ ہے۔ بس

ایک فرق تھا۔ ہمارے گھرانے میں سب کا رنگ بہت گورا چٹّا رہا ہے۔ داغ صاحب اس کے برعکس اچھی خاصی سانولی رنگت کے تھے۔ لیکن تم پڑھے لکھے آدمی ہو جانتے ہو کہ یہ بات ایسی نہیں کہ محض اس وجہ سے ہم انھیں اپنے خاندان سے خارج کر دیں۔ مجھے تو کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شبہہ نہیں ہوا کہ وہ غیر ہیں، میں تو انھیں چچا جان کہتا تھا۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ جب نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی ہوئی ہے، تو لوہارو خاندان والوں نے داغ کو اس لیے ان کا بیٹا تسلیم نہیں کیا کہ کہیں انگریز انھیں ریاست کا وارث نہ قرار دیدیں۔ سارا خاندان شمس الدین احمد خاں کے خلاف تھا، اور ننھیال کی طرف سے داغ کی پشت پر کوئی تھا نہیں، اس لیے وہ لوگ آسانی سے اس میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن بعد کو جب نواب امین الدین احمد خاں گدّی پر بیٹھ گئے، اور اب اس کا اندیشہ نہیں رہا تھا، تو آہستہ آہستہ ان کی مخالفت میں کمی آگئی تھی۔

ایک اور بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

داغ کی شاعری کو دیکھ کے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ شخص شراب ضرور پیتا ہوگا۔ ایک مرتبہ نیاز فتحپوری نے داغ کے غالباً اس شعر پر

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور
کیا چیز حرام ہو گئی ہے

لکھا تھا کہ جس شخص نے کبھی پی نہ ہو، وہ ایسا شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ میں نے ایک دن سائل صاحب سے اس کے متعلق پوچھا۔ انھوں نے نہایت وثوق سے فرمایا: داغ صاحب نے کبھی شراب نہیں پی؛ لوگوں کا یہ بالکل غلط خیال ہے کہ وہ پیتے تھے۔

مجھے سائل تخلص ہمیشہ کھٹکتا تھا۔ شعر و شاعری کی باتیں ہو رہی تھیں کہ میں نے کہا: قبلہ آپ کے جدِّ امجد ضیاء الدین نیّر رخشاں، والد شہاب ثاقب، آپ کا تخلص سراجاً منیرا کی رعایت سے منیّر ہونا چاہئے تھا، یہ سائل کیا ہوا؟ فرمایا: تم نے کیا بات یاد دلادی۔ میری شاعری کا آغاز تھا۔ ان دنوں میں نواب غلام حسن خاں محو سے اصلاح لیتا اور سراج تخلص کرتا تھا چچا بادا نواب احمد سعید خاں کو یہ تخلص پسند نہیں تھا۔ لیکن کوئی اور موزوں تخلص بھی ان کے

خیال میں نہیں آتا تھا۔ ایک دن وہ نواب غلام حسن خاں کے کمرے پر تشریف فرما تھے۔ میں بھی خدمت میں حاضر تھا کہ پھر میرے تخلص کی بات چھڑ گئی۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شریف صورت شخص دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ کسی نے پوچھا، کون ہے؟ اس نے جواب میں صرف اتنا کہا سائل ہوں۔ خیر، اسے تو کچھ دے دلا کر رخصت کیا، لیکن اس کے ٹلنے کی دیر تھی کہ نحو صاحب کہنے لگے: لو بھائی تمھاری مشکل حل ہو گئی۔ اس صاحبزادے کا تخلص سائل رکھ دو۔ چچا ابا کو بھی یہ پسند آگیا۔ چنانچہ اس دن سے ہم سر آج سے سائل ہو گئے۔

خدا نے ان کے اس تخلص میں برکت دی اور یہ ایسا مشہور ہوا کہ آپ سائل دہلوی کہیں، تو ذہن کسی اور طرف جا ہی نہیں سکتا۔ خود انھیں بھی اس کا خوب احساس تھا۔

گرمیوں میں جب حکومتِ ہند کے دفتر شملے جایا کرتے تھے، تو یار لوگ یہاں کی سردی کو شعر و سخن کی گرم بازاری سے کم کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ ہر سال یہاں اچھے خاصے بڑے پیمانے پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا کرتا تھا، جس میں شرکت کے لیے ہندستان کے مختلف حصّوں سے مشاہیر کو دعوت دی جاتی تھی۔ سائل صاحب بھی ان مشاعروں میں آتے تھے۔ ۱۹۳۷ء کے مشاعرے کے بعد جب وہ ہال سے نکل رہے تھے، تو کسی نومشق نے پوچھا کہ دلّی میں آپ کا پتا کیا ہے، جس پر آپ کی خدمت میں خط لکھا جا سکے۔ یک دم کھڑے ہو گئے اور ہاتھ کی لکڑی کو زمین پر مارتے ہوئے چمک کے بولے: میاں صاحبزادے! خط پر صرف "سائل، دلّی" لکھ دینا، مجھے مل جائے گا۔ اسی طرح کا جواب ایک موقع پر غالب نے نواب علاء الدین احمد خاں کو دیا تھا کہ بیشک صرف میرا نام اور دلّی لکھ دیا کرو، مجھے خط پہنچ جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود طبیعت میں حد درجہ انکسار اور مروّت کا مادّہ تھا۔ کوئی ان کے پاس چلا جائے، انھیں ملنے اور اس کی فرمائش پورا کرنے سے انکار نہیں ہوتا تھا۔ کوئی صاحب تشریف لے آتے اور کلام سنانے کی فرمائش کر دیتے۔ وہ اندر سے بیاض منگواتے، اور شعر سنانے لگتے۔ اب جب تک وہ شخص خود یہ نہ کہہ دے، "شکریہ، بس کیجیے" یا کوئی اور ذکر نہ چھڑ جائے، سائل صاحب بیاض ہاتھ سے نہ رکھتے۔ اگر کوئی صاحب ذوق آدمی ہوتا، تو خیر ایک بات بھی تھی، لیکن بعض اوقات ایسے ایسے گاؤدیوں سے واسطہ پڑ جاتا، جو نظم اور نثر کا فرق تک نہیں جانتے تھے۔ اب جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ لیکن نواب صاحب بڑے

اطمینان سے اسی طرح ان سے بھی پیش آتے۔ یں بہت جز بز ہوتا۔ ایک آدھ مرتبہ میں نے شکایت بھی کی کہ آخر آپ کیوں ایسے کور ذوقوں کو ٹال نہیں دیتے! ہمیشہ یہی جواب ملا۔ بھائی، انکار کرنے کی جرأت نہیں پڑتی کہ اس سے اس کی دل شکنی ہو گی۔ تم نے سنا نہیں۔ دل بدست آور کہ حج اکبر است۔

ان کی زبان کی تعریف کرنا تحصیل حاصل ہے کہ، ان کے خاندان کی زبان ہمیشہ مستند اور ٹکسالی سمجھی گئی ہے۔ اگر اردوے معلّٰے کا لطف لینا ہو تو سائل کا کلام دیکھئے۔ باوجود داغ کا شاگرد ہونے کے، انھوں نے استاد کی حیدر آبادی شاعری کا تتبع نہیں کیا۔ یہ چیز داغ سے مخصوص تھی اور انہی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ امیر مینائی نے اس میدان میں مقابلے کے لیے کیا کچھ کوشش نہیں کی، لیکن نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ امیر کے شاگردوں میں سے ریاض خیر آبادی، حفیظ جونپوری اور جلیل مانکپوری نے اس رنگ کو نباہنے کی کوشش کی اور بہ فرقِ مراتب اس میں کامیاب بھی ہوئے، مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خود داغ کے شاگردوں میں بعض بہت کامیاب ہوئے۔ احسن مارہروی، نوح ناروی، بیخود دہلوی اساتذۂ فن ہیں: مضطر خیر آبادی کی غزل میں استاد کا رنگ چوکھا ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ داغ اپنے رنگ کا بانی اور خاتم ہے۔ سائل نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا بیسود ہے۔ انھوں نے اپنے لیے نئی راہ نکالی۔ زبان تو دلّی کی ہونا ہی چاہیے تھی۔ انھوں نے اس میں خالص عاشقانہ خیالات اور محاکات کے علاوہ مضمون آفرینی کی طرف توجہ کی۔ اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے! انھوں نے بعض اوقات بہت مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کی ہے اور ان میں ایسے ایسے شگفتہ اور پُرلطف شعر نکالے ہیں کہ یہ کچھ انہی سے ممکن تھا۔

ان کی شاعری کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی اور بلا مبالغہ ایک لاکھ شعر سے کم ان کا سرمایہ نہیں ہو گا۔ لیکن ان کا بہت بڑا کارنامہ ان کی مثنوی "نور علی نور" ہے جس میں بنیادی طور پر اگرچہ نورالدین جہانگیر بادشاہ اور ملکہ نورجہاں بیگم کی حیات معاشقہ کا بیان ہے، لیکن اس میں اور بھی بیسیوں مسائل آ گئے ہیں۔ افسوس کہ یہ نامکمل رہ گئی، ورنہ خلاصے کی چیز ہوتی۔ اب بھی اس میں سات آٹھ ہزار شعر سے کم نہیں ہوں گے۔

زمانے کا مذاق بدل گیا۔ ان کے پورے دیوان کو کون چھپوائے گا اور کون پڑھے گا۔ لیکن

اگر کوئی اللہ کا بندہ چار پانچ ہزار شعر کا انتخاب ایک مجلد میں شائع کر دے، تو یہ زبان کی واقعی خدمت ہوگی۔ اور مثنوی تو ضرور چھپ جانا چاہیے۔ اگرچہ وہ نامکمل ہی ہے۔ بقول نظیری نیشاپوری۔

ہزار نقش دریں کارگاہ درکاراست
بگیر خوردہ نظیری! ہمہ نکو بستند

حلیمہ بانو

توقیتِ مالک رام

(الف) نام : **مالک رام**

[مالک رام صاحب بویجا (اروڑہ کھتری) ذات کے فرد ہیں، اس لیے وہ انگریزی خط و کتابت میں اپنے نام کے ساتھ لفظ بویجا (BAWEJA) کا اضافہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی تمام امتحانی اسناد پر مالک رام بویجا نام ہی ملتا ہے۔ یہی حال سرکاری ریکارڈ کا بھی ہے۔]

والد کا نام : **لالہ نہال چند**

[اُن کے والد لالہ سوداگر مل تھے۔ لالہ نہال چند چار بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹے تھے اور غالباً سب سے زیادہ تعلیم یافتہ بھی۔ وہ انگریزی عہد میں فوج کے کمسریٹ کے محکمے میں ملازم رہے اور اسی سلسلے میں انیسویں صدی کے آخر میں چین کے خلاف لڑائی کے زمانے میں تقریباً سات سال تک چین میں مقیم رہے۔ وہاں سے وہ اس صدی کے شروع میں واپس آئے۔]

ولادت : بروز ہفتہ (صبح ۷ بجے) ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء پھالیہ ضلع گجرات۔ (پاکستان)

[تعلیمی اسناد اور ملازمت کے سرکاری ریکارڈ میں اُن کی تاریخ ولادت ۸ مارچ ۱۹۰۷ء ملتی ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ ٹھیک تاریخ ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء ہے]

والد کا انتقال : ۲ جنوری ۱۹۰۷ء

[لالہ نہال چند کا بعارضہ طاعون پھالیہ ہی میں عین جوانی میں ۲ جنوری ۱۹۰۷ء کو انتقال ہوا۔ اس وقت اُن کی عمر تقریباً ۳۵ برس کی ہوگی۔ گویا مالک رام صاحب صرف بارہ دن کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم اور یتیم ہو گئے۔ ان سے صرف ایک بڑے بھائی ایشر داس اور تھے اس وقت اُن کی تقریباً گیارہ برس کی عمر تھی۔]

(ب) تعلیم : چار برس کے تھے کہ والدہ سے ضد کر کے سکھوں کے مقامی گوردوارہ میں (جسے اس زمانے

میں دھرمشالہ کہتے تھے پڑھنے کے لیے جانے لگے۔ یہاں کوئی سال بھر رہے اس دوران میں سکھ دھرم کی بنیادی بانیاں (جپ جی، رہ راس، کیرتن سوہلا، سکھ منی وغیرہ) پڑھیں اور حفظ کیں۔ یہ سب تعلیم پنجابی زبان میں گورمکھی رسم الخط کے ذریعے سے ہوئی تھی۔

سال بھر بعد اپریل ۱۹۱۲ء میں مقامی ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل اسکول میں داخلہ لیا یہیں سے ۱۹۲۰ء کے شروع میں یونیورسٹی سے مڈل کی سند لی۔ مڈل یعنی آٹھویں کا امتحان پاس کرنے کے بعد وکٹوریہ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول وزیر آباد (ضلع گجرانوالہ) میں داخلہ لیا یہیں سے جونیئر اور سینیئر (انگریزی) کے بعد مارچ ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی کی دسویں کی سند لی۔ M.S.L.C. ۱۹۲۴ء میں حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا کہ آئندہ ہر ضلع میں انٹرمیڈیٹ کالج اور تحصیل میں ہائی اسکول قائم ہوگا۔ اس فیصلے کی تعمیل میں گجرات میں گورنمنٹ انٹر کالج کی تشکیل ہوئی۔ مالک رام صاحب نے انٹر کا امتحان اسی کالج سے ۱۹۲۶ء میں پاس کیا۔

اس کے بعد وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں ڈی۔اے۔وی کالج، لاہور سے بی اے کی اور ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے (تاریخ) کی سند حاصل کی۔

۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے ملازم پیشہ لوگوں کی سہولت کے لیے یونیورسٹی لا کالج میں وکالت کی تعلیم کے لیے شبینہ درجے EVENING CLASSES کھول دیے۔ مالک رام صاحب کے پاس خالی وقت تھا، یہ بھی ان درجوں میں شامل ہو گئے اور دو برس بعد انھیں بھی ایل ایل بی کی سند مل گئی۔ لیکن یہ محض تفنن تھا، انھوں نے کبھی وکالت نہیں کی۔

بھائی کی وفات: ۱۸/اکتوبر ۱۹۱۸ء

[پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء) کے اختتام کے قریب دنیا ہولناک وبائی انفلوئنزا کا شکار ہو گئی تھی۔ بلا مبالغہ لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ مالک رام کے بڑے بھائی ایشر داس بھی اسی میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جاں بحق ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون]

(ج) شادی: ۱۸ مئی ۱۹۳۱ء کو شریمتی ودیا وتی سے میاں میر (لاہور چھاؤنی) میں شادی ہوئی۔

[شریمتی ودیاوتی کے والد کا نام لالہ دھنپت رائے تھا۔ وہ ساہیوال (ضلع سیالکوٹ پاکستان)

کے رہنے والے تھے۔ ودیاوتی ان کی سب سے بڑی بیٹی (اور بڑی اولاد) ہیں ان سے اور تین بھائی اور دو بہنیں چھوٹی ہیں۔

لالہ دھنپت رائے اردو علم وادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اُن کے کچھ مضامین اردو کے مختلف رسالوں میں ملتے ہیں۔ حکومت ہند کے محکمۂ دفاع (کے فارم ڈپارٹمنٹ) میں ملازم تھے، ۱۹۴۶ میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد' وہ اپنے بڑے بیٹے کندن لال صاحب کے ساتھ میرٹھ میں مقیم رہے، جہاں اُن کا ۱۶ دسمبر ۱۹۶۸ء صبح بعارضۂ قلب انتقال ہوا، اُن کی ولادت ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کی تھی۔ ۸۳ سال کی عمر پائی۔

اولاد : (۱) اوشا (بڑی بیٹی): ۷ نومبر ۱۹۳۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئی۔

(۲) ارونا (منجھلی بیٹی): ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو شملے میں پیدا ہوئی۔

(۳) بشریٰ (چھوٹی بیٹی): ۲۹ جنوری ۱۹۴۱ء اسکندریہ (مصر) میں پیدا ہوئی۔

(۴) آفتاب (بڑا بیٹا): ۱۰ دسمبر ۱۹۴۲ء، اسکندریہ میں پیدا ہوا۔

(۵) سلمان (چھوٹا بیٹا): ۴ اگست ۱۹۴۵ء اسکندریہ میں پیدا ہوا۔

(د) ملازمت: مالک رام صاحب نے ملازمت کا آغاز صحافت سے کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے مندرجہ ذیل جرائد میں کام کیا۔

۱۹۳۲ تا ۱۹۳۵ء: ایڈیٹر، ہفت روزہ آریہ گزٹ، لاہور (یہ آریہ پرادیشک پرتی ندھی سبھا کا نمایندہ اخبار تھا۔ اسی زمانے میں مالک رام صاحب کے تعلقات آریہ سماج کے چوٹی کے لیڈروں سے ہوئے۔)

۱۹۳۱-۱۹۳۶: ایڈیٹر، ماہنامہ نیرنگ خیال، لاہور۔

جنوری ۱۹۳۶ تا جون ۱۹۳۶ء: روزنامہ بھارت ماتا، لاہور

جون ۱۹۳۶-۱۹۳۸ء: ملازمتِ حکومت ہند (عارضی)

(اس دوران میں محکمۂ اطلاعاتِ عامہ (P.T.B) اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں کام کیا)

۱۹۳۹-۱۹۴۷: ملازمتِ حکومت ہند (مستقل)

[۱۹۳۸ء میں حکومتِ ہند نے طے کیا کہ ہندوستان کی بیرونی تجارت کو فروغ دینے کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے دفتر کھولے جائیں۔ چنانچہ اس فیصلے کے موجب جاپان (کوبے)، اٹلی (میلان)، کینیڈا (مانٹریال)، مصر (اسکندریہ)، مشرقی افریقا (ممباسا)، اور آسٹریلیا (سڈنی) کا انتخاب ہوا، اور ان شہروں میں انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر مقرر کئے گئے۔ اسکندریہ (مصر) کا دفتر جنوری ۱۹۳۹ء میں کھولا۔ اور یہاں مسٹر انعام المجید آئی۔ سی۔ ایس ٹریڈ کمشنر مقرر ہوئے۔ مالک رام اسی دفتر میں سپرنٹنڈنٹ بنا کر بھیجے گئے۔ اُن کا انتخاب اس بنا پر کیا گیا تھا کہ وہ عربی جانتے تھے اور اُن کا اسلام اور اسلامی علوم وفنون کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔

اسکندریہ جانے سے قبل انھوں نے کلکتہ میں یکم اپریل سے ۳۰ جون ۱۹۳۹ء تک تین مہینے ڈائرکٹر جنرل تجارتی معلومات وشماریات ((DGCI&S)) کے دفتر میں تربیت حاصل کی اور ۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء کو اپنے خاندان سمیت پی اینڈ او کمپنی کے ''راولپنڈی'' نامی جہاز پر مصر کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ ۳۱ جولائی صبح مصر کی بندرگاہ پورٹ سعید پہنچے اور وہاں سے ریل سے اسی شام اسکندریہ پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے عہدے کا چارج اگلی صبح یعنی یکم اگست کو لیا۔

وہ تین برس کے لیے مصر بھیجے گئے تھے لیکن اتفاق کی بات کہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری عالمی جنگ چھڑ گئی۔ جس سے سمندری رستے بالکل غیر محفوظ ہو گئے۔ یہاں سے کوئی اور شخص مصر بھیجا نہ جاسکا یا جانے پر تیار نہ ہوا اور یوں انھیں غیر متوقع طور پر طویل عرصے کے لئے مصر میں قیام کرنا پڑا۔ دفتر اگرچہ اسکندریہ میں تھا لیکن اس کا دائرۂ کار بہت وسیع تھا۔ ترکیا، عراق اور سوڈان کی مثلث کے تمام ممالک۔ ترکیا، سوریا، لبنان، عراق سعودی عرب اور خلیج فارس کی ریاستیں، اردن، فلسطین، مصر، سودان ان سب کے ساتھ ہندوستان کی برآمدی تجارت کا فروغ وترقی اسی دفتر سے متعلق تھی لامحالہ اس سلسلے میں مالک رام صاحب کو اکثر ان ممالک کا دورہ کرنا پڑا اور بعض اوقات وہاں ہفتوں قیام کرنے کے مواقع ملے۔ ترکیا کے علاوہ ان ممالک کی زبان عربی تھی۔ ترکیا میں

جانے آنے اور وہاں قیام کرنے سے ترکی میں بھی شُد بد ہو گئی۔ قیامِ مصر کے دوران میں وہ فرانسیسی سیکھ ہی چکے تھے]

۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۵ء: ملازمت حکومت ہند (انڈین فارن سروس)

۱۹۴۷ء میں ملک کے آزاد ہو جانے کے بعد انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو مالک رام صاحب اس میں شامل کر لیے گئے اس زمانے میں وہ مصر میں تھے۔

ہندوستان کا سفارت خانہ مصر کی راجدھانی قاہرہ میں کھولا گیا تھا؛ ہمارے سب سے پہلے سفیر مشہور مجاہدِ آزادی اور انگریزی کے صحافی جناب سید حسین تھے، جن کی زندگی کا بیشتر حصہ امریکا میں بسر ہوا تھا۔ ان کی وفات قاہرہ میں ہوئی اور وہ وہیں مدفون ہیں۔ سید حسین کے بعد جناب آصف علی اصغر فیضی سفیر مقرر ہو گئے وہ عربی کے فاضل تھے۔

اگرچہ سفارتخانہ قاہرہ میں تھا، لیکن اسکندریہ کا دفتر اسی طرح قائم رہا، گویا سفارت کا شعبۂ تجارت وہاں کام کرتا رہا۔ یہ دونوں سفیر مالک رام صاحب کے بہت مہربان اور قدر دان رہے۔]

۱۹۵۰-۱۹۵۱ء: سکتر تجارت سفارت خانہ ہند، بغداد (عراق)

[۱۹۵۰ء کے اوائل میں ان کا اسکندریہ سے تبادلہ ہوا اور یہ شعبۂ تجارت کے سکتر کی حیثیت سے سفارتخانۂ بغداد میں منتقل ہو گئے اس ابتدائی زمانے میں ایران میں ہندوستان کا الگ مستقل سفارت خانہ نہیں تھا، بغداد کا دفتر ہی ایران کے کام کی نگرانی کرتا رہا۔ بغداد میں ہمارے پہلے سفیر سیّد علی ظہیر بیرسٹر (لکھنؤ) تھے۔]

۱۹۵۲-۱۹۵۴ء: انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر (قائم مقام) اسکندریہ

یہ واپسی دراصل اس باعث ہوئی کہ حکومت ہند قاہرہ میں ہندوستانی مصنوعات اور اشیا کی بڑی پیمانے پر نمائش کرنا چاہتی تھی۔ ضرورت تھی کہ اس کے لیے ابتدائی اور تنظیمی کام کیا جائے۔ چنانچہ یہ کام مالک رام صاحب کو تفویض ہوا تھا۔ یہ نمائش قاہرہ میں ۱۹۵۴ء میں منعقد ہوئی تھی۔

والدہ کا انتقال ۱۲/ مئی ۱۹۵۴ء احمد آباد میں انتقال ہوا۔

وہ ساری عمر مالک رام صاحب ہی کے ساتھ رہیں۔ اگست ۱۹۵۳ء میں وہ اسکندریہ (مصر) سے ہندوستان آئیں کیونکہ ایک زمانے سے انھوں نے رشتے داروں کو نہیں دیکھا تھا۔ خیال تھا کہ جلد ہی نمائش کے انعقاد کے بعد خاندان کے باقی افراد بھی ہندوستان آجائیں گے۔ نمائش ملتوی ہوتی گئی۔ اسی باعث نہ خاندان یہاں آیا نہ وہ واپس جاسکیں وہ یہاں احمد آباد میں اپنے میکے کے خاندان کے ساتھ مقیم تھیں کہ ۱۲ مئی ۱۹۵۴ء صبح کے سات بجے دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ جان بحق ہوگئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

۱۹۵۵-۱۹۵۸ تبادلے کے بعد وہ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ہندوستان پہنچے انھیں یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو ملازمت کے لیے حاضری دینا تھی۔ درمیانی وقفے کے لیے انھوں نے تین مہینے کی چھٹی لے لی تھی۔ اکتوبر میں وہ بمبئی میں پہنچے، اور دو تین ہفتے وہاں رکنے کے بعد دلی آئے۔ اگلے چند ہفتے انھوں نے مختلف مقامات میں گزارے۔ یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گئے۔

۱۹۵۸-۱۹۶۰ء ڈپٹی ڈائرکٹر ٹریڈ، قاہرہ (مصر)

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ہندوستانی مصنوعات اور اشیائے تجارت کی شاندار نمائش قاہرہ (مصر) میں منعقد کی گئی تھی۔ اس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ مصر کا سرکاری اور عوامی حلقوں نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا اور خواہش ظاہر کی کہ ہو سکے تو قاہرہ میں ایک مستقل نمائش کا انتظام کیا جائے۔ اس پر حکومتِ ہند نے ایک الگ عمارت کرایے پر لے کر اس میں "انڈین ٹریڈ سنٹر" قائم کر دیا۔ مالک رام صاحب اسی کے انچارج بنا کر بھیجے گئے۔

(دراصل سفارتِ ہند کا تجارتی شعبہ بھی یہی تھا۔)

۱۹۶۰-۱۹۶۴ء سکتر تجارت، سفارتخانۂ ہند، برسلز (بلجیم)

۱۹۶۴-۱۹۶۵ء وزارت خارجہ حکومتِ ہند نئی دلی۔

۲۵ / اپریل ۱۹۶۵ء ملازمت سے پنشن پر سبکدوش ہوئے۔

سرکاری ریکارڈ کے مطابق انھیں ۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو (بعمر ۵۸ برس) سبکدوش ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اس وقت وہ ایک خاص رپورٹ تیار کر رہے تھے۔ اس کی تکمیل میں

مزید چھ ہفتے لگ گئے. اس لیے وہ آٹھ مارچ کو سرکاری طور پر ریٹائر ہو گئے اور ۲۵ اپریل تک آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی (O.S.D) کے طور پر کام کیا۔]

۱۹۶۵ـ۱۹۶۷ء: ایڈیٹر (اردو) ساہتیہ اکاڈمی، نئی دلّی۔

(اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ساہتیہ اکاڈمی کے صدر تھے۔ انھیں جب معلوم ہوا کہ مالک رام صاحب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو رہے ہیں تو انھوں نے خاص طور پر انھیں اکاڈمی میں اُردو ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنے کی دعوت دی۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی وفات (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کے بعد وزارتِ تعلیم حکومت ہند کے ایما پر ساہتیہ اکاڈمی نے فیصلہ کیا تھا کہ مرحوم کی جملہ تصانیف کو جدید طریقے پر مرتب کرا کے شائع کیا جائے۔ مالک رام صاحب اسی کام کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں تاحال یہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ترجمان القرآن (۴ جلد)، غبارِ خاطر، تذکرہ، خطبات آزاد (جلد اول)، کام ابھی جاری ہے۔

۱۹۶۷ء تاحال: اکتوبر ۱۹۶۷ء میں انھوں نے ایک قومی تجارتی اور صنعتی فرم میں ڈائرکٹر کی آسامی قبول کرلی، اس پر ساہتیہ اکاڈمی سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ استعفیٰ اس لحاظ سے تھا کہ وہ آئندہ کوئی تنخواہ نہیں لینگے، ورنہ مولانا آزاد مرحوم کی کتابوں کی ترتیب و تدوین اب بھی انھیں کے ذمّے ہے۔ البتہ اب وہ تنخواہ نہیں لیتے۔

(اس فرم سے تعلق آج تک قائم ہے۔)

(الف) تصنیف و تالیف:

(۱) سب سے پہلی تحریر ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور کے ۱۹۲۴ء کے کسی شمارے میں شائع ہوئی۔ یہ رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرہ آفاق تصنیف گیتا نجلی کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ تھا۔

(۲) سب سے پہلی کتاب غالب کا فارسی شعری مجموعہ "سبد چین" تھی جسے انھوں نے نئے سرے سے مرتب کیا تھا۔ یہ ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ، دلّی کی طرف سے شائع ہوئی۔

(۳) ۱۹۶۷ـ۱۹۷۸ء: آنریری ایڈیٹر تماہی "تحریر"، نئی دلّی۔

(ب) تصنیفات:

(۱) ذکرِ غالب (غالب کی سوانح عمری)۔ ۱۹۳۸ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی اس کا چھٹا ایڈیشن زیر طبع ہے۔

(۲) عورت اور اسلامی تعلیم (۱۹۵۱ء) اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ اس کتاب کا انگریزی اور عربی ترجمہ ہو چکا ہے۔ عربی ترجمہ قاہرہ (مصر) سے (۱۹۵۸ء) میں شائع ہوا۔ انگریزی ترجمہ اولاً حیدر آباد دکن سے اور پھر ۱۹۸۱ء میں نیویارک (امریکا) سے شائع ہوا۔

(۳) تلامذۂ غالب (۱۹۵۸) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں غالب کے شاگردوں کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ اس پہلے ایڈیشن میں ۱۴۶ شاگردوں کے حالات اور کلام اور ان میں سے تقریباً تیس کی تصاویر تھیں؛ ان میں سے بیشتر پہلی مرتبہ شائع ہوئیں۔

اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا پہلے ایڈیشن کے تین اصحاب کا ترجمہ خارج کر دیا گیا کیونکہ ان کا تلمذ ان کے نزدیک مصدّقہ نہیں تھا۔ اس نئے ایڈیشن میں ۱۸۰ شاگردوں کے حالات اور کلام ہیں؛ سات نئی تصویروں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ ایڈیشن طبع اوّل سے تقریباً دگنا ہے۔

(۴) میرزا غالب (انگریزی) اسے نیشنل بک ٹرسٹ نئی دلّی نے ۱۹۶۸ء میں غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں شائع کیا۔

(اس کا ہندی، پنجابی، گجراتی، مراٹھی، بنگالی اور اڑیا میں ترجمہ ہو چکا ہے)

(۵) تذکرۂ معاصرین (۱): ۱۹۷۲ء

(۶) تذکرۂ معاصرین (۲): ۱۹۷۶ء

(۷) تذکرۂ معاصرین (۳): ۱۹۷۸ء

(۸) تذکرۂ معاصرین (۴) ۱۹۸۲ء

یہ دراصل ماہی تحریر کے بہرۂ وفیات کا (اضافوں کے ساتھ مجموعہ ہے) ان چاروں حصّوں میں کم و بیش ۲۱۹ شاعروں، ادیبوں، صحافیوں کے حالات اور ان کا نمونہ کلام شامل ہے۔

(۹) ایرانی شاہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال ۱۹۷۱ء دلّی (یہ مختصر رسالہ سفارتخانۂ ایران کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔)

(۱۰) وہ صورتیں الٰہی (۱۹۷۴ء)۔ اس میں ان نو ادیبوں کے بارے میں تفصیلی مضامین ہیں، جن سے اُن کی زندگی میں ملاقات رہی۔ شروع میں "میرزا غالب" کا تفصیلی خاکہ بھی شامل ہے۔

(۱۱) قدیم دلّی کالج (۱۹۷۵ء) یہ دراصل ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم کی کتاب "مرحوم دلّی کالج" کا تتمّہ ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء میں چھپا۔

(۱۲) فسانۂ غالب (۱۹۷۷ء)

اس کتاب میں ۱۵ مضامین ہیں جن کا تعلق سوانح غالب سے ہے۔ اس طرح سے یہ گویا "ذکر غالب" کا تتمّہ ہے

(۱۳) حالی (انگریزی): ۱۹۸۲ء، نئی دلّی۔

یہ کتاب ساہتیہ اکاڈیمی کے سلسلۂ "ہندوستانی ادب کے معمار" میں چھپی۔

(۱۴) اسلامیات: ۱۹۸۴ء، نئی دلّی

(۱۵) گفتارِ غالب: ۱۹۸۵ء، نئی دلّی

(ج) مرتب کردہ کتابیں

انھوں نے تالیفات کے علاوہ تقریباً ۲۰ کتابیں مرتّب کی ہیں۔ اُن میں سے زیادہ اہم یہ ہیں:

(۱) سبدچین (فارسی): غالب۔ ۱۹۳۸ء، دلّی

(۲) کلیاتِ غالب (فارسی): غالب (غیر مطبوعہ)

(۳) دیوانِ اردو (غالب): ۱۹۵۷ء، دلّی

(۴) خطوطِ غالب (منشی مہیش پرشاد) ۱۹۶۲ء علی گڑھ

(۵) گلِ رعنا (غالب): ۱۹۷۰ء نئی دلّی

(۶) غبارِ خاطر (مولانا ابوالکلام آزاد): ۱۹۶۷ء نئی دلّی

۷ تذکرہ (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۶۸ء، نئی دلّی

۸ خطباتِ آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۷۴ء، نئی دلّی

۹ نذرِ عرشی (اردو و انگریزی) ۱۹۶۵ء نئی دلّی (بہ اشتراک پروفیسر مختارالدین احمد)

۱۰ نذرِ ذاکر (اردو و انگریزی): ۱۹۶۷ء، نئی دلّی

۱۱ نذرِ عابد (اردو و انگریزی): ۱۹۷۴ء، نئی دلی

۱۲ نذرِ زیدی (اردو و انگریزی): ۱۹۸۰ء نئی دلّی

۱۳ نذرِ حمید (اردو و انگریزی): ۱۹۸۱ء نئی دلی

ان کے علاوہ تقریباً ڈیڑھ پونے دو سو مقالات مختلف علمی و ادبی جرائد میں چھپے ہوئے منتشر حالت میں موجود ہیں۔

(د) انعامات:

۱ کلائی گھڑی۔ ایف۔اے کی طالب علمی کے زمانے میں (۱۹۲۵ء)۔ موضوع تھا: "کیا مذہب میں عقل کا دخل نہیں ہے"!

۲ یوپی حکومت، گلِ رعنا پر: ۱۹۷۱ء

۳ یوپی اردو اکاڈمی، لکھنؤ، تذکرۂ معاصرین (۱) پر ۱۹۷۳ء

۴ یوپی اردو اکاڈمی، لکھنؤ، وہ صورتیں الٰہی پر: ۱۹۷۴ء

۵ ساہتیہ کلا پریشد، دلّی: اردو ایوارڈ: ۱۹۷۵ء

۶ بہار اردو اکاڈمی، پٹنہ: تذکرۂ معاصرین (۲) پر: ۱۹۷۵ء

۷ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی: مودی غالب ایوارڈ: ۱۹۷۶ء

۸ میر اکاڈمی، لکھنؤ: امتیازِ میر ایوارڈ: ۱۹۷۷ء

۹ میر اکاڈمی، لکھنؤ: افتخارِ میر ایوارڈ: ۱۹۸۱ء

۱۰ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ: تذکرہ معاصرین (۴) پر ۱۹۸۲ء

۱۱ ساہتیہ اکاڈمی، نئی دلّی: تذکرۂ معاصرین (۴) پر اردو ایوارڈ: ۱۹۸۳ء

۱۲ اردو اکاڈمی، پٹنہ: تلامذۂ غالب پر: ۱۹۸۴ء

(۱۳) بہار اردو اکادمی، پٹنہ۔ اردو خدمات پر سب سے اعلیٰ ایوارڈ۔ ۱۹۸۴۔ ۱۹۸۵ء

(۱۴) ڈاکٹر ذاکر حسین عالمی اردو انعام برائے قومی یکجہتی ۱۹۸۷ء

(ز) اعزازات:

(۱) ۱۹۴۷ء فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی انگلستان و آئرلینڈ، لندن

(۲) ۱۹۷۲ء علمی دنیا نے تین جلدوں پر مشتمل (دو جلدیں اردو اور ایک انگریزی) اعزازی کتاب صدر جمہوریہ ہند شری وی۔ وی گری کے ہاتھوں پیش کی۔ تقدیم کی تقریب راشٹرپتی بھون میں ہوئی۔

(۳) ۱۹۶۵ء: رکن مجلسِ عام و مجلسِ عاملہ، جامعہ اردو، علی گڑھ

(۴) ۱۹۷۷ء: پرو چانسلر، جامعہ اردو، علی گڑھ

(۵) ۱۹۶۹ء تا حال: رکنِ مجلسِ منتظمہ و عاملہ، غالب اکاڈمی، نئی دلی

(۶) ۱۹۷۰۔ ۱۹۸۲: رکن مجلسِ عام و عاملہ انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ و نئی دلی

(۷) ۱۹۸۲ء تا حال: صدر انجمن ترقی اُردو (ہند)، نئی دلی

(۸) ۱۹۷۳ء۔ ۱۹۸۲ء: رکنِ مجلسِ عام و مجلسِ عاملہ، ساہتیہ اکاڈمی، نئی دلی

(۹) ۱۹۸۳ء فخرِ غالب ایوارڈ (غالب میموریل سوسائٹی، دلی)

(۱۰) ۱۹۸۶ء ممبر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ، علی گڑھ

مالک نامہ

(مالک رام کی ادبی خدمات)

مرتبہ

کرنل بشیر حسین زیدی

جشن مالک رام کمیٹی - دلی